

ہر گھر کی زینت

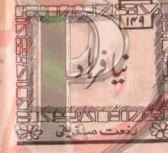
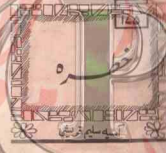
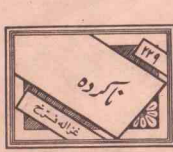
ماہنامہ کراچی

روزنامہ

ارڈیننس 1



کتابچہ ہندوستان اور ممالک - دارالجمہوریہ قاری
رومانوی اور ہندوستان کی سرکاری
مکمل لائبریری اینڈ جنرل اسٹور
جلد چوک سکھر



دوشیزہ

چیف ایڈیٹر: سهام مرزا

ایڈیٹرز: سیان غنزل
سلمان شمس
عشرت آیا

سرکلشن منیجر: اسلم صدیقی
آرٹسٹ: علیم احمد
کپوزنگ: فوکس کمپیوٹنگ
آل آل چندر پرنٹرز کراچی

لیگل ایڈیٹر: سید اقدس علی ہاشمی (ایڈووکیٹ)
انجینئرس ایڈیٹر: مخدوم امینہ کھٹنی (ایڈووکیٹ)

جلد: ۲۰ شمارہ: ۵
قیمت: ۲۵ روپے
زیر نالاز خصوصی شمارہ کے ساتھ رجسٹرڈ سے ۲۸۸ روپے

خط و کتابت کا پتہ:
پوسٹ بکس نمبر ۸۰۹۵ کراچی ۷۵۳۰۰

رابطہ آفس: پریل پبلی کیشنز
۱۰۸-۱۱۰ آدم آرکیڈ، شہریت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی
فون: ۴۹۳۴۳۶۹-۴۹۳۴۳۶۱
فیکس: ۴۹۳۴۶۱۱-۲۱-۹۲

مطبوعات پریل پبلی کیشنز

ماہنامہ جاتی کمائیاں، ماہنامہ شوہر نس، ماہنامہ دوشیزہ، ماہنامہ سچی کمائیاں، ماہنامہ بچوں کا رسالہ، روزنامہ سربرا، روزنامہ انجام

شروع اللہ کے نام سے ہر بات نمانیت و رکھ کرنے والا ہے

ایوارڈ یافتہ افسانہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں ماضی قریب کی کچھ باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں

اس صدی کی ساتویں دہائی میں ہمارے بیشتر ڈائجسٹ غیر ملکی جاسوسی افسانوں اور جرائم سے متعلق "ایکشن قلم" کے ترسے شائع کرنے کی دوڑ میں مصروف تھے جس کے نتیجے میں اردو افسانے بے وجود طاری ہو چکا تھا اور اسے معاشرے کی مکاشفہ کرنے والے ایڈیٹوں کی قدروقت ان قلم کاروں کے مقابلے میں بہت کم رہی تھی جو پرتشخص کمائیوں کے ترسے کر رہے تھے یا یوٹیلٹی کے ترسے یا دستاویز تحریر کرنے میں مصروف تھے یہ صورت حال اردو افسانے کے لیے بھی پریشان کن تھی اور متعدد افسانہ نویسوں کے لیے بھی دھڑکنے والا عمل میں آیا۔

دو شہرے کے اجراء سے ہمارا مقصد "بیجان خیز" تراجم اور نثر آفریں کمائیوں کی دوڑ میں شامل ہونا نہیں تھا۔ ہم اس کے ذریعے رو بہ زوال افسانے کو سنبھالنا دینا اور ان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تھے جو اپنی تحریروں سے بچنے والوں کو فرار کا راستہ نہیں بلکہ حقیقتوں کے چہرے دکھائیں اور زندگی کے ان ڈھکے چھپے گوشوں کی نقاب کشائی کریں جن میں برائیاں پروان چڑھتی ہیں اور ان گنت لوگوں کو اپنی لپٹ میں لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے دو شہرے رانگلز اور ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا جو آج کل کے روایت بن گیا اگر آپ دو شہرے کے مستقل قاری ہیں تو جانتے ہوں گے کہ ایوارڈ کی تقریبات کتنے تزک و احتشام سے منائی جاتی رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ کوشش بار آور غایت ہوئی اور پائے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگاروں کی ایک بڑی کھپ ابھر کر سامنے آئی اور معتبر قلم کاروں کی صف میں شامل ہو گئی۔

یہاں میں یہ بھی بتانا چاہوں تو بہتر ہوگا کہ ایوارڈ کے مستقبل فقہرائے جانے والے افسانوں کے جوں میں ہمارے ادارے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے جوں کی موٹی کینی بھی نکھلی نہیں دی تھی بلکہ قارئین دو شہرے کو ہی منصف بنادیا تھا۔ وہ جس افسانے کو پسند کر لیں گے اسے سنہ بخشنے تھے، اسی کو منتخب قرار دیا جاتا تھا۔ یہ افسانہ نمبر بے سال کے ایوارڈ یافتہ افسانوں پر مشتمل ہے۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ نئے افسانوں کی بجائے یہ ایوارڈ نمبر کیوں شائع کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:

- (1) یہ افسانے زندگی کے ایسے مظہر تھے جن کا رشتہ صرف ماضی سے ہی نہیں بلکہ حال اور مستقبل سے بھی ہے۔
- (2) یہ دو شہرے کی طرف سے ان محترم لکھنے والوں کو بدھ و تہنیت ہے جنہوں نے اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بہرہ ور افسانے لکھے اور حقیقتوں کے چہرے دکھائے۔
- (3) اور یہ ایک ادبی دستاویز بھی ہے۔ اگرچہ اس شمارے میں مستقل سلسلے بھی شامل ہیں لیکن یہ ایک کتاب کی حیثیت بھی رکھتا ہے جسے ہر لا بھری کی زینت بنایا جاسکتا ہے۔

اس دور میں جب کہ 320 صفحات کی کوئی اچھی کتاب سو ڈیڑھ سو روپے سے کم میں دستیاب نہیں ہوتی، ہم نے اس شمارے کی قیمت صرف پچیس روپے رکھی ہے تاکہ آپ اسے آسانی سے خرید کر اچھے ادب کا مطالعہ کر سکیں۔

یہ تو فیض ہماری باتیں آپ اس شمارے کا مطالعہ کئے اور ہمیں یہ بتانا نہ ہو سکے کہ آپ کو ہماری یہ کوشش پسند آئی تھی۔

ماہانہ منافع آپ کے ہاتھ میں۔ جمع شدہ رقم بھی محفوظ ! ماہانہ خوشحالی اسکیم

آپ ریٹ ٹرمز پر ہر ماہ ایک ماہ نامک سے باہر جہاں رہیں۔ اپنے گھر کے خرچہ، بچوں کی بروقت اسکول فیس یا دیگر ضروریات کو ہر ماہ بروقت سراغ آویسے کے لیے مسلم کمرشل بینک ماسٹر

خوشحالی اسکیم سرٹیفیکٹ خرچہ پیر جس میں آپ کی جمع شدہ رقم ہر ماہ اتہنا کی پُرکشش منافع آپ کو ملتا رہے گا جس سے آپ کا خاندان اپنے گھریلو اخراجات یا اور دوسری ضروریات کو بروقت پورا کر سکے گا۔ ہر قسم کی پریشانی سے نجات...



میرے گھر کا خرچہ اب بروقت مل جاتا ہے اور کسی قسم کی تنگدستی نہیں ہوتی۔



میں نے اپنی ماہانہ خوشحالی اسکیم سے میرے اسکول کی دیگر ضروریات بروقت ادا ہوجاتی ہے۔



میں نے اپنی ماہانہ خوشحالی اسکیم کی وجہ سے میرے ریمانڈ کے بعد بھی گھریلو اخراجات سے مطمئن ہوں۔

انتہائی پُرکشش منافع
منفائی کی گھرنٹک شریسل
بروقت ادائیگی
ملک گیر سطح پر مسلم کمرشل بینک کی تمام برانچوں میں یہ سہولت



اچھی بینکاری بہترین بینکاری

اپکے پسندیدہ رسالے - ڈائجسٹوں - تاریخی
رومانوی اور حاضریہ ناولوں کا مرکز
محکم شال لائبریری اینڈ جنرل اسٹور
جناح چوک سکھر

سیما غزل

دوشیزہ کی محفل

قارئین!

آداب و نیاز اور بے پناہ خلوص

ان تمام لوگوں کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے
ہمیں عید کارڈ بھیجے، ہمیں دعاؤں میں اور اپنی خوشیوں میں
یا دیکھا۔ ہمیں ان کی محبتوں نے اتنا سرشار کر دیا ہے کہ بس
کیا بتائیں!

قارئین کرام! یہاں ہم ان بڑاوں کرم فرماؤں کے نام
تو تحریر نہیں کر سکتے مگر جن عید کارڈ کے ساتھ خطوط شامل
ہیں وہ ضرور تحریر کریں گے پہلی بات تو یہ کہ ہم نے جن
کو ناگوں حالات میں دوشیزہ کو دوبارہ شائع کرنے کی جرات
کی ہے وہ آپ ہی سب کی مہربانیوں نے عطا کی تھی اور اب
بھی ہم آپ ہی کی محبتوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ تو قارئین
پہلے عید کارڈ بھیجئے والوں کا شکریہ جن میں ہمارے محترم
ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، سلطان الفخر خان صاحب، شیخ
الجامعہ محترم سید ارفاق علی صاحب، کراچی ریڈیو کی محترمہ
عبیدہ انصاری صاحبہ اور اسلم بلوچ صاحبہ اور ان کے
ساتھی، محترمہ دروانہ نوشین خان صاحبہ، محمد منیر بلوچ
صاحب، محترمہ فہیمہ ظفر صاحبہ، محترمہ شاجہاں ملک
صاحبہ، محترمہ نیرضیا صاحبہ، جناب شیخ مرزا صاحب، مین
اسٹریٹ ایسی والے جن کا نام پڑھا میں جا رہا اور اس
بے علمی کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ روزنامہ صدارت
کے ایڈیٹر محترم صدیق ندیم صاحب، قارئین یہ روزنامہ

قارئین! آپ یقیناً اس ماہ کا دوشیزہ دیکھ کر حیرت میں پڑ
گئے ہوں گے اتنا مختلف اس قدر منفرد! دراصل ہم
قارئین کے اصرار کو مزید نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں
روزانہ ہی ایسے خطوط ملتے رہے ہیں جن میں ایوارڈ یافتہ
اساتوں کو دوبارہ چھاپنے پر اصرار کیا جاتا تھا۔ اس بار ہم
نے سوچا کہ کیوں نہ ایوارڈ یافتہ افسانہ نمبر نکال لیا جائے تو
قارئین ہم نے ایوارڈ یافتہ افسانے چھاپنے کا اہتمام اس
سطح کے آغاز سے کیا ہے۔ آپ ہمیں ضرور اور ضرور
لکھیں کہ یہ تجربہ کیسا لگا۔

سب سے پہلے تو ہماری جانب سے عید کی مبارک باد
بول کریں ہمیں یقین ہے کہ آپ نے ایک پر مسرت عید
گزاری ہوگی دوسری بات یہ کہ ہماری عید تو اپنے ساتھ
اپنی محبتیں، ایسا خلوص اور اس قدر مسرت لائی کہ دنوں
ہفتوں میں اڑتے رہے اور آج جب ہم وہ ساری مسرتیں
اور خلوص اپنے گرد بکھیر کر بیٹھے ہیں تو خود کو دنیا کا خوش
انصیب فرد محسوس کر رہے ہیں۔ جی ہاں! ہمارے لیے محبتوں
اور خلوص کے ہزاروں پیغامات ہمیں مسرور کر گئے ہیں ہم

جذبہ ہی تو انسان کو عمل بناتے ہیں اگر کسی شخص میں کسی ایک جذبے کی بھی کمی ہو تو وہ عمل کمال میں ہوا اور خود راہ گیا اور راہ دور اور پھر پلن کیسا غلاب ہے یہ تو تم بھی جانتے ہو گے کہ جب ایک ایسا جذبہ ہے جسے پوری ایمان داری ساتھ برتا جائے، مگر ایمان یا میرٹا تو پیری ہوئی، تاہم آئندہ میں بھی بھول کر بھی ایسا نہ سونپتا، کچھ باتیں تم جسے، یہ جو کہا جاتا ہے ناک وقت ہر اہم ہے تو فی الیہ بات وقت کی نہیں قدرت کے اس نظام کی ہے جس میں شعور ایک خاص وقت تک بات کو خورسار نہ پھر اسے غیر محسوس طریقے سے لا شعور میں دھکیل دیتا ہے۔ یہی کس بھی جذبہ کا اثر دھم ہو جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب تم یہ تحریر دہی ہوئی اس وقت تک تمہارے ذہن میں بھی دھوکا کا اثر کم ہو گا ہو گا ایک عہد کو کہ تم کسی بھی جذبے کے سامنے خود کو پریل ثابت نہیں کر سکتے اور غلوں کا ڈر مقابلہ کر سکتے ہو، لیکن اہمیت ہے "زندگی" ایک تم کو دینا ہو یا کسی بلکہ ارتقاء کو دینا ہے کہ کسی قوم انسان کو نیک اعمال کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہی اعمال روشن ہو کر آگے جانے والی راہ میں منور کرتے ہیں اور خود کشتی کوئی اچھا عمل نہیں یہ تو عام ہے اس لیے کہ آگے جانے والی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اس لیے کہ آگے سے ہمیں خود کھلو اور وہدہ کو کہ کائنات کی تمام خوشیاں دھوڑ کر لینا اور ان میں غرق ہو کر رہنا، اچھی خوشیوں کو دوسروں میں بانٹو گی، شایاں جلدی سے خود کھلو، ہم انتظار کر رہے ہیں ٹھیک؟

جناب: نہیں ہیں آپ؟ اچھی تو ہیں؟ ہمیں تم آپ سے خطاب ہیں محترمہ! اہوہ یعنی شایدہ تا قاضی صاحبہ، شکر ہے آپ نے سن لی اور نہ تم تو سمجھتے تھے کہ بس ایک مختصر سوال کر کے اس اور جواب توجہ ہو گئیں۔ ہاں تو تمہاریے ذرا کیا تھا تو قارئین کو پڑھاؤ دیکھ لکھتی ہیں یا پوری سیراغلن تمہاری طرف سے آج ہی خط لکھا جو اگرچہ مختصر تھا مگر خوب صورت لگا۔ افسانہ بھیجی رہی ہوں دو شیونے آقا مرکی بولوں گا ڈیڑھ میں بیٹھوں والے دن ہے ہم نے 12 میلیمٹر ہائی جیوں رکھ رکھ رہے اب دیکھیں اسپیڈ کیا ہو! پلیر پرانے کائنات میں ذرا "سلائی" کو دھوڑیے، لکھا ہے مجھے ہی سلام کہہ گیا ہے میرے لیے خوشی کی بخت کر لیں "اندہ

خوش ہو گا۔" یہ دعا کیسی ہے؟ رخصانہ بھالی کو بہت پیار خانوں! شبلیات کا شکر ہے! افسانہ لکھ رہی ہیں اور اس کیلیمٹر پانچوں تو کہہ دیا ہے مگر شکر کے اصول قیاد ہیں؟ اور لی بی بی میں تو کلتا ہے کہ پرانے کائنات میں ہی معتقین قیام کر رہا ہے کہ ایک آپ ہی کیا ترقیاں سارے ہی معتقین پرانے افسانے اور پرانی تحریریں "مختصدا" رہے ہیں۔ میری اچھی سی یادری ہی دوست کچھ ہی تحریروں کی طرف توجہ دو ورنہ کائنات میں قیام پذیر دیکھ کیس ہیں ہی نہ چلتے۔

پچھلے سے ہماری دوست شینہ اختر اعوان کا پورا مفضل خط آیا ہے۔ خوب صورت خط ہے لکھی ہیں "سینا! سب سے پہلے ایک خوب اور وہ ہے کہ تمہیں اس سے پہلے کسی جب خود کھلا تو بے اختیار "متم" لکھتے تھے "تو کتنے کتنے چاہا۔ میں نہیں جانتی کہ ایک ایسا ہے؟ مگر یہ ہے کہ جو کچھ لکھتے ہو وہ سب کچھ میں بھی پسند آیا، اور اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ میں بھی پسند کیا "کائنات" پر اس بے تکلفی سے نہیں اتری۔ جانے یہ سب کیوں ہے۔ سینا! میں نے رسالہ پورا پڑھا۔ ایک ذہن ہمتاز کے افسانے میں بد مزگی کا اتنی اہمیت دینی کہ مجھے کبھی کبھی ایسا ہوا ہی جاتا ہے۔ بخیر باؤں اور امی محبت انجم کے لحاظ سے دو شیونے کے افسانہ اور پورے افسانے خوبصورت ہوئے۔ بالی انداز تحریر بھی کا اچھا تھا۔ سچی کائناتوں میں صرف "میں" ہی نہیں بلکہ دوسروں انسانی رنگ لے ہوئے تھیں۔ طرز و الفاظ کا کچھ کے رشتے اور فیصلہ تو خاص طور پر بڑے کچھ سے موضوعات سے خوب سراپ حقیقت ہے بعد تھی۔ میں نے اب کچھ تحریر کر دی ہوں یہ ہائز نہ کرنا۔ سلسلہ دار کائناتوں میں نے بھی نہیں پڑھیں۔ پچھلے شمارے میں ایک افسانہ شروع کر بیٹھی دو میان میں ہی بد گیا اور میں ٹیکال پل آئی۔ مگر بیٹیاں کچھ رسالہ نکالیں۔ پڑھاؤ آخر میں لکھا تھا "بائی کائنات" مت پچھو کیا حال ہوا۔ افسانے کے شروع میں طلعت نہ لکھا تھا کہ بائی کائنات ہو گا ورنہ شروع ہی نہ کرتی۔ اب جب دو شیونے کیا تو سب سے پہلے اسے دھوڑا "سوچا دو سراہہ آخری ہو گا۔ کثافت پڑھا تو جیاتی آئندہ تخت زنج ہوئے، سوچا جیوں تو ان کے جو جو ہم سے قند دار ناول پڑھا بیٹھا ہے، دکھا تو تم نہیں۔ سچی کائنات تم نے کمال کر دیا، مجھے "کند" ہے بد پند

آگے بہت زیادہ بہت مبارک، پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ اس طرز کے ناول عموماً عموماً لکھتے ہیں ایک ایک ناول میں جس میں اچھی تک محبت بھرے ڈائیلاگ کی ملکات تک نہ ہو اور وہ قارئین کی توجہ کھینچنے کے لیے عام زبان کا کام نہیں لیں۔ میں جانتا ہے تمہیں اس کی کچھ افغان دیا ہے۔ مانگو کیا مانگتے ہو، دو شیونے کے ضرور کھوں گی "کلیں دیوں کی بغیر کسی مسئلے کے" مجھے دو شیونے کچھ نہیں چاہیے بس صرف اور صرف معیار و دہدہ کہ میری یہ راضی پوری کر دی۔ رخصانہ بائی کو سلام! دلی دعائیں تمہارے ساتھ "امید کہ دو چار ماہ میں دو شیونے کا معیار سامنے دیا ہو جائے گا۔ بہت سی تحفیں "اعازت" میں اپنی اعزائیت سے خطاب کرنے، نہ صرف مخاطب کے بلکہ ہمارے لیے اپنے دل میں بے پناہ قربت اور محبت محسوس کرے، ورنہ میں تو ایک داستان سے بھی ادبیت تخلیق کر دیتی ہے انسانوں کے، تمہارے لیے اب "عہد" کے پرا مانے کا بھلا کیا ہوا؟ تجدیدی یا تعمیری بنیاد ادبی ہے کچھ نئے موضوعات کی طرف تمہاری شانہ دہی اور صورت حقیقہ ہے امید ہے کہ معتقین خیال کریں کہ اب اچھوتے موضوعات کا انچائیں سب سے بڑا ہمارے اہل "کند" کی بات تو یہ سوچ کر مت ڈرتی ہوئی کہ شروع میں طلعت نہ کرنا ہمارے لیے کتنا اچھا ہو ورنہ تم بھی نہ پڑھیں اور نہ کیسے جان پاتے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کیسا ہے، آئندہ بھی تمہارے لیے لاگ تیرے کا انتظار رہے گا لیکن شینہ بی! افسانہ تو تم نے اب بھی نہیں بھیجا۔ کہ تک انتظار کر رہی ہو، دو شیونے کا معیار کیا ہے تو تم کی سوچ کہ جب ہمیں بہتر تحریر ہی نہ لیں تو بھلا ہم کیا کریں گے؟ جانے ہمارے معتقین کہاں ہیں، ابھی تک صرف چند ہی نے تم سے رابطہ قائم کیا ہے جن میں تم کو دہی یا سرمد شایدہ کا قاضی اور تیریا ویدو ہو ہیں۔ کچھ اور بھی ہیں جن میں فرزانہ، افراتاز، فہیمہ انصار، فوقہ متعلق و دیگر بھی شامل ہیں مگر تحریریں ہم تک کی ہی نہیں ہیں، پلیر جلدی سے تحریر بھیجنا تاکہ۔

کس کو علم طارق صاحب! امید ہے کہ نیز آپ کے اقتباسات ملنے بہت شکر ہے۔ سیراغلن شایہ، اٹھارہ سال لکھ لکھا تو تم نے شان بالا کے لیے لکھا تھا، بیجان کے

انتقال کے بعد میں نے دو شیونے پر سلسلہ بند کر دیا۔ البتہ اس کی اور اس کے دوسرے بیٹھائے ہیں "سچی کائنات" میں "مسئلہ" ہے" کے عنوان سے ایک سلسلہ چلے ہے تم افسانہ براہ راست خود لکھو، ہمیں یقین ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تاہم ضرور میں کہ جب کسی کو چاروں طرف سے تقریبی لکھیں تو اسے گناہ ضرور ڈالنا چاہیے، ممکن ہے طلعتی اس کی اپنی ہودور کوئی وجہ نہیں کہ کسی محبت کرنے والے کو مستقبل منت لے۔

شینہ خیرا! میں بھی تمہارا دخل لیا، کچھ اشعار بھی مگر بی بی اشعار میں نہیں ہیں، ابھی نہیں مسئلہ کی سخت ضرورت ہے، کچھ کتابیں پڑھتی ہو تو ذہنی دست تمہیں اچھا رٹھریا دے گی، پختی ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی اس لیے زحمت نہ کرو۔

یہ خط ہے فریالہ طلعت انکس سے بیاتلی اچھو جس کا لکھتے ہیں بائی بائی سیراغلن! میں تو اس ہلاک ہونے والے کیرجیان کے یاد دہانی سے کچھ اچھا تھا کہ شمارے آئے گا اور آپ لکھتے ہی کائنات کی طرح مدھرت کر سکیں گی کہ پڑھ لیت ہو گیا۔ ہماری طرف سے سب کو عید مبارک، ویدوہ ویدوہ۔

بیاتلی! بے حد شکر ہے، مبارک باد بھیجی گئی۔ کراچی آؤ تو ضرور ملنا۔ کوئی اچھی سی کمانی یا افسانہ بھیجی دوں گے کائناتوں کی ہیں، منتخب ہوئیں تو ضرور شائع ہو گی۔

یہ خط ہے جرنی سے جناب قمر انبالی کا انھوں نے سامراج صاحب کے لیے خط لکھا ہے۔ بہتر مضمون کاغذ کا آپ کا خط دوا صاحب کو پہنچا دیا گیا ہے۔ کچھ تکلف کا پڑھ کر تشنگش ہوئی، امید ہے کہ آپ تحریر سے ہوں گے۔ لکھا میں مگلا میں طلعت بھگت سے راض سینا قمر نے لکھا ہے ساتھ دو غزلیں بھی بھیجی ہیں۔ بیاتلی آپ ایک فرل موزوں ہے دوسری کے لیے معذرت خواہ ہیں، کو خوش کر کے کہ غزل جلدی چھپ جائے۔

یہ ہیں جناب تیریا صاحب! بہت ناراض ہیں بی بی! تمہارا افسانہ تو دل کیا اچھا پڑھا میں کیا ہے البتہ تمہارے شائع شدہ افسانے کے لیے تو ہم خود ہی معذرت خواہ ہیں کو طلعتی ہماری نہیں تھی۔ ہوتا یوں ہے کہ افسانے چھپ چکے ہوتے ہیں انھیں کراس کر کے لکھ بانڈہ کر رکھا جائے کہ ثابت رہے کہ چھپے ہوئے

افسانے ہیں۔ ہم جب یہاں چلا چنگ سنبھالا تو جو مسودے ہمیں ملے (تقریباً) اسی طرح تھے کہ ان افسانے بھی تھا۔ وہ ہم نے چھاپ دیا اب جو غل غلہ تھا وہی اس کی تودیشی مکتب میں مکتب میں لکھا گیا کہ ہم کسی کا بھی خط اور اعتراض گول نہیں کیا کرتے اور آپ کے ہاتھ سے ہی ہم اصل بات چھاپ رہے ہیں تاکہ ہمارے قارئین بھی مطمئن ہو جائیں اور آپ بھی۔ لیکن ایسے ہنگاموں میں تو ایسا ہوا ہی جاتا ہے کہ وہ بچے بچے مکتب خوار ہیں اور اب اس سلسلے میں مکتب بھی ہو گئے ہیں کہ دوسرے کی غلطی ہمارے سر نہ پڑ جائے تو اب ہاتھ سے معاف کرو ہے آپ کے ہاں اور طرف سے عید کی مبارک باد آپ کی قبول کئے اور جلد از جلد تبصرہ بھی بھیجئے۔ سچی کامیابی نہ ملے گی شکایت ہم نے متعلقہ شعبے سے کر دی ہے وہ کتنے ہیں ہمارا اس ان کا انکس نہیں ہے آپ اگر براہ راست انھیں خط لکھیں تو جیسے وہ ادا دیتے ہیں۔ دیر غفران نہیں دیں گے اگر وہ میں تکلف حتی اس لئے خط نہ لکھ سکے آپ ریش کو انبارا اب خدا کے فضل سے ٹھیک ہیں۔ اور اب پرچہ پر تبصرہ ٹائٹل سازا اچھی تھی۔ وہ تبصرہ کی عقل دار سے واہ شادی ناصر شاکی اور خالی جگہ پر کروا کر ہمارے تسلیم بھائی کو نامراض نہ کرنے کا احسان ہے۔ تبصرہ کرنے کی ان کی پوری ایک عدد مائیں موجود ہے جس کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ ادھر میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ سچی آپ کو کیسے مانتاؤں؟ اب اگر سلیم بھائی آپ کو کچھ کہیں تو میں نہیں ڈاؤن دے دیتے کہ میں ان سے بھی آپز نہیں کے علی احمد عجم کی شہر کاری کی شکر آ رہی رہی۔ سبیا آتی جاتی ہیں میں نے سب سے پہلے کیا پڑھا؟ "مکند" جس کا شکر سے انتظار تھا۔ مکتب میں دو چیزیں بری ہوتی ہیں ایک بھاری نمبر دو دقت۔ تو بک ملیں گے آدا اور ظاہر نہیں کہ ظاہر کے دوسرے ہیں۔ یہ شک وہاں فرزند قوال بھی پڑھائی جاتی پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ وہ تبصرہ کی مکتب کو بھی احوال کی طرح کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ خط شامل ہو سکیں۔

تو لی بی بی مایہ گنڈ پندرہ گئے کا تبصرہ "سبیا چھاپا" میں اس وقت تھا۔ اگر پورا شمار پڑھ کر لکھیں تو تب آپ بھوک رہا۔ مکتب بھائی کے کچھ کہنے کا تو خیر ان کی اتنی جرات ہی کہاں ہے کہ منہ پر کچھ نہیں بھیجئے تبصرہ ضرور دیتے ہیں

اور شمار چھپ جانے کے بعد لوگوں کے پیچھے چھپتے پھرتے ہیں۔ عجل جیسے ہی ہاتھ ملے ہیں ان کی شامت رہتی ہے۔ انگلہ پھر روز کھٹے کے قاتل نہیں جانتے ضرورت پڑی تو ہمیں ضرور آواز دیں گے اس کا دل کا شکر ہے لیکن ہمارے تین عدد افسانے مل گئے۔ جلد پڑھ کر بتائیں گے اور یہ مکتب سے ظاہر ہوا کہ آقا درمیں ہم پر بھی اعتراف ہے کہ ظاہر پہلے مکتب شکر کے نام سے لکھا کرتی تھیں۔ آپ نے ہمارے گزشتہ شمارے میں ایک افسانہ مکتب مرزا کا پڑھا کہ "ہم دیر کی" "تو وہ بھی تھا۔" لکھی ہیں یہ افسانہ بہت زیادہ پہلے بھیجا تھا۔ جب مکتب کے نام سے لکھی تھی۔ افسانہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مزید بھیج دیجیے لیکن جلدی افسانہ بھیجو مگر ستر نمبر افسانے کا خلاصہ بھیج دیجیے۔ فوراً اس تفصیل میں چلا کر نامو آتا ہے۔ خط میں صرف اپنے افسانے کا ذکر کری کرنا کہو کہاں ہے بھی؟ شمارہ تو پورا پڑھا ہو گا کیا صرف اپنا ہی افسانہ پڑھ کر نہیں لکھیں گے؟ میں تمہاری "مکتب" فیڈرل ہی اریک کرتی ہے انھوں نے پہلی بار خط لکھا ہے اور اب اچھی غزل بھی بھیجی ہے۔ لیکن یہ مکتب غزل غزل موزوں نہیں، تم نے ردیف قاتنے کا بھی خیال نہیں رکھا۔ پرستی اور انشاء اللہ شہرہ یں ہی جاؤ گی۔

اور جناب یہ ہیں ہماری اچھی دوست رومی یا سرا لکھی ہیں سبیا مایہ! افسانہ بھیج رہی ہوں۔ اس دفعہ کا وہ تبصرہ زبردست رہا۔ خاص طور پر مہتر روشنی کی "مکند اری" ہاؤس کے لیے۔ یعنی اور باؤس میں ہمیں خبریں تھیں "ان صاحب طرز افسانہ گانوں کی مکتبوں میں بھلا کون وہ تبصرہ کو بھلا سکتا ہے۔ یہ شک میں کچھ غامض نہیں امید کہ آئندہ نہیں ہوں گی۔

رومی اپنی پند کی کا شکر ہے "افسانہ مل گیا" جس براہ راست خط لکھا تھا "مکتب" مل گیا ہو گا۔

خوش آمدید یا مکتب میری! آپ کا خط مل گیا ہے پڑھ کر افسوس ہوا کہ بیٹا چھاپا تھا۔ برا صدمہ تھا۔ ایک سال پر اولاد کا صدمہ قیامت سے کم نہیں ہوا، خدا حوصلہ دے وہ ٹھیک ہے۔ کچھ اطمینان ہوا "انڈے چھاپا تو مزید صحت ہوگی" ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں آپ نے وہ تبصرہ کی مکتب بھائی نے والوں کو سلام لکھا ہے، ان طور کے ذریعے سب کو

سلام پہنچ جائے گا۔ سہام مرزا صاحب کو سلام پہنچا دیا ہے، دعا کرتے ہیں۔ فرصت ملے تو جلدی سے افسانہ بھیج دینا سب کو کہتے ہیں۔

یہ خط ارم ہاؤس نے کراچی سے تحریر کیا ہے۔ "دو شہر" نے انکریل کے آفسن کو رکتیں مکتبوں سے چلاؤا۔ سب سے پہلے خند، بچان، لینک چیک "ام بچہ" اور شاخ کا اب بہت اچھی لکھی گئیں۔ خواب سراب ناں پناہ اور طرز و فاضل سے مثال تحریریں تھیں، منتقل سڑکوں میں تمام کے تمام ایتھے رہے۔

شکر ہے ارم ہاؤس نے آپ کی مکتب سے اس میں آپ کی شرکت رونق دہلا کر دی ہے۔ اور لیکن جو اصل ادا کی کرنا تو خیر ہمارا اولین فرض ہے کہ دوسرا ادا کی تو لکھنے کی تحریک پیدا کرتی ہے، ہماری دعا تھا اچھی تھیں "خدا پوری کرے۔"

یہ مکتب سے شاہد عمر قریب کا کراچی ہے "ہا کرے" خوش فاضل سنانی، قریب سے اس کی دست دیکھو تو اس نے وہ تبصرہ سمجھا لیکن جابنے پہلے پناہ خند کا شعر ہے کہ "مکتب" ہوا یہ شعر خود ارم ہاؤس نے لکھا تھا۔ اور ان کا فائدہ ہوتا ہے کہ شہر کی پہلی جگہ مل رہی ہے۔ وہ تبصرہ سے دو سٹی کی تھی جو آج تک قائم بھدا کرے اور لکھنے والے بھی لوٹ آئیں۔ لیکن "ان بچان" یا "اسامہ" کا صاحب نہیں، مکتب کامیابی ہے؟

ہاں شاہد، ہم بھی ان سب کی مثالیں دیکھیں گے۔ پیلر آپ بھی کو شکر کریں۔ دیکھیں ان کی مکتبوں میں تو یہ مکتب سنی سنی سنن لک رہی ہے۔ یہ سب کہتے تو کیسا مزہ آتا ہے؟

فرقت پڑھ لکھی ہیں۔ ذریعہ سبب پناہ لادہ۔ بہت شکر ہے۔ اسی وقت سے نوازا اور میری فخر میں شہر ایک بے اندازہ خوشی ہوئی وہ تبصرہ ملا۔ مزید اپنی اور شہر میں اسی اتنے عرصے بعد وہ تبصرہ ملا۔ انھیں بھی وہی ہے اس لیے افسانے کے ساتھ اور شاہد کی ان سارے باتوں سے واقعتاً شکر ہے کہ وہ کیا بڑا صدمہ ہوئی کہ ہم راہ چنگ کی دعا میں سڑکیں پڑھ کر کوئی بے بسی ہوئی ہوں پرنا تعلق ہے میں انکریل کی شہر ہمارے کہتے ہیں۔ اس لیے کہ میں انکریل کی جاؤں گی مگر وہ تبصرہ ہمراہ لے کر آپ کو سنائی ہی مبارک

آپ نے داریاں سنائیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنی فرصت ہے۔ ہمارا اتنا پر کھلف خطاب پندرہ نہیں تھا۔ ڈیڑھ سبیا غزل صاحب، ان پڑھتے پڑھتے گئے۔ ڈیڑھ ساراداسا لکھا دیکھیں خراسا خطاب میں بھی ہے پناہ غلوں سے بے قول کر لیا۔ خوشیاں مبارک شمارہ کیا گا ہے میں لکھا۔ بہت دور جا رہی ہو مکتب جانا! بہت شکر ہے ہمارے کہ شہر میں اور اب صاحب کے بھی کہ وہی تبصرہ تو ہمارے ہی خند ہو گا۔ مکتب بھی قریب کا کب عید کا رڈ مل گیا۔ بے حد شکر ہے دو شہر تو مل گیا ہو گا! کیا گا ضرور لکھیں۔

اختر شتاب صاحب نے ظہیر حسین صاحب کو خط لکھا ہے۔ لکھتے ہیں وہ تبصرہ کیا؟ میرا افسانہ بھی چھاپا ہے مگر پرچہ مکتب سے نہیں پہنچا۔ آپ پر تو نے داری میں اس سال لکھا کیوں کہ آپ لوگ ہر کام سبب کتاب اور باقاعدہ طریقے سے کرتے کے عادی ہیں وہ سکتا ہے۔ ڈاؤن والوں کی رہائی ہو گی کامیابی بھی کا شکر ہے "سبیا غزل صاحب کا بھی شہر ہے اور اگر مکتب کے کامیابی کی رسید آپ کی بجائے انھوں نے دی تھی۔

اختر شتاب صاحب! امید ہے کہ یہ خبر! محترم ظہیر حسین صاحب کا اب اس ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب کہ آپ کے تمام خط افسانے کے نام آتے ہیں۔ یہ سن کر ہوا کہ اگر شہر میں مکتب کا نام معلوم کرتے ہیں۔ آپ کے دوسرے افسانے بھی مل گئے تھے غالباً ہم آپ کو رسید دے دی تھے۔ یہ شمارہ پڑھا تو تبصرہ ضرور لکھیں گے گا۔ "ڈیڑھ سبیا" وہ تبصرہ دوسرے دن سے ملا مگر صدمہ شکر مل گیا۔ وہ ہم تو ذریعہ تھے گئے۔ "مکتب" میں کل جا تمام آتے ہیں۔ لکھی ہیں۔ ۱۳۱ شمارہ اور شمارہ کیوں چلا کر ایک ہی نظر میں سارا پڑھا والیں مگر میرا سارا مزید کیا کریں گے؟ یہی سوچ کر سوسے وقت گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں۔ پہلے تو وہ تبصرہ کی مکتب میں شکر ہونے کی تاریخ تھا ہوا کہتی تھی اب کون ہی ہوتی ہے؟ حضور ہاتھیں کا گاب تبصرہ مکتبوں کی ہے ظہیر بھلا کا جادو ہے۔ فرزند قوال اپنی مخصوص ڈگر پر چل رہی ہے کوئی چوکا دینے والی بات نہیں لکھ کر نہ میں قدم قدم پر جس لطف سے جاتا ہے۔ سچی کامیابی میں ٹھیک ہی تھیں۔ سید علی اسلان کی سولی پندرہ تھی۔ احتساب اور ڈاؤن اپنے موضوع اور انجام کے

باعث اچھی لگیں۔ دھندلے خواب میں فیشن کی دوڑ اور مذہب کی اندھا دھن تقلید کرنے والی عورتوں کا انجام اچھا دکھایا ہے۔ چاندنی نے ہمیں اپنی دو دنیاؤں کے درمیان کے ہالے میں تو کیا لیٹا تھا انہی تمام رات ڈرتے رہے۔ لگتا تھا وہ بولے پاس سے سرسرا کر گزرے ہوئے۔ ابھی اتنی ہی وہ سکی ہوں۔ سزاے موت اچھی لگی، کل ماہریت شکر یہ اس تیرے کا بانی شاہرہ بھی بدھ لو۔ تیرے ہم سے متعلق تمہاری تجویز نوٹ کر لی ہے، مصلحتا میں گے لی بی دو شیرو کی محفل میں شریک ہونے کی تاریخ ابھی بھی پندرہ ہی ہے تم کو شکر کے پہلے ہی خط بھیج دو کہ آج صبحا ہوئے یہ بات پہنچے لی ورنہ تم تو قبول ہی جاتے تھے۔ پچھل بار بھی کافی خلطو شال ہونے سے روکے تھے اس بار شال کیا جا رہا ہے۔ اگر ہمیں آپ سب کے خلطو پندرہ تاریخ سے پہلے ملے تو وہ محفل میں ضرور شامل ہوں گے۔ ورنہ پھر اگلے ماہ کا انتظار کرنا پڑے گا۔

یہ خط ہمیں ما معلوم کہاں سے مختصر کل نے لکھا ہے بی کیانی پر آپ کا اعتراف پڑھ کر ہمیں کچھ بھی ہوا اور اس بات کی خوشی بھی کہ ہمارے قادی بوری گھر کی نگاہ اور گھرا مصادفہ رکھتے ہیں۔ ہم نے کیانی کے مصنف کو خدا لکھ کر جواب طلب کیا ہے۔ بہت شکر ہے کہ آپ نے نشان دہی کی دوسری بات یہ کہ بی بی آپ کے خط میں تو اب بھی کنفیوژن ہے۔ جب آپ نے اب بھی یہ نہیں لکھا کہ بیٹم عبدالحمید ملک آپ ہی ہیں۔ آپ نے اپنے اپنے افسانے کے بارے میں بیٹھنا کل کے نام سے باز پرس کی ہوگی جب کہ ہمارے پاس بیٹم عبدالحمید ملک کا افسانہ تھا ہمیں صورت ظاہر ہے کہ جواب افادہ میں کل تمام ابھی بیٹم عبدالحمید ملک کا افسانہ "پچھتاہوں کے روگ" کے نام سے ہمارے چچی کیانی شاہرہ میں بھی چھپ گیا ہے۔ آپ براہ مہربانی ایک عام لے کر لیں اسی نام سے ہمیں افسانے یا کیانیات بھیجیں۔ کنفیوژن ہمیں آپ کے ایڈریس کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ ہمارے پاس آپ کی کیانی کا سوسوہ موجود ہے جس کی پیشانی پر بیٹم عبدالحمید ملک لکھا ہے۔ امید ہے کہ ایڈیٹر خیال رکھیں گی اب تو آپ کو افکار کی اذیت سے نجات ملے گی ہوگی؟ کیا سلیٹاؤں کے خط لکھتے وقت اپنا پورا ایڈریس ضرور لکھ لکھے تاکہ آپ سے فوری رابطہ قائم کیا جاسکے۔ شکر ہے اور قارئین یہ خط ہمیں

جھنگ صدر سے فاطمہ شریں کیانی صاحبہ نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں "مٹی جان سی ساغرل دو شیرو پاکرا آخی اتخی خوشی ہوئی کہ تائیں کیں یوں جیسے میری چھڑی ہوئی دوست لگ گئی ہو۔ میں اپنی دوست دو شیرو کے لیے دن رات دعا میں جا رہی ہوں۔ آپ کو تو میں نے ہم سے پہچان لیا تھا۔ آپ چچی کیانیات میں ہوتی تھیں، دو شیرو میں سلیم فادقی صاحب کا خاف پڑھ کر خوش ہوئی۔ آپ کی رجانہ خاںہ آئی کو میری طرف سے حد سلام کہنے گا۔"

تو بی بی فاطمہ شریہ کہ تم دو شیرو کو اس قدر پسند کرتی ہو تمہیں تمام کیانیات اور افسانے پسند آئے اس کا بھی بے حد شکر ہے۔ ہوتا تو چاہیے تھا کہ تم ہمیں تفصیل بھر کر لکھتیں شریہ! اتنی کافی ہے۔ تمہارا سلام پہنچا دیا گیا ہے۔ ابھی کیانی لکھ کر بھیجیں گی تو پتہ چلا کہ کسی سے ہم انتظار کریں گے یہ خط ہمیں ہماری بہت اچھی اپنا زور اور اپنی دوست سیما نے امریکہ سے لکھا ہے، لکھتی ہیں مرزا صاحب جھنگہ وطن آپ کا اور سیما سائرل کا خط موصول ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ بہت ہی چاہتا ہے کہ مختلف موضوعات پر لکھ کر تمہیں کثرت میں ملنا دے کہ کوشش کروں گی کہ جلد ہی کچھ لکھ کر بھیج دوں گی۔

ابھی سیما خوشی ہوئی کہ تم نے وہاں دو روز شہر کی مصروفیات کا سامان کر لیا ہم بہر حال تمہارے افسانے کے منتظر ہیں۔ پچھتہ وقت ہمارے لیے نکال لو تو بڑے شکر گزار ہوں گے۔ شکرگو اتھارے میں لوگوں نے کہا کہ اگر تو ہمارا کیا ہے؟ بی بی باتوں کا جواب ہمیں مرزا صاحب براہ راست دیں گے اس لیے اللہ حافظ۔

قارئین درود! تو میں خان کو تو آپ سب جانتے ہوں گے۔ میں نے وہاں میں بی بی آپ کی بارش میں سرتھکوں پر مگر دو شیرو جھنگہ وطن میں طوفان میں گھرا رہا ان سے تو آپ واقف ہوں گی سی! آپ دو شیرو کی پرانی ساتھی ہیں پھر بھی اس قدر بارش میں۔ دراصل ان دنوں جو افواہ فزنی تھی اور جو طرح لوگوں نے پھیرا تھا ان حالات میں آپ کا افسانہ کم ہو گیا ہو گا لیکن اس ادارے کے کیانیات اور افسانے نہ صرف دو شیرو بلکہ اس ادارے کے دوسرے پڑوس میں پھیلتے رہے ہیں۔ ایک ذاتی بات پر اتنی جی تو اچھی نہیں ہوتی نا، ہم نے دایاں ہمارے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمیں خدا پر پورا بھروسہ ہے اور یقین

غزل

سوچ کا ہے سمندر ترے شہر میں
ہم اگھاتے ہیں پتھر ترے شہر میں
کچھ ملے ہیں شکر ترے شہر میں
ایک سے ایک بڑھ کر تے شہر میں
آنجانے کو آئیں ہیں پھر سر پھرے
اپنا اپنا مقدّر ترے شہر میں
سارے چہرے سے ہر نقش ابینی
ہم ہیں حیران و ششدر ترے شہر میں
سوچ کر آج افساد گھر سے چلے
معرکہ اک کریں سر ترے شہر میں

قاضی انصار

تو بھی بتائے اب کیا کریں؟ بی بی کیانیات تو ہر ماہ بھیجی جاوے کہ مگر ہم صاف صاف لکھ رہے ہیں کہ اگر بے نام کی کیانیات بھیجیں تو ساری کی ساری ستوار کر اپنے نام سے چھاپ دیں گے پھر شہادت نہ کرنا کہ ہماری کیانیات چوری کر گئیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہاری بیساکھی کا کیا کریں؟ تمہارا تو اتنا چاہی نہیں۔

یہ خط ہمیں دہلی گئے لکھی ہیں۔ "یہ میرا دوسرا خط ہے۔ بہت افسوس ہوا جب آپ نے میرا بلاخطہ شائع نہ کیا میں تو قنقن مصیبتوں سے آپ کو خط بھیجتی ہوں اس کا اعزازہ اگر آپ کو ہو جائے تو آپ سب سے پہلے میرا خط شائع کیا کریں۔ فوری کا شاہرہ پڑھا ہر افسانے پر تبصرہ کروں گی تو خط طویل ہو جائے گا اور آپ دہلی کی فوری میں پینک دیں گی۔ لیکن تعریف سے پہلے تنقید دو شیرو کی محفل اور ہوا دو جگہ شائع ہوئی۔ بی بی آپ کی یہ بات مجھ میں نہیں



واقعہ معراج اور اسلام کا صدق اُترانے نو حیات کا داستان عبرت
جبرسیکڑوں سیر سے دہی پرکٹ ہے۔

معجزہ

یہ نبوت کا بارہواں برس تھا چند کہ اسلام کو دنیا میں آئے زاہد عرصہ نہ گزرا تھا، مگر اس کی آواز دور دور کے علاقوں تک پہنچ چکی تھی اور گھر گھر عجیب کش کش کا عالم تھا۔ ایک طرف اسلام کی شدید مخالفت اور دوسری طرف اس دین کی فطری کشش دلوں کو مٹھ کر دے رہی تھی۔ ان بارہ برسوں میں لاکھ ہر شہادتی اور ہر مصیبت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی، مگر آپ وہ ہی تھے جن پر نبوت تمام ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت و رسالت پر سرفراز فرمایا تھا اور آپ نے ہر اذیت، ہر رکاوٹ اور ہر مصیبت کے باوجود خود کو ہر شعبہ حیات میں ہادی و رہبر ثابت

میں ایک افسانہ بنتا تھا ”جن پہ تیکہ تھا“ آج تک پتا نہیں چل سکا کیوں۔
لی بی! اتم نے بہت دور کر دی۔ اب تک تو اسے مسودوں کو چھان رہے تھے اس نام کا کوئی افسانہ نظر تو نہیں پڑا۔
تم اگر یاد کر کے دوبارہ لکھ دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ دو شیروں کی پسندیدگی کا شکر ہے اور بی بی فرزانہ اعجاز تمہارا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ شکر کو کہ تم محفل کے آخری سطر لکھ رہے تھے اگر ذرا سہجائی نہ ہو جاتا۔
خیر تمہارا افسانہ مل گیا یعنی ”طوفان کے بعد“ براہ راست جواب دیں گے۔۔۔ وقت کی کمی آڑے آ رہی ہے امید کہ خیال نہیں کوگی۔
قار یں! ایک بات آئے ہیں جن کا تعلق ”روحانی زاک“ سے ہے اس سے پہلے ہی ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ”شان بایا“ کے انتقال کے بعد دو شیروں میں یہ سلسلہ بدلتا گیا۔ ہمارے دوسرے ماہنامے ”چی کمانیاں“ میں ”مسئلہ یہ ہے“ کے عنوان سے ایک سلسلہ چل رہا ہے قارئین سے التماس ہے کہ وہ اسے مسائل کے بارے میں براہ راست پتہ کمانیاں کو خط لکھیں۔

البتہ اگلے ماہ سے ہم تفصیلی مسائل اور ان کے حل کا ایک مستقل سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ان تفصیلی مسائل کا جواب تفصیلی طور پر ہر دوں کے، اگر آپ کو بھی کسی مسئلہ پر پیش ہے تو ضرور لکھیں۔ آزمائش شرط ہے۔
قارئین! یہ تھے وہ خطوط جو ہمیں آج تک موصول ہوئے۔ خطوط کا ڈھیر اب بھی موجود ہے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ سبھی خطوط کو محفل میں شامل کیا جائے اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ ہمیں اپنے خطوط پر مددگار سے پہلے لکھ دیں اگر کچھ ہتھے خط ہمیں اس تاریخ سے پہلے موصول ہوں گے وہ سب محفل میں شامل کیے جائیں گے دوسری صورت میں آپ کو اگلے ماہ کا انتظار کرنا پڑے گا۔
قارئین! ہمیں ضرورت ہے کہ اگر آپ یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ بی تو نہیں چاہتا کہ آپ کو ہائیں جائیں مگر کیا کریں اتنا وقت بھی نہیں تو اجازت چاہتے ہیں۔

اب تو چاہتے ہیں ہیکے سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا

آئی۔ چہ بھی اٹھا کر چپک کر لیا اور ہزاروں خط ابھی موجود ہیں میرا خیال ہے آپ دوبارہ پڑھ لیں۔ پناہ اور دو شیروں کی محفل ایک ہی اور اپنی ہی جگہ پر موجود ہیں پھر گفتیں ہیں۔
”سلسلہ دار کمانی لکھو اور ایک اور افسانے کی سمجھ نہیں آئی کہ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں پہنچے“ بی بی! اس سلسلے میں بھی غلطی تم ہی سے ہوئی ہے لکھ سلسلہ دار ناول ہے۔ فردی کے شمارے میں اس کی دوسری قسط آئی ہے، یوں یہ سلسلہ لمبا چلے گا اور آخری سہرا ابھی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ دوسرے افسانے سے تمہاری مراد فرزند قوالہ ہو گی کیوں کہ وہ بھی سلسلہ دار ناول ہے اور اس کے شروع اور آخر کا بھی یہی حال ہے۔ آگے تم نے لکھا ہے کہ دو شیروں کی محفل اور اشعار کے لیے صفحات کم ہیں قوی بی! اب ہم خود آہستہ آہستہ صفحات بڑھا رہے ہیں یہ شکایت دور ہو جائے گی۔ کہیں منورہ نوری کی کمانی تختہ پلند آئی شکر ہے۔ پناہ ”سراوے ہاؤس پیمان“ اسم محبت، بلینک چپک، شاخ کلاب، پسند کرنے کا شعر ہے۔
اشعار مل گئے فرشتے نہیں ملیں۔ ہمارا خیال ہے کہ تم پرچہ پھینک دینے کے کافی عرصے کے بعد خط لکھ رہی ہو جب کہ سب کچھ بھول چکی ہو تبھی بھی تم نے فردی کے شمارے پر کیا ہے جب کہ اب تو تاریخ کے بعد اپریل، مئی کا شمارہ بھی آیا۔ آہ وہ شمارے سے تعلق خط ہمیں بند رہا تاریخ سے پہلے بھیج دو اور دو خط محفل میں شامل نہ ہو پائے گا۔
یہ ہیں ہماری پرانی دوست منورہ ضیاء بی بی آپ کا مختصر سا خط مل گیا۔ حق و باطل پڑھ لیا کیا ہے مگر اس کی اشاعت کے لیے ہمیں کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا وچہ ہم محفل کی ابتدا پر لکھ چکے ہیں امید ہے کہ خیال نہیں کوگی۔
یہ خط ہمیں ہمیں صحابہ نے لکھا ہے۔ جناب دو شیروں کی پسندیدگی کا شکر ہے آپ کی بھیجی ہوئی ادبی رپورٹ اور غزل مل ہی بہت شکر ہے۔

اور یہ خط مروان سے لکھا ہے محترم قاضی غلام عباس صاحب نے محترم بڑی نوازش کی۔ آپ سے ہمیں یاد آیا کہ آپ کی غزل مل گئی گوشتش کر کے گھر آجی اشاعت میں لگا دیا گئے۔ افسانے کے بارے میں آپ نے بھیجے کو لکھا ہے ”خواب تک بھیجا نہیں چلی فرصت میں بھیجیں۔“
قارئین! یہ ہیں ملکہ نرسن شری لکھتیں ہیں انیس سو نوے

کیا تھا لہذا ان تمام منازل سے گزرنے کے بعد آپ عمر کے اس دور میں داخل تھے جب مالک حقیقی نے آپ کو ایک خاص کام پر مقرر کرنے اور نئی ہدایات دینے کے لیے اپنے حضور طلب فرمایا تھا تب ستائیس رجب ۱۳ نبوی کو آپ اللہ کے مسمان ہوئے، اس مسمانی اور میرانی کو عرف عام میں معراج کہتے ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مبارک سفر سے واپس تشریف لائے تو آپ نے تمام صحابہ کرام کو جمع کر کے معراج کا مکمل حال بیان کیا۔ اس وقت اسلام کے بدترین دشمنوں پر جو گزری سو گزری مگر عام لوگوں میں بھی جیسے ایک تسک جگ گیا۔ جو لوگ نبوت سے انکاری تھے ان کے ہاتھ اب ایک نئی بات آگئی تھی۔ کہ مکہ گلی کوچوں میں نوجوانوں کے ہاتھ ایک شعلہ اٹھاتا ہوئی نکلتا۔

”سنائے فرشتہ براق نے کرایا تھا۔“

”ہاں بھئی خدا کا مسمان جو بنا تو یہی سواری آتا تھی۔“ دوسرا قبضہ لگا تا جب کفار ٹھٹھے لگا کر ہشتے اور ایسے میں اگر کوئی مسلمان نظر آجاتا تو آواز دے کر کہتے۔

”کمال ہے بھئی وہاں بارہ سال گزر گئے یہاں وقت ذرا سانسہ نہ سکا۔“

”ہاں بھئی۔“ نبی کی اجارہ داری سے ہو چاہتے ہیں ان کا خدا کر دیتا ہے۔“ کوئی اور ہنستا۔ ”اور ہاں بھئی تمام آسمانوں کی سیر کی ہے جنت و دوزخ دیکھی ہے۔ بھئی ذرا پوچھنا کہ وہاں ہم میں سے بھی کوئی نظر آیا۔؟“

کفار مسلمانوں کو طرح طرح سے چھیڑتے۔ ایسے میں مسلمان توبہ و استغفار کرتے، ان عاقبت نا اندیشوں کے لیے خیر طلب کرتے خاموشی سے گزر جاتے۔ یہ صورتحال مکہ میں ہی نہ تھی بلکہ جہاں جہاں ان لوگوں کی پہنچ تھی یہ اسلام اور بانی اسلام کو خوب بدنام کرتے۔

اس زمانے میں شیعہ کی ہندو گاہ سے قدرے فاصلے پر حارث ایک بت پرست رہتا تھا۔ یہ کبھی پھیلیاں فروخت کر کے پیٹ پاتا۔ کبھی تجارتی کشتیوں سے مال آتا رہے اور مال لا دینے کے عوض چند دینار کما لیتا۔ اس کی دوستی اہل مکہ سے بھی تھی اور قریش کے بڑے سرداروں میں بیٹھ کر وہ اسلام کے خلاف باتیں کرتا اور فرمت کے لمحات میں مخالف جماعت میں شامل ہو کر اجرت پر خوب خوب مخالفت کرتا اور یہاں سے جا کر اس دین کے خلاف زہر پھیلاتا۔ ان دنوں سب کا یہی مشغلہ تھا لہذا وہ بھی یہی کرتا لیکن معراج کے واقعے نے جیسے اسے بے چین کر دیا تھا اب وہ باقاعدہ مکہ آتا تو گلی بازاروں میں پھیلیاں بیچتے ہوئے معراج کے واقعے کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے آواز دے کرتا۔

”لوگو! مسلمانوں کا نبی جھوٹ بولتا ہے ذرا غور کرو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک جگہ بارہ برس کا طویل عرصہ

گزر جائے اور ایک جگہ وقت ختم نہ جائے؟“

یہ انوکھا سوال اسی نے اٹھایا تھا اور یہ سوال اتنا عجیب تھا کہ ہر سننے والا اس کا ہمنوا بن کر معراج کو بھٹلائے لگتا تھا اور جہر جہر سے یہ گزرتے یہ بات عام ہوتی جاتی کہ اس سے بڑا جھوٹ ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان فرشتے کے ساتھ دوسرے جہاں میں جا کر بارہ سال کا طویل عرصہ گزار آئے اور اس کے گھر اور وطن میں وہی وقت رہے کہ اسی لو پر چڑا جتا رہے اور زمین اسی پانی سے گیلی ہو جو اس نے ہمایا تھا۔ غرض کہ حارث نے وقت کے اس تضاد کو نینا دینا کر معراج کے واقعے کو کچھ اس طرح بھٹلانا شروع کیا تھا کہ اب وہ بڑے بڑے سرداروں کی نظر میں آگیا تھا اور ابو بکر، ابو سب اور ابو سفیان جیسے ذی مرتبہ سردار جو اس سے اعلیٰ پینا نے پر یہ کام کرنا چاہتے تھے ماکر تے۔

”حارث! تم ہندو گاہ کی مزدوری چھوڑ کر اہم ہمارا ساتھ دو تو ہم تمہیں مالامال کر دیں گے۔“ حارث تیار ہو گیا تھا اور یہ سب ہو رہا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دریافت کرنے والے صحابہ کو معراج کے بارے میں مفصل بتاتے ان دنوں یہ مبارک محفلیں حضرت ارقم بن ارقم کے مبارک گھر میں تھیں جہاں اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل دوستوں کو اس سفر کے بارے میں بتاتے۔ حضرت ارقم بن ارقم کا گھر خانہ کعبہ کی عمارت میں تھا۔ اس کے ارد گرد گزرگاہ تھی جہر سے گزر کر اہل مکہ بازار میں جاتے، معززین کے گھروں کی طرف جاتے اور دارالندوہ کے لیے بھی ادھر ہی راستہ جاتا تھا اور اس گھر کے عقب سے وہ سڑک گزرتی تھی جو بیت آگے جا کر تاجروں کی رہنمائی ہندو گاہ کی طرف کرتی تھی ہر چند کہ یہ فاصلہ طویل تھا مگر مکہ سے یہی سڑک ادھر جاتی تھی۔ ابھی تک حارث ادھر ادھر بیٹھ کر معراج کے واقعے کو بھٹلاتا تھا، مگر اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اہل مسلمانوں کی محفل میں جا کر بھٹلائے گا، یہ بات بڑے حوصلے کی تھی لہذا سب نے اسے مدد دی تب وہ باقاعدہ سفر کر کے مکہ آگیا۔ اس سے قبل بھی وہ کبھی کبھی ادھر آتا تھا۔ اول تو اسے بڑے لوگوں میں بیٹنے اور بات کرنے کا سلیقہ تھا دوسرے وہ قریش سرداروں کا پسندیدہ انسان، اسلام کا مخالف، منہ پیٹ اور بد تمیز انسان تھا۔ جن دنوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو اس نے دور دور جا کر اس دین کی مخالفت کی جس کے عوض اس کو ابو سب اور ابو بکر کی دوستی نصیب ہوئی پھر جب کفار سے اہل مسلمانوں نے حبش کی طرف پھلی اور دوسری ہجرت کی تب قریش کو مسلمان قافلے کی روانگی کی اطلاع کرائی تھی، مگر جب تک کفار ہندو گاہ تک پہنچے، مسلمان اپنا سفر شروع کر چکے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک کبھی کبھی صرف ٹھٹھوں کرنے اور مسلمانوں کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے مکہ تک آتا

نہیں بارہ سال بیت گئے۔“

رملہ شوہر کی بات سن کر ہنس دی۔ یہ بات ان دونوں میاں بیوی کو خوب ہنسائی تھی بولی۔ ”اب چھوڑو اس بات کو مکہ یہاں سے کتنی دور ہے وہاں کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے۔“
”لیکن ان دونوں یہاں سے وہاں تک بھی موضوع ہے۔“ حارث نے کہا۔

رملہ پھر ہنس دی اور حارث اس کے پھولے ہوئے وجود کو محبت سے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی یہ بات اسے بہت مسرور کرتی تھی۔ وہ چند لمحے اسے محبت سے دیکھتا رہا پھر وقت کا احساس کر کے بولا۔

”دیکھو رملہ۔ میں جب تک واپس آؤں مچھلی تیار کر لیتا۔“

یہ کہتا ہوا وہ باہر کی طرف چل دیا۔ صحن کی دیوار پر ابھی دھوپ تھی اور گھر کے عین سامنے چھوٹی سی چڑیا مری پڑی تھی۔ گھر سے نکلے نکلے اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو رملہ پر خد کات رہی تھی اور مچھلی اس کے قریب پڑی تھی۔ اس نے رخ موڑا اور تیز چلنے لگا۔ مگر جگہ جگہ یہی موضوع زیر بحث تھا کچھ لوگ شہیدگی سے اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ کوئی کچھ دار آدمی دوسروں سے کہہ رہا تھا۔

”سنو جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا سنا ہے وہ آسمانوں تک ہو آیا ہے اور اس سفر میں اس نے بہت کچھ دیکھا اور بارہ سال وہاں گزارے ہیں۔“

یہ جملہ سننے ہی حارث کی ہنسی چھوٹ گئی پھر وہ دل ہی دل میں متحزنانہ ہنسی ہستا ہوا دیکھا پہنچ گیا۔ اس وقت اسے نہانے کی خواہش تھی اور گھر جانے کی جلدی بھی لہذا اس نے بے تابی نہ کپڑے اتارے اور دریا میں کود گیا گھر۔

جو نئی پہلا غوطہ لگا کر سر ہا ہر نکالا تو حیران رہ گیا۔ نہ وہ بندر گاہ تھی نہ وہ کنارہ بلکہ یہ کوئی نیا علاقہ تھا۔ ایسی جگہ جہاں وہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے تعب سے ارد گرد دیکھا۔ طویل و عریض ویرانے میں یہ کوئی نئی بستی تھی جہاں دریا کے کنارے چند درخت، چند مکانات اور قدرے فاصلے پر ایک اونچا سا گھر تھا جو یہاں کے سردار کی اقامت گاہ ہونے کی غازی کر رہا تھا۔ حارث کو اچھی طرح یاد تھا کہ نہ وہ تیرا تھا نہ ڈوبا بلکہ اس نے کپڑے اتارنے کے بعد صرف ایک غوطہ لگایا تھا کہ بالکل ہی تپ چک گیا۔

”کیسے آیا؟ کہاں آیا اور یہاں کون لوگ ہیں؟“ وہ بڑبڑایا۔

اسے کچھ علم نہ تھا اب فکر مگر مٹھا کہ اپنے ٹھکانے کی طرف واپس چلے تو کیسے اور باہر نکلے تو کیوں کر؟ اپنے برہنہ ہونے کا تصور اسے الگ پریشان کر رہا تھا ابھی وہ ٹھکر ہی تھا کہ چند لڑکیوں کے ہنسنے کی

آواز نے اسے چونکا دیا۔ معلوم ہوا تھا کہ اس علاقے کی لڑکیاں دریا کی سرکے لیے آئی ہیں۔ اس وقت حارث کی حالت دگرگوں تھی اس نے خوف زدہ سے انداز میں ڈرتے ڈرتے سرپانی سے باہر نکالا تو اچانک کسی کی نظر اس پر پڑ گئی، تبھی شوریٰ آواز سن کر اس نے سرپانی کے اندر کر لیا، مگر آوازیں قریب آتی گئیں۔

”دیکھو دیکھو کوئی پانی میں ڈوب رہا ہے۔“

اس وقت حارث کا غیرت سے برا حال ہو گیا اور غوطہ خوروں کے دریا میں اترنے سے قبل ہی برہنہ ہونے کی شرمندگی کے احساس نے اسے ہوش و خروش سے بیگانہ کر دیا۔

حارث کو ہوش آیا تو وہ ایک صاف تھڑے کرے میں پڑا تھا چند لمحے خبر سے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد مکمل طور پر ہوش میں آیا تو اس نے ارد گرد نظر ڈالی تب اسے محسوس ہوا کہ وہ یہی بلند امارت ہوگی جو دریا سے نظر آئی تھی اور اب یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کرا یقیناً مسمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا ایک دروازہ گھر کے اندر ہی تھے کی طرف کھلتا تھا بند تھا اور دوسرا دروازہ باہر کی طرف اس اعلیٰ کی طرف کھلتا تھا جہاں چند درخت لگے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ہر شام معززین کی محفل ہوتی ہوگی۔ حارث یہ سوچتے سوچتے پھر کھڑا ہوا۔ ”وہ کہاں آگیا؟ کیسے آیا؟“

ابھی وہ سوچ رہا ہی تھا کہ قدموں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ چند سو لہ برس کے ایک لڑکے نے جو لباس سے غلام لگتا تھا نزدیک پہنچ کر ادب سے کہا۔ ”جناب! میرا نام عبدہ ہے میں آپ کی خدمت پر مامور ہوں دراصل مسمانوں کی دیکھ بھال میرا ہی فرض ہے۔ اس وقت مالک نے آپ کی مزاج پر ہی کی ہے۔“
”کون مالک؟ میں کہاں ہوں؟“ حارث نے چونک کر ایک دم سے کئی سوال کیسے اپنے بارے میں وہ بہت پریشان تھا۔

”جناب!“ عبدہ نے کہا۔ ”آپ سردار بہروز کی حویلی میں ہیں جو اس علاقے کے سردار ہیں۔ اس دن آپ ڈوب رہے تھے تو غوطہ خوروں نے آپ کی جان بچائی اور چونکہ آپ کسی اور جگہ سے آئے ہیں لہذا دستور کے مطابق سردار نے مسمان خانے میں آپ کو ٹھہرایا اور طبیب سے آپ کا علاج کرایا اور اب آپ کا مزاج دریافت کیا ہے؟“

حارث ابھی تک متعجب تھا۔ کیسا علاقہ؟..... کیا سردار؟ کیسے غوطہ خور؟ وہ یہ ساری باتیں سمجھ نہ سکا اور غلام سے دریافت کرنا بیکار تھا لہذا وہ بولا۔

”ہماری طرف سے اپنے سردار کا شکریہ ادا کرنا اور کہنا ہم ان سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ وہ ہمیں حاضر

ہوئی کی اجازت دیں۔“

عبدالوث گیا اور تھوڑی دیر بعد بہروز خود مہمان خانے کے اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں حارث بہتر دراز تھا۔ بہروز ایک بھاری بھر کم آوی تھا۔ حارث نے اسے دیکھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

”جوان تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ طبیب نے بتایا ہے کہ کئی یوم دریا میں ڈوبے رہنے کے باعث تمہارا ذہن متاثر ہے۔“

”مگر جناب! میں تو بالکل تندرست ہوں۔ آپ مجھے شام ہونے سے قبل گھر بھجوا دیجیے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔“

”تمہارا گھر کہاں ہے؟“ بہروز نے دریافت کیا۔

”شبیب کی بندرگاہ پر مزدوری کرتا ہوں اور وہیں میرا گھر ہے۔“ حارث نے کہا۔

یہ جملہ سن کر بہروز چونک گیا اس نے حیران ہو کر کہا۔ ”تھر تمہیں یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

”جناب تھوڑی دیر قبل میں نے کپڑے اتار کر نہانے کے لیے غوطہ مارا اور جو نبی سربراہر نکلا تو اس علاقے میں تھا۔“

اس وقت بہروز اسے یوں تک رہا تھا جیسے اسے دیوانہ سمجھ رہا ہو۔ چند لمحوں بعد اس نے سوالیہ انداز سے کہا۔

”تم جانتے ہو اس وقت کس جگہ ہو؟“

”میں نہیں جانتا۔“ حارث نے اعتراف کیا

”تم اس وقت اس علاقے میں ہو جہاں سے تمہارے وطن کی طرف کوئی راستہ نہیں جاتا۔ میں خود حیران ہوں کہ تم اس ساحل سے یہاں تک پہنچ کیسے گئے۔ آبی سرودھوں سے یہاں تک ممکن نہیں، صحرائی سفر کے لیے بھی طویل میدانوں کو عبور کرنا پڑا ہے اور یہ کام صرف قافلے ہی کر سکتے ہیں اور راستے کی طوالت جانتا چاہتے ہو تو یہاں سے مینوں کی مسافت ہے۔ اب تم بتاؤ تم وہاں سے یہاں تک جیتے ہوئے کیسے آئے؟“

حارث کو اس باختہ سا پڑا ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ مینوں کی مسافت ایک غوطہ لگانے کے دوران کیسے طے ہو گئی جب کچھ نہ سمجھ سکا تو لاپرواہی سے بولا۔

”جناب بات صرف اتنی ہے کہ میں نہانے کے لیے اترا تھا اور میں نے ہوش و حواس میں صرف ایک

قوطہ لگایا تھا اور جب پانی سے سر اٹھایا تو میں نے خود کو اس کنارے پر پایا۔“

اس پر بہروز نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

”معزز مہمان! ہمارے علاقے کا طبیب ٹھیک کہتا ہے کہ تم بہت دیر تک پانی میں رہے ہو جس کے سبب ذہنی صحت متاثر ہو گئی ہے تب ہی ایسی باتیں کر رہے ہو۔ ٹھہرو میں طبیب کو بلواتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سردار بہروز کھڑا ہو گیا۔ حارث نے رونا نے انداز میں اسے روکنا چاہا مگر آواز گنگے سے نہ نکلی اور بہروز کمرے سے نکل گیا۔

اس دن طبیب نے پھر یا قاعدہ معائنہ کیا اور ہر طرح سے جانچنے کے بعد اعلان کر دیا ”اس جوان کی ذہنی حالت درست نہیں ہے کیوں کہ یہ سیکڑوں میل سے پانی میں جیتے پیتے یہاں پہنچا ہے۔“

سب نے ہمدردی سے اسے دیکھا واقعی شبیب کی بندرگاہ سے یہاں تک زندہ جسم کا پہنچ جانا بھی ایک عجوبے سے کم نہ تھا۔ حارث نے بہت شور مچایا سب کو یقین دلانے کی کوشش کی، مگر کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ اس نے نہانے کے خیال سے صرف ایک غوطہ لگایا اور سر اٹھایا تو یہاں پر آگیا تھا لیکن حارث کی بے چینی کو دیکھ کر بہروز نے کہا۔

”گھبراؤ مت جوان، طبیب نے کہا ہے کہ وہ تمہارا مکمل علاج کریں گے، مگر اس میں چند ماہ کا عرصہ لگے گا اس کے بعد اگر کوئی قافلہ ادھر سفر کرتا ہو مالا تو تم اس کے ساتھ اپنے گھر چلے جانا۔“

اس وقت حارث کی کیفیت عجیب تھی۔ حقیقت بیان کرنے پر وہ پاگل قرار دیا جا رہا تھا لہذا اس نے کچھ نہ کہنے ہی میں مصلحت جانی۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر اس سے ہمدردی کرتے مگر وہ خاموش رہتا لیکن اس کی تنہائی کے لمحات بڑے اذیت ناک ہوتے۔ وہ یوں سیکڑوں میل دور آجائے پر حیران ہوتا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایسے میں اسے اپنی نوجوان بیوی رملہ کا خیال آتا جو اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ وہ سوچتا تنہائی میں اس پر کیا گزرے گی اور وہ اس کے یوں اچانک غائب ہو جانے پر کیا پہنچتی ہوگی مگر اس کی یہ سوچیں اور پریشانیوں اس صورتحال کا سدباب نہ کر سکتی تھیں۔ یوں وقت گزرتا رہا اور اس کا علاج ہوتا رہا اور اس کے خاموش ہو جانے پر لوگوں کو اس کی صحت مندی کا یقین آتا گیا۔

ایک ہی چند ماہ گزر گئے۔ ایک دن سردار بہروز نے کہا۔

”حارث تم جوان ہو، تندرست اور خوب صورت ہو میں جانتا ہوں تم جیسے بھی اور جہاں سے بھی آئے ہو تمہارا لیے یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے نہ تو تم فوری طور پر واپس جا سکتے اور نہ گھر کوئی اطلاع بھجوا سکتے لیکن اب بھی واپسی کے لیے مینوں انتظار کرنا پڑے گا اس لیے جتنا جلد یہ وقت کیسے گزراو گے؟“

”جناب!“ حارث نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں خود کسی پر بوجھ بننے کا عادی نہیں ہوں اس لیے سوچ رہا ہوں کسی نہ کی طرف نکل جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔“ بہروز نے جلدی سے کہا۔ ”میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم چلے جاؤ تم خود اس علاقے یا اس کے ارد گرد علاقوں میں اپنے لیے کوئی باعزت کام تلاش کر سکتے ہو اسی لیے میں نے خود تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے اگر تم پسند کرو؟“

”کیا؟“ حارث نے پوچھا۔

”میں مختلف شہروں کی طرف ایک تجارتی قافلہ روانہ کرنے والا ہوں جو میرا مال لے کر جائے گا اور مختلف شہروں سے ضروریات کی اشیاء لے کر یہاں آئے گا“ میں تمہیں اس قافلے کا سالار بنانا چاہتا ہوں اور اس کے عوض میں ایک معقول رقم دوں گا۔ اس لیے اچھی طرح سوچ لو۔“

حارث نے یہ تجویز بغور سنی۔ رقم سے زیادہ اسے اس بات سے دلچسپی تھی کہ وہ مختلف جگہوں سے گزرتے ہوئے اپنے وطن کے لیے کوئی مناسب راہ نکال لے گا اور اس سفر کے بعد وہ اپنے گھر لوٹنے کی سہیل نکالے گا۔ اس نتیجے پر پہنچ کر اس نے کہا۔

”جناب! مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی یہ پیش کش قبول کرتا ہوں۔“

بہروز اس جواب سے بہت خوش ہوا اور بولا۔ ”تم نے بہترین فیصلہ کیا ہے۔ تم دلیر ہو اور مجھے اپنے تجارتی قافلے کے لیے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی“ تم اپنی روانگی کے لیے ضروری تیاری کرو میں نے تمہارے بلبوسات اور زاد راہ کا بندوبست کر دیا ہے۔“

”شکریہ۔“ حارث نے کہا۔ ”میں آج ہی روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔“

یہ تجارتی سفر بڑا کامیاب رہا اور منافع مال ہائے گزشتہ سے بہت زیادہ ہوا جس کے عوض حارث نے بہروز کے لیے سامان حرب خرید ا اور دیگر اشیاء بھی۔ اس سفر سے واپسی پر حارث اپنے حال“ ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا ماضی رملہ اور اس کا ہونے والا پتہ تھا اور بے شمار دوست احباب تھے۔ اس کا چھوٹا سا گھر تھا جہاں وہ بچپن سے زندگی گزارا تھا مگر ماضی سے نا آؤٹے ایک سال ہونے والا تھا۔ اس کا حال تھا وہ علاقہ جو دور دراز ایک ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے ماضی کی طرف کوئی راہ نہ نکلتی تھی۔ حال میں چند ماہ تو اس کا علاج ہوتا رہا تھا اور چند ماہ سے وہ سفر میں تھا اور اس کا مستقبل؟ وہ پریشان ہو جاتا۔ آخر کیا ہوگا؟ وہ کیسے گھر پہنچے گا۔ اس کے گھر بچے کی ولادت ہو چکی ہوگی۔ وہ تصورات میں کم سفر کرتے ہوئے بہروز کے علاقے کی طرف آ رہا تھا جہاں پانی پانی کا حساب بہروز کو دے کر

مال اس کے حوالے کر کے وہ اپنے وطن کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ راہ میں ہزار دشواریاں ہوں گی کوئی سامتی نہ ہوگا مگر وہ تھا اس طویل فاصلے کو طے کر لے گا۔ سوچوں میں گم وہ سفر کرتے ہوئے اس علاقے میں پہنچ گیا جو آبادیوں سے بہت دور تھا جسے بہروز نے ہی رہنے کے قابل بنایا تھا۔ یہ کسی دریا کا کنارہ تھا جہاں درختوں کی قطاریں لگائے تھے بہروز کو وقت پیش نہ آئی تھی اور اب وہ اس زمین میں مزید درخت لگانے کی سوچ رہا تھا اور ان ہی درختوں کے جھنڈ میں اس نے کوئی مکان بنایا تھا جہاں سمان خانہ بھی تھا“ غلاموں کی رہائش گاہیں بھی اور اب اس میں اصطبل بھی تعمیر ہو رہا تھا۔ وہ یہاں سے سال بھر میں ایک تجارتی قافلہ روانہ کر کے اتنی دولت کمایا کہ سال بھر عیش بھی کرتا اور اس علاقے کو آباد بھی۔

راوی پر شام کے سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی لانی وریاں نفی لہروں پر انداز رہی تھی اور بلند درختوں کی چوٹیوں کو چوم رہی تھی اس منظر کے سبب راوی اور زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ حارث بڑی محبت سے راوی کے حسن کو دیکھ رہا تھا مگر اسی لمحے اس کے کانوں میں جیسے سریلی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ لڑکیوں کے ہنسنے اور بولنے کی ملی جلی آواز فضا کی رنگین بوہا رہی تھی۔ اس نے ہلک کر ارد گرد دیکھا تو اس کی نظریں جیسے ٹھک کر رہ گئیں۔ دریا جہاں مل کھاتا ہوا حویلی کے قصبے سے گھر گزرتا تھا وہاں پانی کا بہاؤ بھی کم تھا اور گھاٹ بھی گرا نہ تھا۔ اسی لمحے میں راوی کی لڑکیاں ایک دوسرے پر پانی اچھال رہی تھیں۔ ایک لڑکی جس کے بال کھلے ہوئے تھے اور قیمتی لباس پانی کے چھینٹوں سے بھگ گیا تھا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے نرم و نازک سفید پیر پانی میں ڈالنے میں مائل تھا کہ لطف لے رہی تھی اور غروب ہوتے آفتاب کی سرخی اس کے رخ تانیاک پر قازہ بن کر بکھر گئی تھی۔ حارث چونک گیا۔ اسے وہ شرمناک منظر دیکھ کر ہوش نہ رہا کہ مال سے لے دے ہوئے جانوروں کو لے کر غلام حویلی کے دروازے کی طرف بڑھ گئے ہیں اور اسے ان کا ساتھ دینا ہے بلکہ غیر ارادی طور پر اس نے گھوڑا روک لیا۔ اب اس لڑکی اور اس کے درمیان کا فاصلہ صرف چند گز کا تھا اور ان دونوں کے درمیان صرف چند درخت تھے۔ لہذا ابھی وہ اس لڑکی کے حسن بے پناہ کے دیدار سے سیرجی نہ ہوا تھا کہ اچانک اسے دیکھ کر ایک لڑکی ہالی مناتا دیکھ کر تیرا سمان“ پھر قافلہ واپس آ گیا ہے۔“

اب مناتا نے حارث کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے اس وقت حارث اراں روں ایک ہی صدا دے رہا تھا۔

”مناتا۔ مناتا۔ مناتا۔“

اس شب بہروز کو سفر کی روداد سناتے اور خرید و فروخت کے بارے میں بتاتے ہوئے بھی

حارث کا ذہن اس ماہوش میں لکچھا ہوا تھا۔ اس کی زبان لڑکھائی تو اس کی حالت محسوس کر کے بہروز نے کہا۔ ”حارث... شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں!“

”نہیں جناب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں... میں... میں.....“

”میں جانتا ہوں کہ۔“ بہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب یقیناً تمہیں گھر جانے کی جلدی ہوگی۔ میں نے چند دن قبل معلوم کر لیا تھا فی الوقت تمہارے وطن کی طرف کوئی قافلہ نہیں جا رہا ہے لہذا میں نے سوچا ہے کیوں نہ میں خود ادھر اپنا قافلہ روانہ کروں گو یہ کام مشکل ہے لیکن تم اس کے ساتھ ہی چلے جانا گریہ کام ابھی چند ہفتوں سے قبل ممکن نہیں۔“

آخری جملوں کو سن کر حارث کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار وہ گھر جانے کے نام سے پریشان ہو گیا۔ اب تک یہ عرصہ اس نے گھر جانے کے تصور میں گزارا تھا۔ شاید ہی کوئی رات ایسی تھی جب اسے اپنی بیوی رملہ کا خیال نہ آیا ہو۔ وہ سوچتا تھا۔

”رملہ نے اس کے یوں گم ہو جانے کو کیا سمجھا ہو گا؟“

”بچے کی ولادت کے وقت اس نے کیا کیا ہو گا؟“

مگر آج اس کے ذہن میں گھر، رملہ اور بچے کا کوئی تصور نہ تھا بلکہ اسے یہ بات گراں گزر رہی تھی، بس آج تو ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی تصور، کھلے ہوئے گیسو، گیلے بدن سے لپٹا ہوا لباس اور کھرا ہوا چہرہ..... اور جب اس سوچ سے پریشان ہو کر وہ آنکھیں بند کر تا تو دل کے ہر گوشے سے ایک ہی نام بلند ہوتا۔ ”مناتہ! مناتہ!“ کسی لڑکی نے کہا تھا کہ مناتہ تمہارا مہمان آگیا۔

وہ سوچتا ”کیا وہ مناتہ کا مہمان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مناتہ سردار بہروز کی دختر ہے۔ اس وقت بھی وہ انہی خیالات اور تصورات میں گم تھا کہ بہروز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میرے دوست! میں جانتا ہوں تم اپنے گھر کے لیے بے چین ہو مگر یقین کرو اب صرف چند ہفتوں کی بات ہے اور میں صرف تمہاری وجہ سے قافلہ تیار کر رہا ہوں۔“ حارث چونک گیا اس نے جلدی سے سنبھلے ہوئے کہا۔

”میرے محسن میرے عظیم میزبان! اس وقت میں گھر کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔ دراصل میں تھک گیا ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ بہروز نے شفقت سے کہا۔ ”تم اب آرام کرو اور آج شب کا کھانا مہمان خانے میں نہیں بلکہ حویلی کے طعام خانے میں ہمارے ساتھ تناول کرو گے۔ ہم تمہیں میرا قافلہ سمجھ کر دعوت

دیتے ہیں۔ اس بار تجارت میں بہت زیادہ منافع تمہارا ہی رہیں منت ہے۔“ حویلی میں قدم رکھنے کے تصور سے ہی حارث کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر اس سے قبل کہ اس کیفیت کا اظہار ہوتا بہروز نے کہا۔

”میں نے آج تک تمہیں اپنے گھر کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا مگر آج بتاؤں کہ اس قلعہ نما گھر میں صرف دو نفوس رہتے ہیں۔ ایک میں اور ایک میری اکلوتی بیٹی مناتہ کی ماں اسے چھوٹا سا چھوڑ کر مرنے لگی تھی مگر وہ اس درجہ خوش اطوار اور حسین عورت تھی کہ اس کے بعد مجھے اس صنف میں کوئی کشش نظر نہیں آئی اور میں نے ماں اور باپ دونوں کا فرض ادا کرتے ہوئے مناتہ کی پرورش کی۔ اب میرے لیے وہ یہ سب کچھ ہے اور میں نے یہ علاقہ صرف اس کے لیے آباد کیا ہے تاکہ وہ یہاں کر مجھ سے دور نہ جائے۔“ حارث دھڑکنے والے دل سے سب سنتا رہا اور بہروز نے یہ ساری باتیں بڑی صاف دلی سے ادا کیں مگر حارث کے لیے یہ باتیں بڑی ہی اہم تھیں جب بہروز چلا گیا تو وہ آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ گیا مگر اس کی سوچیں مناتہ کا ہی طواف کرتی رہیں اور وہ بے چینی سے لیٹنا بہروز کی طلی کا انتظار کرتا رہا۔

اس شب حویلی کا طویل و عریض طعام خانہ بڑے خوبصورت انداز سے آراستہ تھا۔ شمع و فانوس کی روشنی میں طعام خانے کا تخت اس پرچنے ہوئے انواع و اقسام کے کھانے اور قیمتی ظروف چمک رہے تھے۔ اس تخت کے مرکز میں بہروز چمکی ہوئی خوبصورت پوشاک میں بر اجمان تھا اور حارث کے عین سامنے مناتہ شام کی مناسبت سے گہرے رنگ کا زرد برق چمچا نا لباس پہنے ان تمام روشن چیزوں سے زیادہ دل انظار آ رہی تھی۔ ہر چند کہ بہروز نے ان دونوں کا تعارف کر دیا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ مناتہ کے سوا کسی اور پر بات کر کے خوشی محسوس نہیں کرتا تھا لہذا اس نے پھر کہا۔

حارث نے میری اکلوتی بیٹی ہے جس کے بارے میں اگر میں یہ کہوں کہ اس کے سوا دنیا میں میرا کوئی اور مہمان نہ ہو گا۔“

حارث نے تعریفی نظروں سے مناتہ کو دیکھا۔ ٹھیک اسی لمحے مناتہ نے بھی اس کی جانب دیکھا اور ایک لمحے کے لیے جیسے وہ سب کچھ بھول گئے پھر اپنی نظروں کی گہرائی اور تپش کو محسوس کر کے بیک وقت دونوں کی طرف لپکے۔ کھانے کے دوران سردار بہروز حارث سے سفر اور تجارت کے مکمل حالات دریافت کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ حارث وطن واپسی کے لیے غلط کرے گا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے بات محسوس کی کہ حارث اس ذکر سے جیسے گریز کر رہا تھا۔ آخر میں جب حارث نے کہا۔

”اب! میں سمجھتا ہوں کہ ایسی تجارت اگر سال میں ایک بار بھی کرنی جائے تو بے حد منافع کمایا

جاسکتا ہے اور پھر آپ اس وادی کو مکمل طور پر آباد کر لیں تو خوب رہے گا۔“

”کیا تم اس میں کوئی مشورہ دینا پسند کرو گے؟“

”جنتاب! اگر آپ یہاں کا انتظام تھوڑے عرصے کے لیے میرے سپرد کر دیں تو میں سب سے پہلے شہر کاری کا آغاز کروں۔ اس دریا پر پل بندھواؤں گا تاکہ پرلی طرف کے علاقے میں جانے کے لیے ہمیں طویل راستہ طے نہ کرنا پڑے اور اس کے ساتھ ہی آپ حویلی کے گرد جو زمین خالی ہے وہاں میووں کی درخت اور پھولوں کے تختے لگواؤں تاکہ حویلی کا حسن دوبالا ہو جائے۔“

”تمہاری سوچ بالکل منطقی ہے۔“ بہروز نے غور سے حارث کی پوری بات سن کر کہا۔ ”وہ بھی حویلی کے گرد وسیع و عریض چمن دیکھنا پسند کرتی ہے۔“

اس وقت حارث نے مناتہ کی طرف دیکھا جس کے عارض گلاب کے پھولوں کی طرح سرخ ہو رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کھانا کھا رہی تھی۔

دعوت کے اختتام پر رخصت ہوتے وقت حارث نے براہ راست مناتہ سے کہا۔ ”معموز خاتون! میں اس دعوت کے لیے سردار کا شکر گزار ہوں مگر اس اعلیٰ ذوق“ مسیختہ اور آراستگی کے لیے آپ کو داد دوں کہ اتنی کم عمری میں آپ بے شمار صفات کی مالک ہیں۔“

”توازش ہے۔“ مناتہ نے جواب کیا۔ ”تو حارث کو محسوس ہوا کہ فضاؤں میں گھنٹیاں سے بچ گئی ہیں۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سر کو قدرے خم دے کر سلام کیا تو بہروز نے کہا۔

”حارث اب تم جب تک یہاں ہو بلا تکلف حویلی میں آگئے ہو۔“

حارث نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور مہمان خانے کے اس حصے کی جانب روانہ ہو گیا جہاں وہ نماز پڑھتا تھا۔

تجارتی سفر سے واپسی اور اس دعوت کے بعد اس کی دنیا بدل گئی تھی، اب نہ وطن کی یاد تھی نہ رملہ خیال اور نہ واپسی کا تصور۔ بس ایک نکھر نکھار سا تصور تھا۔ وہ آنکلیں جو کئی بار اس کی جانب اٹھ کر کھڑا گئی تھیں، اس سے بنا کچھ کے ہی بہت کچھ کہہ گئی تھیں اور حارث ان ہی میں الجھ گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وادی سے لوٹ جانا اب اس کے اختیار سے باہر ہے۔

بہروز نے اجازت دے دی تھی مگر غوازش کے باوجود وہ حویلی میں قدم رکھنے کی ہمت نہ کر پاتا تھا بلکہ صبح شام حویلی کے گرد درختوں کی چھاؤں میں ٹھٹھا یا دریا کنارے جا کر لمبوں کا مترنم شور سنتا ہی رہتا۔ مناتہ کے تصور سے خود کو آزاد نہ کر سکتا۔ ایسی ہی ایک صبح ٹھنڈی فرحت بخش ہوا سے جب اس کی

مقام ہی تھی اور وادی کے اکثر لوگ محو استراحت تھے لیکن حارث اپنی عادت کے مطابق بہت سویرے ہی کھڑے ہو کر چل قدمی کے لیے نکل گیا تھا اور بڑی دیر تک دریا کے کنارے ٹھٹھنے کے بعد پلٹا تو کافی حد تک کی روشنی پھیل گئی تھی اگرچہ سورج طلوع نہ ہوا تھا مگر حرکتی روشنی ہرچیز کو منور کر رہی تھی۔ حارث آہستہ آہستہ ٹھٹھا ہوا حویلی کے عقب سے ہو کر مہمان خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے پہلی بار مناتہ کو دیکھا تھا! انھی سوچوں میں گم وہ چلا آ رہا تھا کہ ایک دم وہی چاندی جیسا نکھر ہوا نظر آیا جس کا تصور ہی اسے دنیا و دنیاویات سے بے خبر کر دیتا تھا۔ اسی کی جانب رخ کیے وہ کیا رہی سے ادا ہو کر تھک چکی تھی۔ شاید مناتہ بھی ہوا خوار کی لیے نکلی تھی۔ دونوں اپنا ایک دوسرے کو آنے اور دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ حارث کے لبوں سے نکلا۔ ”مناتہ!“ اور مناتہ یوں گھبرائی کہ دونوں ہاتھوں سے ہاتھ دھریں پر گر گئے۔ حارث نے اپنی سرست پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

ادب میں مناتہ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور نظریں چرائیں مگر ان نظروں میں گلے تھے اور شکوے بھی نہ تھے۔ حارث سے چھپے نہ رہے۔ غیر ارادی طور پر وہ آگے بڑھا، جھک کر تمام پھول اٹھا لے اور اپنے ہاتھوں سے انہیں زمین پر رکھ کر مناتہ کے سامنے یوں پیش کیے جیسے کسی دیوی کو نذرانہ دے رہا ہو۔ اس انداز پر مناتہ نے چہرے پر مسرت اور خوشی عود آئی مگر اس نے تبسم کو ضبط کرتے ہوئے بڑی شان سے نیازی سے

”محاف کیجئے ہم نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟“

حارث کا دل خوشی سے جھوم گیا۔ جھٹکے کا مطلب واضح تھا کہ مناتہ اس کے حویلی میں نہ آنے پر اس وقت انداز میں گلہ کر رہی ہے۔ چاہ بڑھانے والے اسے شکوے نے اسے حوصلہ عطا کیا لہذا وہ دایاں ہاتھ سے ہاتھ پر رکھ کر قدرے جھک کر ادب سے بولا۔

”امیر زادی! خاکسار کو عاشق کہتے ہیں جو دل کے ہاتھوں مجبورہ رخ روشن کا تصور لیے شب و روز حویلی کے آواہں کرتا ہے کیونکہ اس دولت کدے میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں، پھر اس میں سیکڑوں پہرے بھی تو آتے ہیں۔“

اعکاش مناتہ کے لیے نیا تو نہیں مگر مسرت بخش ضرور تھا۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ حارث کے اس انداز کی کھلکھلا کر دے مگر پھر اس نے شہزادیوں جیسی رعوت سے کہا۔

”کون گستاخ پہرے دار ہیں جو مابعد دولت تک مشاقان دیدار کو پہنچنے نہیں دیتے، نام بتایا جائے۔“

کے گرد فالتو زمین پر ایک طویل و عریض باغ لگوائے کا فیصلہ کیا جو کہ دراصل مٹاکہ کی تمنا تھی۔ مٹاکہ جو کہ اسے بہت عزیز تھی وہ اس کے لیے وادی کو جنت بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وقت کچھ اور گزرا پھر اس کے تیسرے بیٹے نے جنم لیا حبیب اور اس برس حارث نے ایک تجارتی قافلہ مختلف شہروں کو روانہ کر کے سال ختم ہونے سے قبل ہی بہت سی دولت کمائی۔ اب وہ ایک حسین اور زرخیز علاقے کا دو تین صد سالہ سردار تھا جس کے تین تندرست فرزند تھے اور ایک محبت کرنے والی خوبصورت بیوی۔

پھر..... وقت گزرتا رہا۔ اس کی مٹاکہ سے محبت بڑھتی گئی۔ محض فیصل اور حبیب تینوں بیٹے بڑے ہوتے گئے اور اس کے لگائے ہوئے بے شمار پودے جوان ہو کر تاور درخت بنتے گئے۔ دریا کے دونوں علاقوں کے لوگ ادھر سے ادھر آتے جاتے رہے۔ حارث کی تجارت بڑھتی رہی اور اس کی ہوشیاری اور دولت مندی کا سکھ دور دور بھٹا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے علاقے کی وسعت اور دولت مندی کی شہرت بھی بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ارد گرد کے تمام علاقوں کا سردار بن گیا جس کی حکمرانی کو سب تسلیم کرتے تھے۔ مٹاکہ اب اسے بھی اتنی ہی حسین نظر آتی تھی جتنی باپ اب اس کے انداز میں شادی کے بعد والی وہ شوخی نہ رہی تھی جس نے شادی کے بعد پندرہ برس تک حارث کو دیوانہ بنائے رکھا تھا بلکہ اب اس کے حسن میں وقار، شان و دبیدہ اور انداز میں سنجیدگی آگئی تھی۔ بیٹے جنیس حارث دیر اور بہادر شہ سوار بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا جنیں مٹاکہ کی مصروفیت اور حارث کی بیرونی دلچسپیاں ان لوگوں کی خوشگوار زندگی متاثر نہ کرتی تھیں۔ جب وہ بیرونی مصروفیات سے فارغ ہو کر گھر آتا تو ان کی محفلیں بڑی حسین ہوتیں اس کا بیٹا محض اب اس کے شانے تک آنے لگا تھا۔ اب وہ کھیل مٹاؤں کا انتظام اور تجارتی قافلہ کی تیاری میں بھرپور حصہ لیتا۔ باقی دینے بھی شہ سوار کی کے قابل ہو گئے تھے۔ شام کے وقت حویلی باہر والے طویل و عریض میدان میں کھیلوں کے مقابلے ہوتے تو حارث اور مٹاکہ انھیں بڑے فخر دیکھتے۔ حارث جوانی گزار کر اب کاویز عمر میں داخل ہو چکا تھا اس کا جسم قدرے فربہ اور کٹھنوں پر سفید ہو کر اسے بڑا باوقار بنا چکے تھے ایسے میں وہ اپنے بیٹیوں بیٹیوں کو مقابلہ جیتنے کے بعد پیار کرتا تو اسے مٹاکہ کی طرف دیکھ کر کہتا۔ ”مٹاکہ! تم نے ہمیں قابل فخر بنیے دیے ہیں۔“ تب مٹاکہ شرمناک رہ جاتی اس عمر میں بھی اس کی دلکشی و دلچسپی میں فرق نہ آیا تھا۔ حارث کی زندگی بڑی مطمئن اور پرسکون رہی تھی۔ وہ ماضی کو بالکل فراموش کر چکا تھا! اسے یاد بھی نہ تھا کہ کیس اور بھی اس کا ایک چھوٹا سا بھائی تھا۔ رملہ اس سے محبت کرنے والی بیوی اس کے بچے کی مال بننے والی تھی۔ وہ مزدوری کرتا اور پھل پکڑ کر گزارا کرتا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ کسے کے بڑے بڑے سرداروں کی صحبت میں بیٹھ کر فخری ہو

اور غریب ہو کر رہتا تھا اور ان کے ایمان پر کسے کے اس نئی ہو چکا تھا۔ مٹاکہ نے ایک نیا دین چیش کیا تھا اور اس سب سرداروں کی خوشنودی اور ان علاقوں کی ناموری حاصل کرنے کے لیے اسی نئی مٹاکہ اور اس کے نام والوں کو اذیتیں دیتا تھا۔ غرض یہ کہ ماضی کی ہر ہر یاد حال کی مسرتوں میں گم ہو چکی تھی۔ برسوں گزر گئے تھے اور ماضی کا ہر نقش و دھندلا گیا تھا۔ یاد اپنی کشش کھو چکی تھی۔ اب وہ صرف اس وادی کا سردار، ایک خوبصورت بیوی کا شوہر اور تین بہادر بیٹوں کا باپ تھا۔ وقت کا پیسا گردش میں تھا اور بارہ سال کا رملہ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ حارث اور مٹاکہ اپنے بیٹیوں کے ساتھ طعام خانے میں بیٹھے

اس موسم بڑا خوشگوار تھا۔ حارث اور مٹاکہ اپنے بیٹیوں کے ساتھ طعام خانے میں بیٹھے اس کا رملہ رہے تھے۔ یہ وہی کرا تھا جہاں حارث سردار بہروز کے مدعو کرنے پر پہلی بار حویلی میں آیا تھا تو اس حال بری طرح دھڑک رہا تھا اور مٹاکہ بری طرح شرابی تھی۔ اس دن اچانک نچائے کیا ہوا کہ حارث ایک دم سے ان بارہ سالوں کے واقعات نے گھیر لیا۔ بیٹھ بیٹھ ”ایسے میں اسے عہد رفتہ کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ یہ مٹاکہ کو آکر اسے گھیر لیتیں تھیں مگر آج اس کا دل چاہا کہ ہر بات دہرائے اور ہر واقعہ کہہ سنائے چنانچہ ان نے بڑی تفصیل سے پرانی باتیں چھیڑیں۔ اپنی بارہ سال قبل والی زندگی! اپنے دیرپا پر نہانے آنے کے آثار کو غوطہ لگانے اور ہجڑانہ طور پر یہاں پہنچ کر بالکل قرار دیے جانے، پھر بھٹوں اپنی بیوی اور

”مٹاکہ! جس شب میں اس حویلی میں مدعو تھا اس شب میں نے ماضی کے تمام دروازے اپنی ذات پر بند کر دیے تھے پھر تمہارے سوا نہ کچھ سوچا اور نہ کسی کو دیکھا اور آج بارہ سال ہو گئے ہیں اور اب تک یہی حال ہے۔“

”نکرتا مٹاکہ مسکرائی اور بولی۔ ”آج آپ نے کتنا وقت ان باتوں کی نذر کر دیا۔ کچھ خبر ہے! دیر ہو کر آئی ہے۔“

”نہ جانے کیوں آج ماضی یاد آ رہا ہے۔“ حارث نے ہنس کر کہا۔ اس وقت اس کے تینوں بیٹے اس کے سب سن رہے تھے۔ محض نے دریافت کیا۔

”ابا جان! پھر کبھی آپ اپنے وطن نہیں گئے؟“

”نہیں بیٹے۔ تمہاری اماں جان نے ہمیں ہوش میں آنے ہی نہیں دیا۔“

اب دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم تینوں آج کیا کرو گے؟“

”باباجان۔ ہم تینوں کو آج میلے کی تیاری میں حصہ لینا ہے۔“ معص نے کہا۔

”ہاں میلے میں تو اب صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یادگار میلہ ہو۔“ تینوں بیٹوں

نے گڑبڑ سے کہا۔ ”اب تو اب صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یادگار میلہ ہو۔“ تینوں بیٹوں

نے گڑبڑ سے کہا۔ ”اب تو اب صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یادگار میلہ ہو۔“ تینوں بیٹوں

نے گڑبڑ سے کہا۔

”آپ بھی تو بتائیں کہ آج آپ کیا کریں گے؟“

”ہم آج دریا پر غسل کریں گے۔“ حارث نے انگریزی لے کر کہا۔ ”مگر جانے سے قبل.....“

یہ ادھوری بات سن کر مناتہ بیٹی اور حارث نے اٹھ کر اس کو باڑوں میں لیا اور اس کو بوسہ دیا اور

دریا کی طرف چل دیا۔ یہ وہی تھا جہاں وہ بیکڑوں بار غسل کر چکا تھا۔ اس ٹھٹھے پانی میں وہ ٹھٹھوں

اور اور فرحت محسوس کرتا۔ اسی سکون اور فرحت کے لیے وہ آج غسل کرنا چاہتا تھا لہذا اس نے کپڑے

ار کر کنارے پر رکھے اور پانی میں غوطہ لگایا۔

مگر جو خبی غوطہ لگا کر سر باہر نکالا تو جیسے پتھر گرایا۔ نہ وہ وادی تھی نہ وہ تناور درخت نہ بلند حویلی نہ اس

نے گرد کشادہ چمن اور نہ دریا کا صاف ستھرا پانی بلکہ بارہ سال قبل کا وہ کنارہ تھا جہاں حارث نے اپنے

بڑے ازار کر رکھے تھے۔ اس نے دیکھا کہ وہی بارہ سال پہلے کا لباس کنارے پر رکھا ہوا تھا۔ اس وقت

وہ آگین بجھاؤ کے جرائی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دریا سے کچھ فاصلے پر اس کا وہ گھر تھا جہاں وہ برسوں

قبل رہا۔ وہ کچھل پکانے کے لیے دے کر گیا تھا۔ وہ وحوش سے انداز میں ان راہوں کو دیکھ رہا تھا جن میں

کئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ جب دیکھ کر اسے کچھ اندازہ نہ ہوا تو وہ دریا سے نکل آیا۔ اس نے ہاتھ بوسا کر

دریا میں نہلنے کے لیے کپڑے اتھا کر اپنے اوپر اس کا رخ غیر ادنی طور پر گھم کر گیا تھا۔ وہ سوچ رہا

تھا کہ یہاں کے باشندے برسوں بعد اسے دیکھ کر تعجب کا اظہار کریں گے۔ خیر عایت پوچھیں گے مگر شبہ

کی ہند رگاہ سے گھر تک ہر شخص اس کا شناسا ملا مگر کسی نے تعجب کا اظہار نہیں کیا بلکہ یوں دیکھا جیسے وہ

وہی دیر قلم ہی ان میں سے گزر کر گیا تھا پھر حارث نے سوچا شاید وہ بڑھی ہو گئی ہو۔ اسے بچکانہ

کہ اور اس کا بچہ اب بارہ سال کا ہو گا۔ وہ رہا کہ ان بیٹے برسوں کے بارے میں کیا بتائے گا۔ یہ سوچتے

ہوئے وہ تیز تیز قدم چلتے لگا۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب وہ گھر سے نکلنے کی لیے روانہ ہوا تھا۔ دیواروں

وہ دھوپ سرک رہی تھی۔ وہ چونک گیا بارہ سال قبل اس کے گھر کے عین سامنے جو چڑیا مری پڑی تھی

”افو! مناتہ بیٹی۔“ مجھے اتنا بڑا الزام نہ دیں۔ یاد کریں میں نے کتنی بار آپ کو مجبور کیا کہ اپنے وطن ہو آئیے۔ شاید ان بارہ برسوں میں میں دھند میں نے خود اپنے ہاتھوں آپ کی تیاری کی کہ ایک بار اپنی بیوی بچے کی خبر لے آئیے آپ راضی نہ ہوئے۔“

”مجھے سب یاد ہے۔“ حارث نے محبت سے مناتہ کو دیکھا۔ ”مگر نبھانے کیا بات تھی کہ تم سے جدا کی مجھے ناقابل برداشت نظر آئی تھی۔ لگتا تھا تم سے بچھڑ کر زندہ نہ رہ سکوں گا۔“

”باباجان! فیللے نے ایک دم پوچھا۔ ”کیا بچپن میں آپ بھی شواری کرتے تھے؟“

”ہاں بیٹے! ہم نے فن شواری میں بڑی مہارت حاصل کی تھی۔“

”باباجان۔“ معص نے پوچھا۔ ”آپ کے وطن کے لوگ یہاں کیوں نہیں آتے؟“

”بیٹے! حارث نے گہرا سانس لیا۔ ”اول تو ہمارے ہم وطنوں کو علم ہی نہ ہوا ہو گا کہ ہم کہاں ہیں۔“

دوسرے اس وقت یہ جزیرہ بڑا ویران اور دور افتادہ تھا جسے ہمارے نانا جان نے آباد کیا تھا اور ہم نے اسے

ہمارے جزیرے کے گرد اس قسم کے صحرا ہیں کہ سفر کرنا آسان نہیں ہے اس لیے اب تک ہمارا وطن

سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔“ باپ بیٹے کو حفاقت گھوڑے اور مناتہ خاموشی سے سن رہی تھی، حسیب نے پوچھا۔

”باباجان! کیا یہ دریا سیدھا آپ کے وطن کی طرف جاتا ہے؟“ اس سوال پر حارث پریشان سا ہو گیا

پھر کھوکھے کھوکھے سے انداز میں بولا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہماری معلومات کے مطابق تو ہمارے وطن سے یہاں تک اس دریا میں

یکڑوں موڑ ہیں۔ درمیان میں بیسیوں بڑی بڑی چٹانیں ہیں جو بڑی بڑی کشتیوں کو پاش پاش کر دیتی ہیں

اور پھر اس دریا میں ہزاروں قسم کے ملک جانور پائے جاتے ہیں کہ کوئی انسان اسے عبور کرنے کا حوصلہ

نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر آپ وہاں سے یہاں تک تیرتے ہوئے کیسے آگئے؟“

”یہی جرائی تو ہمیں ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یقیناً کہ آج ہمیں اس وادی میں آئے ہوئے پورے بار

سال ہو گئے ہیں مگر کوئی دن ایسا نہ گزرا کہ ہم نے یہ جرائی محسوس نہ کی ہو کہ آخر صرف ایک غوطہ لگا

ہم یہاں تک کیسے آگئے۔“ اس وقت سب ہی تعجب اور خاموش تھے۔ چند منٹ سکوت کی نذر ہو گئے

پھر مناتہ نے کہا۔

”آج کیا تمام دن انھی یادوں میں گزارنا چاہتے ہو؟“ تب حارث چونک گیا اس نے اپنے بیٹوں

وہ اب بھی مری پڑی تھی۔ حارث نے حیران ہو کر دیکھا اور بے دھڑک اپنے گھر میں گھس گیا جہاں رملہ وہی تکیے کپڑے پہنے چرخہ کات رہی تھی اور پھلی اس کے نزدیک پڑی تھی۔ حارث نے یہ منظر دیکھ کر انہوں کی طرح دیکھا۔ ہر چیز اسی حالت میں تھی جس حالت میں وہ چھوڑ کر گیا تھا مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ کتا رملہ نے کہا۔

”ارے۔ تم نماکراتی جلدی لوٹ آئے۔ میں نے تو ابھی اپنا تار بھی مکمل نہیں کیا۔“
”اتنی جلدی“ پاگلوں کی طرح وحشت سے کہا۔

”ہاں! آج ہمیشہ سے زیادہ جلدی لوٹ آئے ہو۔ دیکھو پھلی بھی ابھی زندہ ہے۔“
اب حارث نے حواس باختہ سا ہو کر اپنا سر پکڑ لیا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”مگر میں تو اس وادی میں بارہ برس گزار کر آیا ہوں اور وہاں وہی وقت ہے۔“
”کس وادی میں؟“ رملہ نے چرخہ پرے کرتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں میرے تین خوبصورت بیٹے ہیں اور میں وہاں کا سردار ہوں۔“

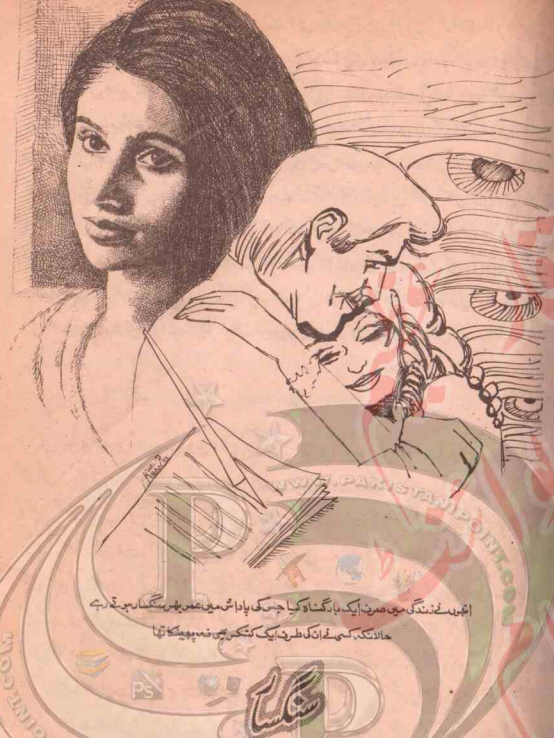
اب رملہ پریشان ہو گئی اس نے دکھ سے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی تو نہ مانے گئے تھے۔ اب ایسی باتیں کیوں کرنے لگے لوگ کہیں گے کہ دیوانے ہو گئے ہو بھلا کیا یہ ممکن ہے کہ ایک جگہ وقت تھما رہے اور دوسری جگہ تم بارہ سال گزار آؤ؟“

یہ جملہ تھا، ایک تلخ تھی جس نے حارث کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے واقعی پاگلوں کی طرح رملہ کو دیکھا شاید اسے اپنے الفاظ یاد آگئے تھے جو آنحضرتؐ کو بھٹلانے کے لیے کہے تھے، پھر وہ ایک دم سے رو دیا۔ آج اسے نبوت کا یقین اور واقعہ معراج پر اعتبار آ گیا تھا۔

گلی بازاروں میں لوگ ٹھٹھول کر رہے تھے۔ واقعہ معراج اور اسلام کا مذاق اڑا رہے تھے ایسے میں حارث اپنا جیتا ہوا گھوڑا دوڑاتے ہوئے برق رفتاری سے سفر کر رہا تھا۔ لوگوں نے اسے دیکھا اور بولے۔
”یہ حارث اب کہاں جا رہا ہے آج ہی تو وہ مسلمانوں کے نبیؐ کو بھٹلا کر کے سے گھوڑا جیت کر لایا ہے۔“

مگر اس نے کسی کی طرف توجہ نہ دی اور گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا گیا اس وقت دیکھنے والے حیران تھے اور کسی کو علم نہ تھا کہ چند لمحوں کے اندر اندر کیا ہو گیا۔ اسلام کا یہ بدترین دشمن واقعہ معراج کو بھٹلانے والا آہستہ آہستہ زیر لب گواہی دے رہا تھا۔
”لا اللہ اللہ محمد رسول اللہ“

✱



انہوں نے زندگی میں صرف ایک بار نگاہ کیا جس کی یاد اس میں ہمیشہ تنگنا رہے
حالانکہ کسی نے ان کی طرف ایک کشش نہیں نہ پہنچا تھا

سنگ

رات کا پہلا پہر ہے، چودھویں کا چاند اپنی پوری رعنائی اور تاباں کے ساتھ اُتر پر تلے ہو چکا ہے
ایک خوب صورت اور باوقار عمارت کے ارد گرد رو تک پہنچے ہوئے سبز دار و درخت کی فضا میں عجیب
ی یمنی یعنی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ ایسے میں قیمتی لباس میں لباس ایک بیس ایکس سالہ نوجوان اپنی ہی

طرح حسین سچوں میں گم 'یاغ' میں جو خرام ہے 'اس کے موٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں عجیب سی چمک ہے۔ کبھی وہ درختوں کے اوپر ابھرتے ہوئے چاند کو دیکھتا ہے اور کبھی دودھیا چاندنی میں نہائی ہوئی اس سفید عمارت کو جو خاموش اور سر بلند کھڑی اپنے مالک کے ذوق جمال اور عظمت کی گواہی دے رہی ہے۔ یہ نوجوان امیر عزیز کا اکلوتا فرزند ایشین ہے جو صرف چند روز قبل اس گھر میں مہمان آیا ہے اور جس کے خیالوں پر اس وقت صرف ایک ہمتی چھائی ہوئی ہے، وہ ہے اس گھر کے مالک امیر عاصم کی اکلوتی بیٹی ماروہ، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ تمام مصر میں اس جیسی حسین لڑکی کوئی اور نہیں ہے۔ ایشین نے اسے چند برس قبل دیکھا تھا تو وہ ایک کم سن 'مہصوم' اور غیر معمولی طور پر خوب صورت لڑکی تھی، تب سے اب تک وہ اسے بھلا نہ سکا تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ بچپن کی وہ پسندیدگی اب جنوں کی حد تک محبت کا روپ دھار چکی تھی۔ امیر عزیز اور امیر عاصم کی رشتے داری کم اور دوستی زیادہ تھی، لڑکپن سے جوانی اور اب امیر عزیز تک ان دونوں نے ہر اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔



یہ وہ زمانہ تھا جب عباسی خلافت آخری سانس لے رہی تھی۔ سامی اور اخلاقی برائیوں نے خلافت کو کھوکھلا کر دیا تھا اور مسلمانوں کے اعمال و افعال میں وہ چمک دھک اور شان باقی نہ رہی تھی جس نے انھیں ماضی قریب میں ایک امتیازی حیثیت عطا کی تھی۔ دولت کا استعمال وہی قوم صحیح جانتی ہے جو صاحب علم ہو، خلافت راشدہ کے زمانے میں قیصر کو سرنی کے تمام خزانے خلفا کے قدموں میں آگئے تھے مگر وہ ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکے تھے کیونکہ وہ زمین پر خدا کے نائب تھے، نہ ان کی زندگی سے سادگی ملتی تھی، اور نہ مزاج سے انکساری اور انھوں نے دولت کو ہمیشہ پائے تجارت سے ٹھکرایا تھا لیکن اب وہ زمانہ تھا جب دولت عیش و عشرت کا ذریعہ بن گئی تھی۔ عباسی خلیفہ خود بھی عیش کرتے اور دوسروں کو بھی کرنے کی اجازت دیتے، ہر چند کہ عباسی خلفا کی سخاوت مشہور ہے، مگر یہ سخاوت صدق اکبر والی نہ تھی، یہ عظمت فاروق اعظم والی نہ تھی، وہ غنی تھے، صاحب علم تھے مگر مہمان غنی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرح نہیں بلکہ ان کی دولت، ان کی عظمت، ان کی سخاوت اور ان کا علم دنیا وار حکمرانوں جیسا تھا، ان کے حرم کی تعداد سیکڑوں تک جا پہنچی تھی۔ شراب اور رقص و سرود کی محفلیں روز کا معمول تھیں۔ عورت اور مرد کے درمیان والی مخلوق یعنی خواجه سراؤں کی فوج محلوں میں عام نظر آتی، بھائی

الزائر کے لیے اپنے ہی بھائی کا گھانا کھانا کھا کر تیار رہتا اور حانہ جنگلی میں مصروف مسند خلافت کی جانشینی کے امیدوار اپنیوں کو بچتا دکھانے کے لیے غیروں کا سہارا لینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ عیش پرستی اور سیاسی سازشوں نے حکومت کے وقار کو خاک میں ملا دیا۔

یہ نہیں کہ بسعی خلیفہ اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ابتدا میں انھوں نے بڑے جوش کا مظاہرہ کیا، اتنا کہ مسلمان عباسی حکومت کو دل و جان سے چاہنے لگے تھے، انھوں نے حکومت کے وقار کو بلند کیا اور ابتدا کے چند عباسی خلفا کے کارنامے تو اس درجہ عظیم الشان تھے کہ دنیا بھر میں ان کے نام کا ڈنکا بجتے لگا تھا۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے مالک بھی تھے اور عظیم سیاستدان بھی، علم و دست بھی تھے اور دلیر سپاہی بھی، لیکن پھر حالات بدلنے لگے اور وہی عیش جو برا سمجھ کر کیا جاتا، وہی محفلیں جو لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کجائی جانتیں، اب عام ہونے لگیں۔ پھر قوت گزر آیا، ایک کے بعد دوسرا نا اہل خلیفہ آتا گیا اور عیش کو کوشی کی نئی روایات قائم کر لیا۔ پھر فاتح کے پردے میں مفتوح حکومت کرنے لگے، برہمی وزیروں کا اقتدار، آل بویہ اور پھر ترکوں کا غلبہ اس انقلاب کی روشن مثالیں ہیں، غرضیکہ عباسی حکومت ختم ہوتے ہوئے برائے نام رہ گئی۔ اس وقت جب کہ عباسی خاندان کے آخری خلفا ترکوں کے ہاتھوں میں کھلواتے ہوئے تھے، اور ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا، ایسے میں ہر صوبے کا رنگ عجیب تھا۔ صوبیدار اپنی من مانی کرنے لگے اور دور دراز علاقوں کے جو صوبے کی کئی ہاکیروں میں بے ہوئے تھے ان کے حاکم خود کو صوبیدار اور سلطنت کے اختیار سے باہر تصور کرنے لگے۔ دار السلطنت سے قریبی صوبوں کا حال بھی چنداں مختلف نہ تھا۔ ان صوبوں میں خوزنر جنگیں ہوتی تھیں اور آبادیاں اجاڑ دی جاتیں، غرض یہ کہ خلیفہ کی ساری قلمرو میں بد نظمی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ مصر میں دریائے نیل کے پرے کا ایک وسیع علاقہ کسی زمانے میں فوجی افسروں کو دیا گیا تھا۔ یہاں کی روشن بڑی زرخیز قصبے، یہ جگہ تیزی سے آباد ہوتی گئی اور اب مدنتوں سے یہ صوبہ جو دو جاکیروں پر مشتمل تھا، امیر عزیز اور امیر عاصم کی تحویل میں تھا۔ شاید ابتدا میں انھوں نے خود کو باج گزار جانا ہو، مگر اب جب کہ انھوں نے اپنے اپنے حصے میں باتت لگائے تھے، مکانات تعمیر کئے تھے، اپنے رہنے کے لیے خوب صورت قصر تعمیر کرائے تھے اور اب جاگیرداروں کی طرح نہیں، سلطنت کے امیروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے پھر چند ماہ قبل امیر عزیز نے ایک منصوبہ یہ بنایا کہ وہ اور امیر عاصم اپنی جاکیروں کو متحد کر کے خود کو مضبوط بنالیں، اس وقت امیر عاصم نے کہا تھا۔

”دوست ترکیب تو خوب ہے مگر یہ ممکن ہے؟“

تب امیر عزیز نے ملکی حالات پر تبصرو کرتے ہوئے امیر عاصم اور خود کو غیر محفوظ قرار دیا اور کہا۔

”امیر عاصم! میرا بیٹا اقسین جوان ہے، اس علاقے کی امارت میرے بعد اسی کو ملے گی اور تمہارے علاقے کی مالک یقیناً ماروہ ہوگی، تو کیوں نہ اقسین اور ماروہ کی شادی کر دی جائے!“

امیر عاصم اچھل پڑا اور یوں اس بھڑائی دور میں جب کہ ہر غلیظہ نائل تھا وہ خود کو مضبوط کر کے اقسین کی حکومت کے خواب دیکھنے لگے۔ اقسین ایک خوب صورت صاحب علم اور دلیر جوان تھا، اسے اپنا داماد بنانے پر امیر عاصم کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ادھر ماروہ مصر کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ اس لیے امیر عزیز اور اقسین کو بھی اس سوچے میں فائدہ ہی فائدہ نظر آ رہا تھا۔ اگر اقسین خلافت حاصل نہ کر سکتا تو بھی دونوں جاگیروں کے اتحاد سے ایک بڑا صوبہ بن رہا تھا اور اس وقت صوبیداروں کی شان بھی امیروں سے کم نہ تھی۔

آج اقسین اسی شادی کا پیغام لے کر غلاموں کے دستے اور قیمتی تحائف کے ساتھ امیر عاصم کے علاقے میں آیا تھا۔ تمام دن اس نے بڑی بے چینی سے گزارا تھا، اس وقت اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح ماروہ کا دیدار کرے۔ اس نے چند برس قبل ایک بارہ سالہ لڑکی کو دیکھا تھا جو واقعی حسین تھی۔ اقسین کو یقین تھا کہ مولہ برس کی عمر میں وہ واقعی قیامت بن چکی ہوگی۔ بالآخر اس کی تمام دن کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ ماروہ نے اندھیرا ہونے کے بعد باغ میں آکر اس سے ملاقات کا وعدہ کر لیا تھا۔ باغ کا یہ حصہ صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا، یہاں قدم رکھنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ بس شام کے وقت ماروہ اپنی بھویوں کے ساتھ یہاں آتی، چھل قدمی کرتی، چھلپ چھلپ کرتی اور شب ہونے سے قبل لوٹ جاتی، امیر عاصم نے اپنی اس حسین بیٹی کی مکمل حفاظت کی تھی۔ اقسین کو یہ سب علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کے دیدار کی خواہش اب اضطراب کا روپ دھار چکی تھی۔

اقسین انتظار کی ان صبر آزمائیوں میں ٹپٹپٹے ٹپٹے اچانک ایک موڑ پر ٹھک گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ چودھویں کا چاند آسمان سے اتر کر باغ کے اس گوشے میں آ گیا ہے! ماروہ اتنی آہستہ خرامی سے آئی تھی کہ اقسین کو علم بھی نہ ہوا مگر اسے سامنے دیکھ کر نہ جانے رعب حسن سے یا تعجب سے اس کے قدم ساکت ہو گئے۔ ماروہ واقعی حسن کی ملکہ تھی!

اقسین نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”ماروہ بہت عاصم؟“

”جی“ ماروہ نے کہا۔ ”آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر آئی ہوں۔ مگر۔۔۔“

”مگر کیا؟“ اقسین نے قدرے جھک کر اس کو بغور دیکھا۔

”ملاقات کا یہ انداز کچھ نا پسندیدہ ہے۔“ ماروہ نے جواب دیا۔

اقسین کو محسوس ہوا کہ فضا میں گھنٹیاں بج چکی ہیں۔ اس نے اپنی حیثیت اور ماروہ پر اپنا حق جتانے کے لیے آہستہ سے اس کی ٹھوڑی کو اچھا کیا، اس بے تکلفی اور دلانہ پن سے ماروہ گھبرا گئی، ہر چند کہ وہ اعلانیہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے تھے اور ماروہ اسے جانتی بھی تھی مگر اس وقت یہ انداز اسے پریشان کر گیا تھا، اس نے کہا۔

”کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”ماروہ۔۔۔“ اقسین نے محبت سے کہا۔ ”چاند کو چاندنی میں دیکھ رہا ہوں۔“

اب ماروہ کچھ اور گھبرا گئی اور بولی۔ ”آپ نے کیوں بلایا تھا مجھے؟“

اقسین نے اس سرگوشی کا کوئی جواب نہ دیا، اسے محسوس ہوا کہ یہ حسین وقت باتوں کا نہیں ہے۔ پولوں کی کمک نے پورے باغ میں نفس سٹا رہی کر دیا تھا، آسمان ٹکڑے صاف تھا اور ایسے میں ماروہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے کنوڑوں میں لیے جذباتی سا، مصور سا، اقسین اسے مسلسل دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کے اندر ایک قیامت برپا تھی۔ ماروہ کا چہرہ چاند کی طرح تابناک تھا، سیاہ گھٹاؤں کی طرح نظر آرہے تھے اور اس کی آنکھوں میں اقسین کے لیے محبت اور پسندیدگی کے باوجود ایک خوف تھا جس کے باعث اقسین کو یہ سہمی ہوئی لڑکی کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہی تھی۔ وہ سہمی اس کی روشن پیشانی کو دیکھ کر کہتا کہ اس کا نور چلے، سہمی اس کی گہری آنکھوں سے ڈوب کر چمکتا کہ ان متحرک پلکوں کو اپنے ہاندار لیوں سے محسوس کرے اور کبھی چمکی ہوئی پلکوں کی مانند ان جدا جدا چمکرمیوں کو دیکھتا جن سے اپنے والی مدد ہم سائیں اسے بے خود کیے دے رہی تھیں۔ آخر وقت اور ہم نشیں کے حسن نے اسے از خود رفتہ کر دیا اور اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ کیا کرنے والا ہے، مگر خوشی وہ آہستہ سے جھکا ماروہ ٹپ کر الگ ہو گئی، اس نے کچھ پر ہم کچھ محسوس ہوا جانے والے انداز میں اقسین کو دیکھا اور اپنے ہاتھ کی پشت لیوں پر رکھتے ہوئے خوفزدہ سی ہو کر بولی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں ماروہ۔“ اقسین نے اس کے پورے وجود کو اپنے بازوؤں میں کس لیا۔ ”میں اپنا حق لے رہا ہوں۔“

”مگر مگر ابھی۔۔۔“ ماروہ خود بخود جھپٹ گئی۔

”ہاں“ ائین نے اس کے گرد اپنی گرفت خست کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میری ہی ہونا، آؤ اور
اطمینان سے بیٹھے ہیں۔“ ماروہ کے نازک سے پیکر کو، اس نے آغوش میں اس طرح بھر لیا تھا کہ اب وہ
اس کے سینے سے لگی، تیز تیز سانس لے رہی تھی، اس حرکت میں خوف کم اور لذت کا احساس زیادہ تھا
اور سردی کے اس انداز نے ائین کو کچھ اور بے خود کر دیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ تپ رہا ہے، جھل
رہا ہے اور اب ان دونوں کے تپے ہوئے جسموں کو گھاس سے ڈھکی ہوئی ٹھنڈی زین کی فرحت ہی سکون
دے سکتی ہے۔ وہ فوراً نے دو سری جانب نکل گئے، جہاں چاند بادلوں کی اوٹ سے بڑا حسین نظر آ رہا تھا
اور دور دریائے نیل کا پانی بلندیوں سے پستی کی طرف گرتے ہوئے بڑا حترم شور پیدا کر رہا تھا۔ ائین کو
علم تھا کہ یہ شور بڑا ہیبت ناک ہوتا ہے، جن چٹانوں سے ٹکرا کر یہ پانی گرتا ہے اس کے عقب سے
گزرنے کی ہمت کوئی تنہا شخص نہیں کر سکتا، مگر اس وقت دور سے آنے والی بے آواز بھی ایک انوکھا جاو
جگا رہی تھی۔ ماروہ ائین کی باتوں کے سارے یہاں تک آئی تھی، مگر تھک سی گئی تھی۔ ائین نے
اسے پیار سے دیکھا اور آہستہ سے گھاس پر لٹاتے ہوئے بولا۔

”ماروہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ تم آئی حسین ہو۔“

یہ سرگوشی اور ائین کا قرب، ماروہ کو دلوانے کیے دے رہا تھا۔ جسموں کے لمس نے جیسے دونوں کو ہوش
و خرد سے بے گانہ کر دیا تھا، پھر وہ دونوں جذبات کی لہروں میں بہتے گئے، ایک طوفان نے انھیں گھیر لیا تھا مگر وہ
پچھتاہیں، اس میں ڈوب جانا چاہتے تھے، سو وہ ڈوب گئے۔

اور۔۔۔!

جب انھیں ہوش آیا تو چاند بادلوں کی اوٹ میں اپنا سر دور تک طے کر چکا تھا۔ دریائے نیل کا حترم
شور اب سماعت پر گراں گزر رہا تھا۔ اس لمحے ماروہ بے باکی سے روئی۔

”ائین! میں سب کیا ہو گیا؟“ اس نے سکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں جان۔“ ائین نے خفت کے انداز میں کہا۔ ”جو کچھ چند ماہ بعد ہونا تھا وہ ابھی ہو گیا۔“

”مگر ہماری شادی؟“

”تم گھبراؤ نہیں۔“ ائین نے اسے تسلی دی۔ ”میں شادی طے کر کے ہی جاؤں گا۔“

ماروہ صبح کی روشنی پھیلنے سے قبل تقریر کی عمارت میں لوٹ گئی اور ائین اسی خاص مہمان خانے کی
طرف چلا گیا جہاں اسے بڑی شان سے ٹھہرایا گیا تھا۔

یہ سفر بڑا کامیاب تھا۔ امیر عاصم نے اپنی دختر کو ائین کے ساتھ منسوب کرنے کا اعلان کر کے پورے

سال بعد شادی کی تاریخ طے کر دی تھی، اس خوشی میں شاندار جشن منایا گیا اور دونوں قیام کے بعد
ان اپنے باپ کی جاگیر میں لوٹ گیا۔

ائین کی نیت میں کوئی ٹھوٹ نہ تھی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ماروہ سے محبت کرتا تھا، اس کے وصال
ائین کے آتش شوق کو کچھ اور بھڑکا دیتا تھا۔ وہ جلد سے جلد شادی کا خواہشمند تھا، مگر امیر عزیز اور
اس کے درمیان طے ہو چکا تھا کہ یہ شادی ایک برس بعد ہوگی، بارہ ماہ بعد۔ ائین کے لیے یہ وقت
بڑا ناگوار تھا۔ شہر لانے کے حرافہ تھا مگر وہ مجبور تھا۔ لمحے رینگتے رہے، وقت دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں
گزر رہا تھا۔ یہاں تک کہ تین ماہ کا عرصہ گزر گیا، اس دوران ائین کو ماروہ کے قرب کے لمحے بار بار
آتے۔ یہ یاد اسے پشیمان بھی کر دیتی تھی، اور بے قرار بھی۔ ایسے میں اس کی صرف ایک ہی خواہش
تھی کہ باقی وقت بھی جلد سے جلد گزر جائے۔ اس تمام عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی ماروہ کے
اور سے غافل نہ رہا۔

ایک روز۔!

صبح کا وقت تھا، سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا مگر آسمان پر پھیل جانے والی سفیدی یقین دلا رہی تھی کہ
صبح آ رہی ہے۔ ائین حسب عادت صبح سویرے بیدار ہو کر اپنے قہر کے باغ میں عمو خرام تھا۔
ان کے بچوں اور گلوں پر جینم کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے اور دور تک سبزہ زار کی
انہوں میں نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑیاں بھیر دی ہوں۔ باغ کے اطراف میں
پھولی پھولی نائیاں تھیں، جن سے مختلف سمتوں میں پانی پینچ رہا تھا، پھولوں کے تختے دور تک نظر آ رہے
تھے۔ غرض کہ یہاں کا گوشہ گوشہ قدرت کی کارگیری کی گواہی دے رہا تھا۔ ائین اپنے خیالات میں مگن
تھا کہ ایک دم قدموں کی چاپ نے اسے جھٹکا دیا۔ اس نے دیکھا، چند گز کے فاصلے پر اس کا خاص خادم
ان کی دست بستہ کھڑا تھا۔ ائین کو معلوم تھا کہ صفوان کسی خاص وجہ کے بغیر یہ وقت حاضر ہونے کی
حاجت نہیں کر سکتا، اس نے پوچھا۔

”صفوان کیا بات ہے۔ تم اس وقت؟“

”آپ کوئی شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ رات قہر کے دروازے بند ہونے کے بعد وہ یہاں
آگیا، اس لیے اسے حاضر ہونے کی اجازت نہ مل سکی، مگر ہر صورت آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ اور ہم سے ملاقات پر کیوں مصر ہے؟“ ائین نے دریافت کیا۔

وہ کہتا ہے کہ امیر عاصم کے علاقے کا آدمی ہے اور قہر کی ایک کنیر اس کے ساتھ ہے، وہ دراصل اسی

کثیر کے لیے باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔" اٹھن مزید حیران ہوا۔ امیر عاصم کے قہری کتبی کی آہ
معتی تھے کہ ماروئے کوئی پیغام بھیجا ہے، یہ تصور برا مسرور کن تھا، اس نے بے اختیار کہا۔
"اٹھن فوراً یہاں لے آؤ۔"

صفوان پلٹ گیا اور چند لمحے بعد ایک شخص کے ہمراہ واپس آیا۔ یہ اٹھن تھا، جسے اٹھن نے امیر
عاصم کے قہریوں دیکھا تھا۔ اٹھن آیا، جنگ کر سلام کیا اور بولا۔
"عالی جاہ! غلام تمہاری میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

اٹھن نے صفوان کی طرف دیکھا، وہ اشارہ پا کر وہاں سے چلا گیا۔ پھر جب تھائی ہوئی تو اٹھن
کہا۔ "عالی جاہ! یہ خادم پوشیدہ طور پر امیر زادی کے حکم پر آیا ہے۔ غلام کے ہمراہ میری ماں ہے جو امیر
امیر میں امیر زادی کی خاص خدمت گار کا فرض برسوں سے ادا کر رہی ہے۔ اس کا نام نائلہ ہے۔"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ اور تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟" اٹھن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے
تائی کے کہا۔

"آقا! کچھ نہیں کہنا چاہتا، آقا زادی نے مجھے صرف یہ حکم دیا ہے کہ میں آپ تک ان کی لودھی
پہنچا دوں۔ وہی آپ کو آقا زادی کا پیغام دے سکتی ہے۔"
اٹھن اپنی باغ والی نشست گاہ کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "تم امیر زادی کی پیغام لودھی کو لے کر
فوری یہاں آؤ۔"

یہ سنتے ہوئے اٹھن پلٹ گیا اور اٹھن اس بارہ دوری میں آیا جہاں رقص و سرود کی محفلیں جھاکا
تھیں اور جہاں وہ تھائی اور سکون کے لیے آرام کیا کرتا تھا۔ قہوڑی دیر بعد اٹھن اپنی ماں نائلہ کو لے کر
حاضر خدمت ہوا۔ یہ ضعیف العمر عورت، اردو کی خاص ملازمہ تھی، اٹھن کے رویہ پر کراس
تھائی طلب کی اور جب اٹھن چلا گیا تو بولی۔

"عالی جاہ! میں امیر زادی کی وہ لودھی ہوں جس نے انھیں پرورش کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں، امیر
زادی کی ماں انھیں کم سن چھوڑ کر ہی وفات پا گئی تھیں، تب وہ چند برس کی تھیں، جب سے اب تک
ان کی خادمہ بھی ہوں اور رکھوالی بھی۔ آج انھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور یہ خط
ہے۔"

اٹھن نے بے تاب ہو کر ماروہ کا خط نائلہ کے ہاتھ سے لے لیا، مگر یہ خط عجیب تھا، نہ اظہار محبت
لے کی بے تابی، نہ محبت کی طلب، بس دو سطریں درج تھیں۔

"اٹھن! میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں، مجھے اس رسوائی سے نجات دلاؤ، جو تمہاری
ولادت آنے والی ہے۔ ایک کنواری امیر زادی کا ماں بننا سب سے بڑی ذلت ہے۔ مجھے بتاؤ، میں کیا
کوں؟ اس راز میں نائلہ شریک ہے، تم اس سے ہر قسم کی بات کر سکتے ہو۔"

اٹھن کو محسوس ہوا کہ زمین و آسمان گھوم گئے ہیں، اسے آج پہلی بار علم ہوا کہ انسان کو غلطی کا
لہذا ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ دانستہ کرے یا نادانستہ۔ بہت دیر تک وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہا
اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "نائلہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سب راز رہے۔"

"آقا! یہ ابھی تک راز ہے اور آئندہ بھی راز رہ سکتا ہے مگر وہ وقت۔۔۔۔۔"
"ہم اسی وقت کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔" اٹھن نے شرمندگی اور پریشانی کے انداز میں کہا۔
اس بات کو راز رکھنے کے لیے امیر زادی بچے کو ضائع کرنے پر راضی نہیں کیو نکہ طبیب کی مرضی اور
الطاف کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اور دوسری صورت آپ جانتے ہیں۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ولادت کا زمانہ جب قریب آئے تو امیر زادی کو قہر سے کیس لے جایا جائے
اور بچے کو ضائع کر کے یا کسی کو دے کر وہ قہریوں واپس آجائے۔ ظاہر ہے وہ ہماری ہیں، ہماری نظروں
میں نہیں گر سکتیں، مگر مقصد صرف یہ ہے کہ کسی کو اس کا ظلم نہ ہو۔"

نائلہ بڑی دیر باتیں کرتی رہی، پھر اس نے کہا۔ "آقا! فحشی علاقے میں غریبوں کی ایک ہستی ہے، جہاں
کی ماں زمین پر امیر عاصم نے باغیانی کا حکم دیا ہے۔ اس کے قریب میرے کچھ رشتے دار رہتے ہیں، امیر اگر
لار ہو جائیں تو میں امیر زادی کو بچھان کے لیے وہاں لے جاتی ہوں۔"

اٹھن چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "نائلہ! یہ ٹھیک ہے، تم واپس جا کر امیر زادی کو مطمئن کر دو۔ ہم چند ہفتے
بعد امیر عاصم کو اس زمین پر باغ لگانے کی مبارکباد دیں گے اس کے ساتھ ہی اجازت لیں گے کہ ہمارے
مال کی خواتین وہاں کی سیر کرنا چاہتی ہیں۔ وہ یقیناً اس کی اجازت دے دیں گے، پھر جب تک باغیانی کا
لام مکمل ہو گا تب تک بچے کی ولادت کا وقت قریب آجائے گا۔ ان دنوں امیر زادی اس علاقے کی سیر
کے لیے ضد کریں، تب امیر عاصم انھیں روک نہ سکیں گے اور یقیناً تم ان کے ہمراہ وہاں جاؤ گی۔"

اس طرح مختصر وقت میں بڑا طویل پروگرام بن گیا۔ پھر وقت گزرتا رہا ماروہ نے اس غلطی کو راز رکھنے
کے لیے گویا قیامت کا سامنا کیا تھا، اس نے گوشہ نشینی اختیار کی جہاں اسے دنیا بھر کی خبریں ملتی رہیں۔
اس نے سنا کہ امیر عاصم کے اس علاقے کو دیکھنے کے لیے امیر عزیز کی جاکیر کی معزز خواتین گئیں جنہوں
نے اسے پسند کیا۔ پھر اٹھن نے امیر عاصم کو مبارکباد کا پیغام دیا۔ یہ باغ بڑا خوب صورت اور وسیع

تھا۔ یاغبانی کا کام ہو گیا، امیر عاصم نے کئی بار اس کا محاذ کیا۔ نشیب کی طرف کا یہ علاقہ بڑا خوب صورت تھا۔ آخر وہ وقت گیا کہ ماروہ نے تہلیل آب دہوا یا اس علاقے کی سیر کی خواہش ظاہر کی تو امیر عاصم اسے روکنے نہ سکا۔ آخر امیر عزیز کے قہر کی بہت سی خواتین نے اس جگہ کی سیر کی تھی۔ اسے پسند کیا تھا تو ماروہ کو اجازت دیتے میں کیا حرج تھا اور پھر ان دونوں خور عمہ و زنگ جاگیر سے جا ہر جا تھا، ایسے میں تمنا رہنے والی ماروہ کے احساسات کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ چنانچہ صفوان، نائلہ اور ضروریات کی چند چیزوں کے ساتھ ماروہ خاص سواری میں سوار ہو کر نشیب علاقے کی سیر کو نکل گئی۔

یہاں نائلہ کے ایک رشتے دار کے گھر امیر زادی ماروہ نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس وقت سب پر سخت گھبراہٹ طاری تھی، ذلت اور رسوائی کا خوف تھا، کہ بچے کو مار کر دفن بھی کر دیا جاتا تو تعجب نہ تھا، مگر ماروہ اس کے قتل کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھی اس نے کہا۔

”تاں کہ اے.....“

مگر نیاں ساتھ نہ دے سکی اور وہ بے ہوش ہو گئی، نائلہ نے دکھ اور چاہت سے اسے دیکھا اور بولی۔
 ”آقا زادی! اگھیرائیں نہیں، میں اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دوں گی، جہاں اسے جان کا کوئی خطرہ نہ ہو۔“ پھر
 اس نے اس خوب صورت بچے کو دیکھا، شاید بھوک سے بے تاب ہو کر اپنے دونوں ہاتھ بار بار منہ
 کے قریب لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نائلہ نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور صفوان کو دیتے ہوئے
 بولی۔ ”تم کسی کا ذکر کر رہے تھے، وہاں اسے محروم ہے۔“

”ہاں!“ صفوان نے کہا۔ ”میں نے اس سے بات کی تھی، مگر وہ یہ بچہ مفت میں نہیں قریع لینا چاہتا ہے اس کا خیال ہے کہ زہر خریدنے کو والدہ کی طرح پالا جائے تو اس پر حق ہوتا ہے لیکن کسی قیمت کے بغیر لیے ہوئے بچہ کو کوئی حق نہیں ہوتا۔“

نالکھ مسکرا دی اور اسے بچہ دیتے ہوئے بولی۔ "تو وہ جو مناسب سمجھے دے دے۔ امیرا قسین نے کہا تھا کہ بچہ ضائع کر دیا جائے لیکن میرا خیال ہے، امیر زادی مارو اس کی موت کے لیے تیار نہیں ہیں" ایسے میں بچہ اس خواہش مند شخص کو دے دو۔"

صفوان نے کپڑے میں لپٹے ہوئے بچے کو لیا اور ایک جانب چل پڑا۔

پھر ماروہ ہوش میں آئی۔ بچے کو نہ پا کر تڑپا، مچلی روئی مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ چند روپے علاقے میں قیام کے بعد وہ قہر واپس لوٹ گئی۔ امیر عام نے اسے دیکھ کر ہارے کہا۔

”ماروہ! تم تو بالکل کمزور اور زرد ہو گئی ہو، کیا وہاں کی آب و ہوا تمہیں راس نہیں آئی؟“

اس سوال کے جواب میں ماروہ رودی اور امیر قاسم کے بے حد اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا۔ ”پاپا جان! دل گھبراتا ہے۔“

لڑکی کا دل گھبرانے کے بے شمار معنی ہوتے ہیں، مگر والدین صرف ایک ہی مطلب سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا مرض جس کا علاج شادی اور صرف شادی ہوتا ہے۔ امیر عاصم بھی یہی سمجھا۔۔۔ اور پھر سال پورا ہونے والا تھا اس لیے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں سرداروں کے ہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی اور پھر اچھن اور ماروہ ان کی کلکتہ کی اولاد تھے لہذا یہ شادی ایک یادگار شادی تھی جسے لوگوں نے مدتوں یاد رکھا۔ اس دن امیر زاہد اچھن بڑے کوفر سے آیا اور امیر زاہدی ماروہ کو گویا کہ ہمیشہ کے لیے لے گیا۔



مصر میں موسم گرما شباب پر تھا، ان دنوں فضا موسم کی شدت اور آفتاب کی گرمی سے زمین گرمے تاریکی
 کی قسم، آفتاب کی تیز شعاعیں زمین اور پھاڑوں پر یوں برس رہی تھیں کہ ہر جانب آگ سی لگی ہوئی
 تھی۔ موسم کی شدت سے انسان تو انسان پرندے بھی اپنے گھوٹلوں میں دبکے ہوئے تھے ایسے میں ایک
 ایسی ہی گھوڑا گاڑی شوگر کرتی، دو ترقی چلی جا رہی تھی۔ ہر چند کہ اس کے اوپر پھٹت تھی ہوئی تھی مگر گاڑی
 اپنے سر پر کپڑا ڈالے دو چوپ سے بچنے کے لیے تیزی سے گھوڑے کو ہانک رہا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ
 پر سبز اور چادر رکھا ہوا تھا، لگا تھا کوئی غریب اپنا مال بچ کر گھر واپس ہو رہا ہے۔ گاڑی بان کے قریب
 ال سیٹ پر ایک گھڑی سی رکھی ہوئی تھی جسے دو چوپ سے بچانے کے لیے گاڑی بان نے ہر ممکن کوشش
 کی تھی۔

یہ گاڑی بان العباس تھا، مختلف موسموں میں مختلف اشیاء کی تجارت کر کے اپنا پیسہ پاتا تھا۔ کبھی کام کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ملتا تو اپنی کھڑا گاڑی میں کسانوں کا مال رکھ کر آبادی میں لے جاتا، جس کی فروخت کے عوض اسے کچھ گندم اور چند نکلے مل جاتے، اس وقت بھی وہ اپنے جانور کے لیے کچھ چارہ لے لے اور تھوڑی سی گندم لے کر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ علاقہ بھی کچھ عجیب تھا، دریائے نیل کا پانی یہاں کم ہی پہنچتا تھا، اس لیے یہاں کے باشندے درختوں اور کھیتوں کو روٹ سے پانی دیتے۔ العباس کو شہر میں متعدد ٹھکانے جن کے حوضوں سے اٹنے والا پانی ٹالیوں میں جا رہا تھا۔ ان تمام ٹالیوں کا پانی درختوں کی جڑوں اور کھیتوں کی طرف تھا۔ العباس کا گھر ابھی خاصے فاصلے پر تھا مگر درختوں کے سایہ سے اسے اور روٹ کی آواز گرمی کا احساس کم کر رہی تھی۔ بیشہ شہر سے واپس آتے ہوئے وہ اس

موڑ پر رک جاتا، گھوڑے کو پانی پلاتا اور کبھی درختوں کے سائے میں آرام کر لیتا، مگر آج گھوڑے کو پانی پلاتے ہوئے وہ اضطراب محسوس کر رہا تھا، جیسے جلد از جلد گرہ پھینکا جاتا ہو، پھر اس نے اگلی سیٹ پر رکھی ہوئی گھڑی کو پچھڑا۔ اس کے اندر گوشت کا ایک ٹوٹہ ڈال رہا تھا، ہمکتا ہو کر گری سے سرخ اور بے چین وجود العباس نے پیار سے اسے دیکھا۔ وہ اس کا کچھ بھی نہ تھا مگر اسے پیارا لگ رہا تھا۔ اس نے بچے کی پیشانی آنکھوں، رخسار اور نرم نرم ہاتھ پیروں کو چوما اور پھر گھڑی میں یوں لپیٹ دیا کہ اس کی سانس نہ کرے۔ گھوڑا پانی پی چکا تو ستر کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ دوڑ چند کچے مکاؤں کے درمیان درختوں سے گھرا ہوا اس کا گھر تھا، جس کی اینٹیں سرخ تھیں اور جس کے احاطے میں ایک گاڑے بندھی ہوئی تھی۔ العباس اس کا دودھ پیتا تھا۔ یہ بھی روزگار کا ایک ذریعہ تھا۔ جوں جوں گھر قریب آ رہا تھا العباس کی حالت خیر ہو رہی تھی۔ پھر گاڑی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ سیاہ اور سفید بالوں والا ایک بڑا سا کتا مالک کو دیکھ کر دم ہلانے لگا۔ مگر العباس کی توجہ آج اس کی طرف نہ تھی۔ اس نے گھڑی میں لپٹے ہوئے ننھے سے وجود کو اٹھایا، دیوانہ وار گھر میں داخل ہوا اور چلایا۔

”وسیلہ..... وسیلہ..... وسیلہ۔“

”اے آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ پاورچی خانے سے نکلتی ہوئی ایک جوان عورت نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اس کی شکل اچھی، قد اور بدن مناسب تھا۔ آنکھیں دھوئیں سے سرخ ہو رہی تھیں اور ہاتھ اس کے محنت کش ہونے کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے العباس کے ہاتھ میں ایک ہمکتا ہوا بچہ دیکھا تو باہن چن ہو گئی۔

”یہ کون ہے کہاں سے لے آئے؟“

”تم سات برس میں ہمیں جو کچھ نہ دے سکیں، آج ہم تمہارے لیے آئے ہیں۔“ العباس نے انھما سا وجود اپنی بیوی کی پھیلی ہوئی بانوں میں ڈال دیا، پھر وسیلہ نے اسے نسلایا، پٹھے میں پھینکا اور اس کے منہ میں قطرہ قطرہ دودھ چھپے سے پکانے لگی، اتنی دیر میں العباس نے اسے بچے کے بارے میں کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا۔

”وسیلہ! نشی علاقے کے ایک جوان، صفوان نے چند روز قبل مجھے بتایا تھا کہ ایک ایسا بچہ دنیا میں آنے والا ہے جس کی ضرورت اس کے والدین کو نہیں ہے۔ وہ مجھے یہ بچہ یوں ہی دے رہا تھا کہ میں مفت لیتا پسند نہ کیا اور قیمت لے کر بی زر خرید بچوں پر حق بن جاتا ہے۔ اب اور سنا ہے جن بچوں کو دے کر خریدو، وہ بھی اپنا ایک تعلق سمجھتے ہیں، لہذا میں نے اسے خرید لیا۔“

ہوئے اعلیٰ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بچے کی ولادت میں خرابی کے سبب ماروہ بھی ماں نہ بن سکے گی۔ اقسین نے ان سب کو خاموشی سے چلا کر دیا۔ امیر عزیز بھی اسی تہن میں راہی ملک عدم ہوا اور امیر عاصم بھی مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ اقسین اور ماروہ بھی ماں باپ نہ بن سکیں۔ یہ احساس ان کے لیے سخت جال محسوس تھا لیکن آج دونوں امیروں کی وفات کے بعد اقسین تمام علاقے کا سردار بنا تو یہ احساس کچھ اور بھرا گیا۔ اس شب وہ محل کے زنانہ حصے میں گیا تو اس نے ماروہ کو بیشعور سے زیادہ طول پایا۔ اقسین کو امارت پر مبارکباد دیتے ہوئے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی اس نے بڑے مضبوط و محض سے کہا۔

”ماروہ! امیر کو اس عظمت و عزت پر مبارکباد دیتی ہے۔“

مگر اور اس نے یہ الفاظ زبان سے ادا کیے اور بے اختیار آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ یوں بے اختیار ہو کر وہ بھی نہ روئی تھی اس کا دکھ سمجھا اقسین کے لیے مشکل نہ تھا۔ شادی کے بعد ان پانچ برسوں میں اس نے کتنی ہی بار ماروہ کو سوسکتے دیکھا تھا۔ روتے دیکھا تھا، لیکن وہ ایک دوسرے کو الزام نہ دے سکتے تھے۔ نوجوانی میں ایک غلطی ان دونوں نے کی تھی اور اس وقت انھیں علم نہ تھا کہ بعض غلطیاں زندگی بھر انسان کا پیچھا کرتی ہیں۔ اقسین نے اس وقت بھی ماروہ کو یوں دیکھا جیسے وہ جانتا ہو کہ ان دونوں کا غم ایک اور لا علاج ہے۔ پھر اس نے حسین ماروہ کی کمر کے گرد دایاں بازو محاسن کیا اور اسے اپنی خاص نشت گاہ کی طرف لے کر چلا جو قصر امارت کی ایک خوب صورت جگہ اور دنیا بھر کے پر تکلف سامان سے آراستہ تھی۔ یہاں قیمتی فرش بچے ہوئے تھے عکریاں غلئی گدوں اور چاندنی سے مزین ہوئی تھیں۔ اقسین نے بڑے پیار سے ماروہ کو خاموش تخت پر بٹھایا اور قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ماروہ! قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہم ایک بڑی نعمت سے محروم رہیں۔“

”نہیں اقسین۔“ ماروہ نے نفی میں گردن ہلائی اور روتے ہوئے بولی۔ ”قدرت نے ہمیں وہ عظیم نعمت عطا کی تھی مگر ہم نے وقت سے قبل اسے چھیننا چاہا تھا جس کی سزا پا رہے ہیں اور زندگی بھر بائیں سرے۔“

اقسین نے یہ سن کر شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ شادی سے قبل کے اس جذباتی لمحے کو یاد کر کے وہ پیش پشیمان ہوا تھا اس وقت بھی یہی حال تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اس کیفیت سے دوچار رہتا کہ ماروہ کی سسکیوں نے اسے چونکا دیا۔ وہ بے قرار سے روئی ہوئی بولی۔

”مجھے غم یہ ہے کہ میں نے اس معصوم کو دیکھا بھی نہیں اس وقت ذلت و رسوائی کا ڈور تھا اس لیے نہ

اپنے جذبات کو محسوس کر سکی نہ اسے پیار کر سکی۔ پھر تین ماہ زبان پر تالا پڑا رہا کہ کوئی سن نہ لے اس کے تصور سے میرادل مضطرب ہوتا تھا مگر کچھ نہ کر سکتی تھی۔ تین کروہ شادی کے دن سے آج کے لمحے تک میرے ہاتھ اسے تلاش کرتے ہیں، میرا پھلوس اس کے لیے بے قرار ہے۔“

یہ بات ماروہ نے متعدد بار کی تھی اور اقسین کو ہر بار پوری طرح اس کے غم کا احساس ہوتا تھا۔ ان پانچ برسوں میں اس نے بچے کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا تھا اور ہر ناکامی کے بعد اپنے غم سے زیادہ وہ ماروہ کے دکھ کو محسوس کرتا تھا، سوچ ہی تھا کہ اس کی ایک لغزش نے ماروہ کو مستقل آزار میں مبتلا کر دیا تھا اس کے بارے میں وہ اکثر سوچتا اور شرمندہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی ماروہ کو چند لمحے دکھ سے دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔

”ماروہ! تم جانتی ہو، ہمیں خود بھی اس ریاست کے والی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اولاد کی محبت امارے بھی دل میں ہے۔ پانچ برس کے اس عرصے میں ہم نے اسے تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں باہوڑی، معوان کو تو جب سے اب تک اسی کام پر مامور کر دیا ہے کہ وہ اس شخص کا کھوج لگائے جس نے امارے بچے کو اس سے خرید لیا تھا۔“

ماروہ پھر سک سبک کر روئے گئی۔

بھر وقت گزر گیا اور اکثر ان دونوں کی تہائی کا موضوع وہی معصوم بن جاتا، جسے دونوں میں سے کسی نے دیکھا تک نہ تھا، مگر ان دونوں کو اس کی لگن بے قرار کیے ہوئے تھی۔ کبھی وہ دونوں قریب ہوتے، اقسین اکتفا رحمت کر رہا ہوتا، اور ماروہ مکمل طور پر خود کو اس کے سپرد کر دیتی، تب نہ جانے کونسا لمحہ انھیں عذر رفتہ کی یاد دلاتا، کونسا جملہ انھیں برسوں قبل کھینچ کر باغ کے اس گوشے میں لے جاتا جہاں ان دونوں نے ایک ایسی لغزش کی تھی جس کی سزا انہیں عمر بھر بھگتنی تھی، اس احساس کے ساتھ ہی وہ دونوں ہوا جاتے، پھر نہ ماروہ اقسین کو سکھ دے سکتی نہ اقسین انھوں نے کوئی لطف لے سکتا۔

اسی زمانے میں اقسین کو شدت سے احساس ہوا کہ اس طویل و عریض جاگیر کے لیے اسے وارث کی ضرورت ہے۔ اس نے چند دن غور کیا اور فیصلہ کیا کہ ریاست کی ملکہ ماروہ ہی رہے گی مگر وہ کی سب سے بااقتدار حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اس نے قصر کے معرقتظم انصام کو حکم دیا۔

”انصام! چند کنواری اور خوب صورت لونڈیوں کا انتظام کیا جائے، لیکن یاد رہے کہ یہ سب اچھے اطوار اور اچھے خاندان کی ہوں۔ ہمیں ان میں سے کسی ایک سے ریاست کا وارث لینا ہے۔“ اس حکم پر امیر وزیر اور رئیس سمجھے کہ امیر جوان ہیں اور دوشترکہ جاگیر کے واحد امیر اس لیے اب انھیں

حسین و جمیل عورتوں سے جسمانی مسرتوں کے حصول کا شوق پیدا ہوا ہے۔ بہر حال اس نعم نے حکم ملتے ہی تنگ و دو شروع کر دی اور چند دن کے اندر اندر خوب صورت نازک بدن اور کم سن لڑکیوں سے قصر میں جیسے ہمارا گئی، ابھی تک اچھین نے اس دور کے امیروں کی طرح لولہ نظاں رکھنی ضروری نہ سمجھی تھیں۔ اس نے لڑکھن سے ماروہ کا قصور کیا تھا اور جوان ہوتے ہی وہ اسے مل گئی تھی۔ جو حقیقت میں غیر معمولی طور پر حسین تھی، اتنی کہ اچھین کو اس کی ہم پلہ کوئی دوسری عورت نظر نہ آتی تھی، مگر اب وارث کی خواہش نے اسے کئی عورتوں کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ اب وہ سفید رنگ شفاف رخ اور حسین آنکھوں کا دیوانہ ہو کر کبھی کسی کی طرف توجہ دیتا اور کبھی کسی کی طرف۔ چند کثیریں غیر معمولی طور پر حسین و پرکشش تھیں۔ ایک شمار تھی، اس کا گلابی چہرہ، ابھرا ہوا سینہ اور مناسب قد کی بھی مرو کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دوسری تھی حمی، جسے دیکھ کر ہی اچھین ہلک ہو گیا اور سب سے پہلی شب اسی کو آراستہ کر کے خواب گاہ میں پہنچانے کا حکم دیا تھا ان دو کے علاوہ اور بھی کئی تھیں، اچھین باری باری ان سب کے ساتھ شب گزارتا، محبت کا اظہار کرتا، والہانہ پندہ برتا، اتنا کہ کبھی خود کو دیوانہ سمجھنے لگتا اور کبھی ہر کنیز الگ الگ اسے اپنا دیوانہ سمجھتی۔ یوں متعدد عورتوں کی محبت میں وقت گزرتا رہا اس نے ماروہ کو بھی مطمئن رکھنا چاہا اور کنیزوں کو بھی ہنر نجانے کیوں ہر لمبے تھکی کا احساس بڑھتا ہی گیا۔ اس طرح مہینے برسوں کی نذر ہوتے گئے اور وارث کی طلب سوا ہوئی گئی، پانچ برس گزر گئے مگر نہ کسی شب کو سکھ محسوس کر سکا اور نہ کوئی کنیز اسے وارث دے سکی۔ تب اس نے ایک بار پھر تمام بیسوں کو طلب کیا اور تمام کنیزوں کا معائنہ کرنے کا حکم دیا۔ جواب ملا۔

”عالی جاہ! ہر کنیز اپنی اپنی جگہ بالکل درست اور ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“

اچھین حیران ہوا، پھر اس نے بڑی راز داری سے خود کو اطباء کی اس جماعت کے حوالے کیا تو ان متفقہ فیصلہ تھا۔

”عالی جاہ! آپ بھی ہر طرح سے تندرست ہیں اور باپ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

اس وقت اچھین کی حالت عجیب تھی، شاید اگر طبیب اس سے یہ کہہ دیتے کہ وہ ناکارہ ہے، بیکار رہے اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ اب شب اس کے ذہن میں ایک ہی خیال رہا۔

”اچھین! قدرت تم سے انتقام لے رہی ہے، تم نے گناہ کیا تھا، جرم کیا تھا جس کی سزا یہ ہے کہ تم اولاد سے محروم کر دیے گئے۔ صفوان تمہارے بچے کو دس برس میں واپس نہ لاسکا، تمہیں اس کے لیے بھی مہر بھر چکا ہو گا اور پھر اس وسیع سلطنت کا کوئی وارث بھی نہ ہو گا۔“

یہ وقت بڑا اذیت ناک تھا، ماروہ کی بے قراری اور اچھین کی مایوسی، دونوں ہی تکلیف دہ تھیں، لیکن اعلیٰ جنڈیوں سے بچہ آزمائی کرتے اور محرومی کا دکھ سہتے ہوئے وقت گزر رہا تھا۔ چند ماہ بعد ایک دن صفوان نے اگر عرض کیا۔

”عالی جاہ! امیر زادے کے بارے میں خبر ملی ہے۔“

اچھین چونک پڑا، اسے محسوس ہوا کہ جتنی دھوپ میں سفر کرتے کرتے اچھا لک ابر کا سایہ میسر آیا ہے، اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

”کہاں ہے وہ؟ صفوان، مجھے جلد بتاؤ۔“

”عالی جاہ! وہ اسی غریب کسان کے پاس ہے، جس نے چند دینار کے عوض اسے لیا تھا۔ اس کے اولاد میں ہے مگر اس نے اس بچے پر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں۔ اس شخص کا نام العباس ہے اور وہ نشیستی کے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔“

اچھین بڑا حیران ہوا، جس شخص نے اس کے بچے کو خریدا تھا، اس نے اس پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں، مگر کیوں؟ یہ سوال اگرچہ فکر طلب تھا مگر اچھین کو اس وقت بچے کے سوا کسی چیز کا خیال نہ تھا، اس نے حکم جاری کیا۔

”آج شب ہونے سے قبل اس بچے کو مع اس شخص کے حاضر کیا جائے۔“



رات آہستہ آہستہ کائنات پر اپنا تسلط جاری تھی۔ تاریکی ہر سو پھیل رہی تھی، قصر کا ایک کمرہ شمع والوں کی کثرت سے روشن تھا۔ یہ کمرہ بھی دیگر کمروں کی طرح پر تکلف اور قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ اس کے دیواروں پر بڑے تخت پر امیرا اچھین نرم بکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کے اوپر اوپر تخت سے آگے کے فاصلے پر نشوونو پر امیر و رئیس پر ایمان تھے۔ العباس ایک دس سالہ لڑکے کا ہاتھ تھامے حاضر تھا۔ اس کے ساتھ ہی صفوان کھڑا تھا جسے سختی سے یہ تاکید کی گئی تھی کہ العباس کو علم نہ ہو کہ اس کے خریدے ہوئے بچے کا باپ امیرا اچھین ہے۔ اچھین بڑی سنجیدگی سے العباس اور دس سالہ لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکا غیر معمولی خوب صورت اور ذہین تھا۔ آج عرش پر پہلی بار امیرا اچھین کے لیوں پر اس نے آسودہ جسم تھا کہ دیکھنے والے حیران ہو رہے تھے۔ اس کی نظریں بڑی بے تابی سے سامنے لڑکے کے لڑکے کی ہلاکتیں لے رہی تھیں جو اس کے اور ماروہ کے حسن کا بڑا خوب صورت امتزاج

تھا۔ امیرا قین کا دل چاہتا تھا کہ آگے بڑھے اور اس کو سینے سے لگا کر بچھنے لے۔ سنا تھا کہ عورت کے دل میں اولاد کے لیے قدرتی تڑپ ہوتی ہے مگر یہ علم آج ہوا تھا کہ مرد کا دل بھی اولاد کے لیے ایک ایسی ہی اونچی محبت محسوس کرتا ہے جو نہ بتائی جاسکتی ہے اور نہ کسی اور ذریعے سے اس کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔

اقین دیر تک اپنا سینہ سلاتا تو بے اس بچے کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”اس لڑکے کا نام کیا ہے؟“

”عالی جاہ!“ العباس نے اوپ سے کہا۔ ”میری خواہش تھی کہ اپنے بچے کا نام احمد رکھوں، جب میں نے اسے لیا تو یہی نام رکھ دیا۔“

”جب تم نے اسے خریدی تو یہ چند ساعت کا تھا۔ تم اگر چاہتے تو یہ بات چھپا سکتے تھے کہ وہ تمہاری اولاد نہیں ہے، مگر تم نے اسے یہ کیوں بتایا کہ تم اس کے باپ نہیں؟“ امیرا قین نے پوچھا۔

”عالی جاہ!“ العباس نے کہا۔ ”میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ بچے کو یہ بتانا کہ میں اس کا باپ ہوں صریحاً غلط بیانی ہوتی، دوسرے میں اپنا نام جاری کرنے کے لیے اولاد کا تمنا نہ تھا بلکہ میں صرف ایک بہادر اور دلیر بیٹے کا خواہش مند تھا، قدرت نے مجھے یہ نعمت عطا نہ کی تو میں نے اپنی پسند کا ایک بچہ خرید لیا اور اب میرا فیصلہ ہے کہ اسے تربیت اور تعلیم کے بعد ایک بہادر سپاہی بناؤں گا تاکہ لوگ کہیں کہ العباس کا زور خرید پر ایک دلیر مجاہد ہے۔“

امیرا قین، العباس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا۔ دس سالہ احمد نظرسنجی کیے امیر اور العباس کی مختصر خاموشی سے سن رہا تھا، اب اقین نے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔

”احمد! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”عالی جاہ! احمد نے پہلی بار کلام کیا۔“ آقا نے مجھے ہوش سنبھالتے ہی یہ سمجھا دیا تھا کہ میں ان کا فرزند نہیں، ز خرید ہوں جب سے میں انھیں اپنا آقا اور خود کو ان کا غلام سمجھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود وہ میری پرورش اسی طرح کر رہے ہیں جیسے دوسرے حقیقی باپ ہوں۔“

”جب وہ تمہیں اولاد کی طرح رکھتے ہیں تو تم انھیں آقا کیوں کہتے ہو؟“ امیرا قین نے پوچھا۔

”کیوں کہ اسلام میں کسی شخص کو باپ کہنا گناہ ہے اور نہ کوئی شخص کسی کو تسی کر سکتا ہے۔“ احمد نے کہا۔

”تم اسلام کے بارے میں اتنا جانتے ہو! جب کہ تمہاری عمر تو صرف دس برس ہے۔“ امیرا قین اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جی ہاں۔“ احمد نے کہا۔ ”یہ تعلیم بھی مجھے میرے اخصی سرپرستوں نے دی ہے۔“

چند لمبے اہل محفل حیرانی سے سکتے رہ گئے، پھر اقین نے کھری سانس لی، اور بولا۔

”العباس! اگر احمد کے اصل والدین مل جائیں اور وہ تم سے اسے مانگیں تو تم۔“

”عالی جاہ!“ العباس نے گھور آواز میں کہا۔ ”میں احمد سے بیٹوں جیسی محبت کرتا ہوں، لیکن اگر یہ بات ہو جائے کہ طلب کرنے والے اس کے اصل والدین ہیں تو میرا کوئی حق باقی نہ رہے گا۔“

امیرا قین نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا، اسے محسوس ہوا کہ یہ شخص غریب ہونے کے باوجود غنی اور اپنی قسمت پر قناعت کرنے والا ہے۔ اس نے سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”العباس! تم قابل احترام انسان ہو، ہم اس لڑکے کو دیکھ کر تمہاری اعلیٰ تربیت سے بہت خوش ہیں اور یہ کتنا چاہتے ہیں کہ احمد کو ہمیں دے دو۔“

احمد اور العباس نے چونک کر امیر کو دیکھا، پھر العباس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”عالی جاہ! آپ احمد کو لے کر کیا کریں گے؟“

”ہم اسے اپنا بیٹا بنائیں گے اور اسے تعلیم کے علاوہ باقاعدہ عسکری تربیت دیں گے، یہی تمہاری اہم بات ہے نا! اس کے علاوہ ہمیں اس سلطنت کا وارث چاہیے، ہم احمد کو اپنی مرضی سے تربیت دے کر امارت اسے سونپ دیں گے۔“

العباس کے لیے نہ انکار کی جرات تھی نہ امیر کی بات رد کرنے کا حوصلہ، مگر اس نے دھیرے سے کہا۔

”امیرا! کیا آپ مجھے آج شب کی ملت دیں گے؟“

”ہم کہیں آج شب کی ملت دیتے ہیں۔“

امیرا قین نے یہ کہتے ہوئے صفوان کو اشارہ کیا اور وہ احمد اور العباس کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ رات ان سب کے لیے غیر معمولی تھی، اوپر بارہوہ کو علم ہوا کہ اس کا بچہ صبح آنے والا ہے تو وہ جیسے

داہنی ہو گئی وہ بار بار پوچھتی۔

”کیا نام رکھا ہے انھوں نے اس کا؟“

”کیسا ہے؟ خوبصورت ہے نا؟“

”مکزور تو نہیں ہے؟“

”آواز کیسی ہے؟“

”مجھ سے اسی وقت کیوں نہیں ملوایا؟“

اقتین نے ان سب باتوں کا ایک ہی جواب دیا۔

”ماروہ اپنے جذبات پر قابو رکھنا، فی الحال ہم نے احمد پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ ہم اس کے باپ ہیں یا تم اس کی ماں ہو، ہم یہ سب اسے آہستہ آہستہ بتائیں گے۔“

ماروہ اس پر رضامند ہو گئی، مگر اس کے سینے میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ دس برس کے طویل عرصے میں ماں اور بیٹے میں اس طرح جدائی رہی تھی کہ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ تھا اور اگلی صبح وہ قصر میں آنے والا تھا۔ ماروہ بار بار روٹی اپنے ہاتھ دیوانہ وار پیسنے لگا کر بھیجنے غرض یہ کہ وہ ایک عجیب سی خوشی سے سرشار تھی۔ یہی حالت اقتین کی بھی تھی، مگر مرد و اولاد سے محبت کے معاملے میں اس حد تک سخت دل ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار اس طرح نہیں کر سکتا جس طرح ایک ماں کر دیتی ہے۔ ادھر ان دونوں کی حالت یہ تھی، ”ادھر صفوان کی زبانی العباس اور وسیلہ کو علم ہو گیا کہ احمد کے اصل والدین امیراقتین اور امیرہ ماروہ ہیں تو ان کی حالت غیر ہو گئی۔ وسیلہ بری طرح رو دی، دس برس کے طویل عرصے میں اس نے بیٹوں کی طرح احمد کو پرورش کیا تھا، اس کے لبوں نے اسے کل پرہیزگار سکھایا تھا، انگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھایا تھا، اپنی ضرورتیں نظر انداز کر کے اس کی خواہشات پوری کی تھیں مگر مذہب کی رو سے ان دونوں کا اس پر کوئی حق نہ تھا۔ دوسرے کمرے میں احمد محو خواب تھا اور العباس اور وسیلہ مسلسل روئے جا رہے تھے۔ صفوان نے ان سے کہا تھا۔

”امیر کا حکم ہے کہ فی الحال احمد کو علم نہ ہو کہ وہ قصر میں کیوں جا رہا ہے۔“ اس حکم کی پابندی لازمی تھی اسی لیے العباس نے وسیلہ سے کہا۔

”حیاط کرنا، احمد کو بتانا نہیں کہ وہ اپنے اصل والدین کے پاس جانے والا ہے، نہ جانے کیا مصلحت ہے، شاید یہ بات امیر اسے خود ہی بتانا چاہتے ہیں۔“

”کیا یہ ہم پر ظلم نہیں ہے۔“ وسیلہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اسے دس برس بیٹوں کی طرح پالا ہے۔“

”مگر یہ امیراقتین کا حکم ہی نہیں، صفوان کے قول کے مطابق احمد ان کا حق ہے، ان کی اولاد ہے۔“

”ہم راتوں رات اس بستی کو چھوڑ نہ دیں؟“ وسیلہ کے ذہن میں خیال آیا۔

”نہیں۔“ العباس نے دکھ کے ساتھ مگر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”میراقتین ہمیں علاقے کے کسی کونے میں نہیں چھوڑیں گے، اور پھر ہم اس حقیقت کو کیوں نہ مان لیں کہ ہم احمد کے والدین نہیں

”ابا۔“

”کاش ہم احمد کو یہ نہ بتاتے کہ ہم نے اسے خریدا ہے، ہم یہی کہتے کہ وہ ہمارا ہے تو آج دنیا کی کوئی بات اسے ہم سے جدا نہ کر سکتی۔“ وسیلہ نے روتے ہوئے کہا۔

”پھر ہم جھوٹ بول کر خدا کے گناہ گار ہوتے۔“ العباس نے کہا۔ ”حکم از حکم اب ہمارا ضمیر تو مطمئن ہے، ہم نے محبت کے جذبے سے مجبور ہو کر ایک بچہ حاصل کیا، اس کی پرورش کا پورا حق ادا کیا، آج وہ اس سے دور جانے والا ہے مگر ہم خدا کے سامنے سرخ رو تو ہیں۔ اگر ہم جھوٹ کا سہارا لیتے تو احمد کو ہم کوئی نہ سمجھیں سکا مگر ہم اپنی نظروں میں خود مجرم ہوتے۔“

دونوں دیر تک ایک دوسرے کو سمجھاتے مگر مسلسل روتے رہے۔ احمد ان کا خون نہ تھا مگر انھیں اس واقعی جنت تھی۔

اگلی صبح وسیلہ اور احمد کی جدائی کا منظر بدروا ناک تھا گاؤں کے سب لوگ ان کے گھر جمع تھے اور یہی اٹھنا دیکھ رہے تھے۔ انھیں صرف یہ علم تھا کہ امیراقتین نے احمد کو اپنا بیٹا لیا ہے۔ گاؤں بھر کے بچے اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”اب احمد اب قصر میں رہے گا شہزادوں کی طرح۔“

کوئی کہہ رہا تھا۔

”احمد سلطنت کا امیر بنے گا، کیونکہ امیراقتین اسے بیٹا بنا رہے ہیں۔“

فرض یہ کہ ہر طرف احمد ہی گفتگو کا موضوع تھا۔

یوں آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان یہ دس سال غیر معمولی بچہ گاؤں کے افلاس زدہ گھر سے نکل کر قصر میں آ گیا اور یہاں ماروہ کے سینے سے لگ کر اسے پہلی بار علم ہوا کہ محبت کی گری کسے کہتے ہیں۔ ماروہ نے پہلی مرتبہ جی اے یوں سینے سے لگا کر بھیجنا تھا کہ اسے نیند آنے لگی تھی۔ یہ کیسی لذت تھی یہ کیا

”کون تھا؟“ صرف محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر امیراقتین تھا، جس نے اسے بازوؤں میں بھر کر اس طرح چوما تھا جیسے وہ مدتوں کے بچھے سے ملے ہوں۔ احمد یہ سب حیران ہو کر دیکھتا رہا۔ اس کی زندگی ایک دم سے بدل گئی تھی۔ گاؤں سے چلتے وقت اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ محبت کرنے والوں میں آ گیا ہے۔ اس شب طویل و عریض خواب گاہ میں اٹھا، پچھرا کھٹ پر وہ امیراقتین اور ماروہ کے درمیان شب خوابی کے خوب صورت لباس میں نیند سے جاگ بھڑکا اور پھر امیراقتین اور ماروہ اسے باری باری چوم رہے تھے، اس کے لیے خواب گاہ از سر نو آراستہ

کی گئی تھی۔ ماروہ بخند تھی کہ آج شب احمد اس کے پاس سوئے لیکن ادھر امیرا قسین بھی اسے چھوڑ
کو تیار نہ تھا۔

احمد کے لیے محبت کا یہ انداز نیا اور فرحت بخش تھا، امیر نے کہا تھا۔

”احمد! ہمیں امیر نہیں پایا جان کہتا، ہم تمہارے منہ سے یہی لفظ سنتا چاہتے ہیں۔“

اس جملے پر احمد نے تعجب سے اسے دیکھا تھا، تب امیرا قسین اور ماروہ نے ایک دوسرے کو معنی
اور اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور پھر امیر نے اس کے کان میں کہا۔

”بیٹے! ہم تمہارے باپ ہیں اور ماروہ تمہاری ماں، تم ہماری اولاد ہو لہذا ہمیں باپ اور انھیں ماں
کہو۔“

احمد کچھ اور حیران ہو گیا اور بولا۔ ”اگر آپ دونوں میرے ماں باپ ہیں تو میں اتنے برس تک یہاں
کیوں نہیں رہا، آپ نے مجھے اپنے پاس کیوں نہیں رکھا؟“

آج پہلی بار اس سوال پر اقسین اور ماروہ نے عجیب تبسم کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا پھر ماروہ
اسے سینے سے لگایا اور بولی۔ ”بیٹے تمہارے بابا جان صحیح کہتے ہیں، تم انھیں امیر نہیں پایا جان کہو
کیونکہ یہ تمہارے باپ ہیں اور اتنے دن تم انھیں اور وسیلہ کے ساتھ کیوں رہے، یہ ہم تمہیں
بتائیں گے۔“

احمد نے تصدیق نظروں سے اقسین کو دیکھا تو اس نے بھی یہی کہا۔ ”ہاں بیٹے، یہ ایک راز ہے جو
تمہیں پھر بتائیں گے، لیکن یہ صحیح ہے کہ تم اقسین اور ماروہ کی اولاد ہو، ہماری اولاد ہو، اس سلطنت کا
واحد وارث ہو۔ اور ہمارے بعد تمہیں امیر بننا ہے۔ اس وضاحت کے بعد احمد مطمئن ہو گیا، جیسے کہ
اسے کوئی غم نہ ہو۔ اس شب وہ تینوں صبح تک یوں جاگتے، اٹھار بجت اور اٹھکیاں کرتے رہے، جیسے
تینوں ایک جان تین قالب ہوں۔“



امیرا قسین نے احمد کی تعلیم کا آغاز بڑے اعلیٰ بنانے پر کیا حقیقت یہ تھی کہ دس سالہ بچہ تربیت کے
دور کا زیادہ حصہ طے کر چکا تھا، اس کا ذہن بڑے خوب صورت انداز میں تعلیم کی طرف مائل ہو چکا تھا۔
العباس اور وسیلہ نے اسے بڑی خوب صورت سوچ دی تھی جس کے بعد وہ ہر بات کو اسی کے تحت سمجھ
کا عادی ہو گیا تھا۔ امیرا قسین نے اگلی صبح علاقے بھر کے بڑے بڑے فاضل مصلحین کو طلب کیا، جنہوں

نے اس کا امتحان لیا اور اعلان کیا۔

”احمد عام بچوں سے بہت زیادہ ذکی اور ذہین ہے۔“

اس کے بعد اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا، ہر چند کہ یہ بات امیرا قسین اور ماروہ کے لیے سخت
البت ناک تھی کہ احمد اب ان سے دور چلا جائے گا مگر صحیح تعلیم اور اعلیٰ تربیت کے لیے ضروری تھا کہ
اسے مصر کے اس بڑے کتب میں داخل کرا دیا جائے جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنِ حرب کی بھی
اکادہ تربیت دی جاتی تھی۔ ہر سال یہاں پر ہزاروں طلباء کو شہ سواری نیزہ بازی، شمشیر زنی، تیر اندازی
اور قمار نامے سامان حرب کے استعمال میں مہارت دلائی جاتی تھی، اس کتب کے دو بڑے حصے تھے، ایک
طرف ہر قسم کے علوم کا انتظام تھا اور دوسری طرف عملی تربیت دی جاتی تھی، ملک بھر کے سند یافتہ
محققین اور فنِ حرب کے ماہر یہاں جمع تھے جو ہر سال نوجوانوں کو عملی اور علمی میدان میں طاق کر کے
اکادہ ان کا امتحان لیتے اور کئی کئی برس کی محنت شاقہ کے بعد انھیں عملی زندگی میں داخل ہونے کی
اجازت دی جاتی۔

امیرا قسین نے احمد کے بہترین مستقبل کی خاطر اسے اس کتب میں داخل کرا دیا اور مصر میں مشہور
اکادہ کہ امیر زادہ احمد اس کتب میں زیر تعلیم ہے، جن لوگوں کو حقیقت کا علم نہ تھا وہ بھی سمجھ رہے تھے
کہ امیرا قسین نے ایک خوب صورت ذہین اور کم عمر لڑکے کو جتنی کیا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں
اس کا امیر بننے والا اور اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ احمد امیرا قسین کا منہ بولا بیٹا

احمد ایک غیر معمولی بچہ تھا، نہ صرف حسن صورت و نہایت میں بلکہ قدرت نے اسے ذہانت
کا علم میں بھی بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا، پھر اعلیٰ استادوں کے زیر سایہ یہ صلاحیتیں کچھ اور نکھرنے
لگیں، مقابلہ تعلیمی ہوتے یا فنی، احمد کا سب سے نمبر لے جانا یقینی بات تھی۔

ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر اب امیرا قسین نے ریاست کے اندرونی اور بیرونی مسائل سے نمٹنے کے بعد
اسی سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ دینی شروع کی، ابھی تک وہ ایک ایسا امیر تھا جو اپنی علاقے اور اس
کا اندرون کے لیے سب کچھ کرتا تھا مگر اس کے ہاتھ کوئی مستقبل نہ تھا، لیکن اب اس کے سامنے
ایک نیا دور تھا جس کے لیے اسے بہت کچھ کرنا تھا، اب تک اسے علم نہ تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے، لیکن اب
اسے سلطنت کی بہبود اور ترقی کے لیے بیک وقت کئی کام شروع کر دیے۔ اس نے خزانے کو منظم کیا
اور اس کا غلام اسے طاقتور بنایا اور ادھر گرد کی جو زمین فارغ تھی اسے آباد کرنے کا کام شروع کیا، ان

مطلب کی طرف رواں تھا اور اس کی تیزی سے سرکتی ہوئی سنہری کریمیں قصر کی بلند دیوالا عمارت پر ملح
راتی نظر آ رہی تھیں۔ رات ابھی دور تھی علاقے کے باشندوں نے سرشام سے ہی چراغاں کا انتظام
کھا۔ بازاروں، سڑکوں اور گزرگاہوں پر دور دراز لائینیں لگی ہوئی تھیں جو ابھی شام ہونے کے سبب
اٹھارہ ساں توچیں نہ کر سکتی تھیں، مگر ان کی تعداد اور یکسانیت دیکھنے والوں کو مبسوت کر رہی
تھی۔ علاقے بھر کے ہر طبقے کے لوگ اپنے ننھے ننھے بچوں کی انگلیاں تھامے، تماشا دیکھنے کی غرض سے
میں اکٹھا ہو کر جمع تھے۔ کچھ لوگ قصر کے باہر والی طویل بل کھاتی سڑک پر دو روئی قطار میں جگہ بٹا رہے
تھے۔ آج امیرا قسین کا ہونمار فرزند امیر محکمیل تعلیم کے بعد آئے والا تھا اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ اپنی
ساتھ روایت کو توڑ کر وہ شاہی سواری میں نہیں بلکہ اپنے اس گھوڑے پر آ رہا تھا جو اسے انعام میں ملا
تھا۔ گاہوں کو صاف کرایا گیا تھا اور قصر کے بیرونی دروازے سے اندر تک خوب صورت نو عمر کینٹریں
تھیں، جن کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے کہ جدھر جدھر سے امیر زادہ گزرے وہ جھک کر سلام
کریں اور اس کے گلے میں ہار پہنا دیں۔ قصر کے بیرونی دروازے سے شہر تک رہنمائی کرنے والی
ساتھ سڑک پر سیکڑوں مشتاقان دید کا مجمع تھا جن کے ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکیاں تھیں کہ جنوں ہی امیر
زادہ اسے گزرے وہ پر خوش فحشوں کے ساتھ یہ پھول اس پر اور اس کی سواری پر پھنسا کر دیں۔ ادھر
اپنی استطاعت کے مطابق اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا، ادھر ان سب سے بے خبر اپنے شاندار
حالات کی تیاریوں سے نا آشنا خوب صورت اپنی عمر سے بہت زیادہ طاقتور، صاحب علم اور اعلیٰ اطوار کا
امیر زادہ احمد گھوڑے پر سوار اپنے علاقے کی طرف سڑک رہا تھا اگرچہ اس کے لیے شاہی سواری
کی گلی تھی۔ کتب سے قصر تک ساتھ دینے والے مصاحبین کا پورا دستہ تیار تھا اور اسے امیروں والی
تہذیب میں جانا تھا مگر اس نے یہ سب سنا تو امیرا قسین سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”اما جان! یہاں سے ہر طالب علم جس طرح جاتا ہے، ہم بھی اسی طرح واپس جائیں گے“

”امیرا قسین نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مطلب یہی کہ تم شاہی سواری سے نہیں گھوڑے پر یہ سڑک پر چلتے ہیں۔“

”میں چند لمحے اسے اس انداز میں دیکھ رہا جس میں تردد کے ساتھ تعریف شامل تھی پھر بولا۔

”ارادہ! میں کوئی اعتراض نہیں لیکن ہم یہ انتظام کریں گے کہ اپنے علاقے کی سرحد پر جنیں شاہی

والی مارل جائے اور تم.....“

”اما جان!“ احمد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”آپ ذرا غور فرمائیں کہ سپاہی گھوڑے سے اتر کر

تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد اس نے قصر کی اندرونی آرائش و زیبائش اور حسن میں اضافے کی
طرف توجہ دی۔ سب سے پہلے اس نے قصر سے متصل عمارتوں میں بڑے مناسب اور خوب صورت
اضافے کیے، قصر کے گرد وسیع و عریض باغات میں قسم قسم کے درخت اور پھولدار پودے لگوائے۔ یہاں
کہ یہ کام برسوں کا تھا، مگر امیرا قسین کو علم تھا کہ جب تک امیر تہیت اور تعلیم سے فارغ ہو کر یہاں
میں آئے گا تب تک ہی یہ تیاری مکمل ہو پائے گی۔ یہ سب اطلاعات امیر کو بھی مل رہی تھیں وہ خوش
مسرور تھا اور تیزی سے تعلیمی منازل طے کر رہا تھا، وہ علم اور فن دونوں میدانوں میں نمایاں تہیت
تھا۔

مصر کے اس اعلیٰ کتب میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی تھے اور مکمل اسلحہ خانہ بھی، ان دونوں ہر
کتب کے باہر ایک وسیع و عریض میدان میں لڑکوں کو عملی تربیت دی جاتی تھی، ایسے میں نہ صرف
بلکہ دور دراز علاقوں کے شوقین مزاج لوگ بھی یہاں یہ غرض تفریح آتے اور مقابلے کے کھیلوں کا
کرتے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں علاقے بھر کا اہم موضوع امیر احمدی تھا۔ پندرہ سالہ احمد چند برس
اندراغ ندر معمولی شہرت اور اساتذہ کی نظروں میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا تھا۔ ان برسوں میں
نے بڑی تیزی سے بزرگ، مطمئن کے زیر سایہ روحانی، جسمانی اور ذہنی تربیت حاصل کی تھی، کتب
سر فرست اس کا ہی نام تھا اور اکھاڑے کے تمام کھیلوں میں بھی پہلا نمبر اسی کو ملتا تھا۔ غرض یہ کہ
قلب و ذہن کا یہ غیر معمولی خوب صورت نوجوان بے حد براہِ رعب تھا۔

زندگی کے پانچ برس بڑی آہستگی سے گزر گئے، پھر کتب میں فارغ التحصیل طلبا کا سالانہ الوداعی
منعقد ہوا، اس دن شوقین مطمئن نے سب کی محنتوں کو سراہا، زندگی کے آئینہ فیصلوں کے لیے بڑی
تصنیعیں کیں اور انھیں ان کے فرائض سے آگاہ کیا، پھر ان کی کامیابیوں کے مطابق ان میں انعام
تقسیم کیے جو اعلیٰ نسل کے گھوڑے، گھوڑا ڈھال یا قیمتی کتابوں پر مشتمل تھے۔ احمد کو علمی مقابلوں
اول نے پر کتابیں انعام میں ملی تھیں اور اکھاڑے کے میدان میں ہر مقابلہ جیتنے پر گھوڑا اور گھوڑا
ملی تھی۔ کتب کے مدرس اعلیٰ کا خیال تھا کہ اس برس ہر مقابلے میں ایک نوجوان نے سب کو مات
ہے اور وہ احمد ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد احمد کو قصر کی طرف واپس لوٹنا تھا۔



شام کا وقت تھا، آفتاب تمام دن کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنی منزل قریب پا کر تیز روی کے

آرام وہ سواری میں بیٹھ جائے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ (بیرپا پای یا آرام طلب انسان؟) مصاحبن کا ہجوم اور آرام وہ سواری بہادری کی علامت تو نہیں ہیں۔

اس منطق پر اٹھیں بڑی خوشحالی سے ہنسا اور بولا۔ ”جیسی تمہاری مرضی“ اب احمد گھوڑے پر سوار تھا قمر کی طرف سفر کر رہا تھا لیکن جو خونی وہ علاقے میں داخل ہوا یا بچے والے حرکت میں آگئے اور سازندوں نے ایک موثر دھن پیچڑی دور تک پر جوش نعروں سے فضا کو غنیمت مکی مصاحبن جو امیر زادہ کی سواری کے دائیں اور بائیں سفر کرنے کے لیے تیار کیے گئے تھے اس مجمع میں موجود تھے مگر امیر زادہ کی عجیب و غریب فطرت کے بارے میں جان کر اب قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے لہذا یہ مجمع ان کے گھوڑے کے ارد گرد اور عقب میں سفر کرنے لگا قمر کی سرک پر انسانوں کا ہجوم تھا جو نعرے لگاتے ہوئے اس پر پھول نچھاور کر رہا تھا یہ پھول احمد پر گرتے اور گھوڑے کی پشت سے گزرتے ہوئے سڑک پر پھیل جاتے پھر عقب میں آنے والے گھوڑوں کے سم انھیں روندتے ہوئے گزر جاتے مجمع میں شامل عورتیں احمد کے گھوڑے کے آگے رقص کرتی اور گاتی چل رہی تھیں۔ قمر کے بیرونی دروازے تک کی حالت یہاں پہنچ کر استقبال کے انداز بدل گئے یہاں حسین کینزیں دور دیہ قطاریں بنائے ہاتھوں میں ہار لیے اس کی منتظر تھیں۔ اب جدر جدر سے وہ گزرتا ہوا وہ ہار پتا میں اور جھک کر اسے سلام دیتی کرتی رہیں۔ قمر کی عمارت شروع ہونے سے قبل آراستہ دیہاتی بیوی برآمدے پر امیرا قسین اور امیر ماروہ فرزند کے منتظر تھے انھیں دیکھ کر پھولوں سے لدا ہوا احمد جھک گیا۔

”احمد سلام عرض کرتا ہے۔“

امیرا قسین نے اسے آگے بڑھ کر سینے سے لگایا پھر احمد ماں کی قد بڑی کے لیے جھک گیا اور اپنے میں پڑے ہوئے بے شمار ہار ماں کے گلے میں ڈالتا ہوا بولا۔

”ماں جان! ان ہاروں کی اصل مستحق تو آپ ہیں۔“

ماروہ خوشی سے بے قابو ہو گئی اور بولی۔ ”ہم خدائے رب العزت کے حضور اپنے فرزند کے دست پہ دعا ہیں کہ وہ اسے طویل عمر اور دونوں جہاں کی عزت عطا کرے۔“

”آمین۔“ وہاں موجود ہر شخص کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

پھر ماروہ کے اشارے پر درہم دوتار سے بھرے ہوئے تھال سروں پر رکھے کینزیں نزدیک آمد معززین کی نیکیاں لے احمد کا صدقہ اتار پھر ایک تھال میں پہلا ہاتھ ماروہ نے ڈال کر درہم دوتار نچھاور تو سب معزز خواتین ان سکول کی مٹھیاں بھر بھر کر تقسیم کرنے لگیں۔

اس شب دعوت عام تھی۔ علاقے کے ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ شام سے نصف شب تک جب قمر کے گوشہ خانے سے کھانا طلب کر لے ان دیکوں کا حساب نہ تھا جو امیر زادے کی آمد کی خوشی اور کی کمی تھیں، کچھ لوگوں نے مختلف دروازوں پر پہنچ کر گوشہ خانے سے کئی کئی بار کھانا کھایا تھا اور دروازوں کے مومن نے کھانے کی وافر مقدار جمع کر لی تھی۔

اس شب قمر میں باقاعدہ جشن تھا۔ مہر کی اہلی ترین راقصائیں قمر میں طلب کی گئی تھیں۔ نصف شب باہر روز روشن کا سماں رہا، ایک چل پھل اور ہنگامہ تھا اور اندر چھا چھم کی آواز سریلے گیتوں اور واہ۔ واہ۔ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، یہ محفل شب تمام ہونے تک جی رہی تھی کہ سپید صبح نمودار ہونے لگا اور شمع و قافوس کا رنگ پیکا پڑ گیا تب امیرا قسین نے کہا۔ ”ادوہہ“

”کی اور ہمیں احساس بھی نہ ہوا۔“

امیرا قسین نے محفل پر خاست کردی اور یوں امیر زادہ احمد کو آرام کے لیے اپنی خوابگاہ میں جانے کا حکم دیا۔

اگلے صبح بے شمار خوشیاں لائی تھیں۔ اول تو گزشتہ رات کے جشن کا رنگ ہی کم نہ ہوا تھا کہ اگلی صبح امیر نے ایک نیا اعلان کیا۔

”میرا مراد خوب صورت کینزیں جمع کی جائیں، امیر زادہ احمد اپنے لیے ان حینوں میں سے چند کینزوں کا انتخاب کرے گا۔“

امیر کو برا تعجب ہوا، وہ امیر زادوں کی عیش پسندی سے واقف تو تھا مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ اس کا باپ باد اس کے لیے کینزوں کا انتظام کر دے گا۔ ادھر امیرا قسین نے ہر طرح یہ اطمینان کر لیا تھا کہ امیر مراد سے امیر بننے کا اہل ہے۔ اس نے کہا۔

”امیرا ہم پر تو فخر کر سکتے ہیں۔“ قسین کو ہمیں جیسے فرزند کی تمنا تھی، تم بالکل ویسے ہی ثابت ہو رہے

”آپ ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری امارت کا اعلان کر دیں“

”جان!“ احمد نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کے ہوتے ہوئے میں یہ ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔“ اور پھر میں ابھی کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

امیرا قسین ماروہ کی طرف دیکھ کر ہنسا اور بولا۔ ”مارات کا اعلان کر دینے کے یہ معنی تو نہیں کہ ایک دم سے ذمہ دار امیر بن جاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم برسوں اپنے بابا جان کے دائیں بائیں رہ کر امارت کے اسرار سیکھتے تھے، تمہیں بھی برسوں لگیں گے تب یہ بوجھ اٹھاپاؤ گے۔“

”خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔“ احمد نے کہا۔ ”مجھے آپ کے ساتھ بیٹھ کر سیکھنے اور سمجھنے پر کوئی اعتراض نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو زندگی بھر بزرگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہیے۔“

اس بات کو امیرا قین اور ماروہ نے بے حد پسند کیا احمد ان کی تمناؤں کے عین مطابق تھا۔ ابھی یہ سب محو گفتگو تھے کہ ا قین محبت سے احمد کو دیکھ کر بولا۔

”احمد! تمہیں یاد ہے برسوں قبل ہم نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا کہ ایک راز کی بات تمہیں بتائیں گے۔“

”ہاں۔ بابا۔“ احمد یاد کر کے بولا۔ ”آپ نے کہا تھا ہم وہ راز بتائیں گے کہ تم ہمارے فرزند نہ ہوئے ہوئے بھی دس برس ہم سے جدا کیوں رہے؟“

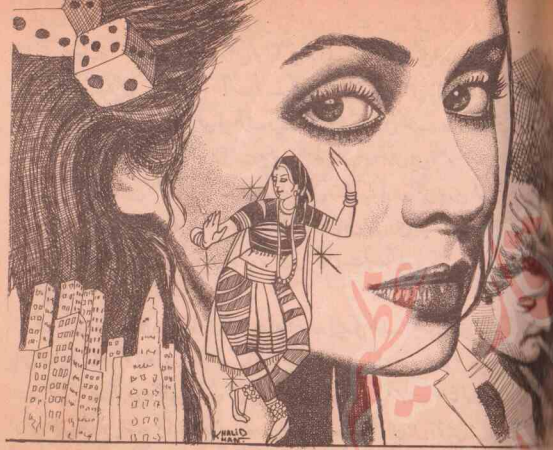
”ہاں۔“ ا قین نے کہا۔ ”آج ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس راز سے پردہ اٹھادیں۔“ اس وقت احمد کے انداز میں اشتیاق تھا وہ امیرا قین کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں ان تین کے سوا کوئی نہ تھا پھر ا قین نے ماروہ کی طرف دیکھا جیسے اجازت طلب کر رہا ہو ماروہ کی نظروں میں آج کوئی تردد یا دکھ نہ تھا۔ اس نے زبان سے نہیں نظروں سے امیرا قین کو اجازت دے دی۔

تب امیرا قین نے احمد کے چہرے پر نظریں جما کر سولہ برس پرانے اس واقعے کو دہرایا جسے آج تک ان دونوں نے راز رکھا تھا۔ یہ تھی جوانی کی ایک لغزش، ایک بھول، ایک گناہ جس نے برسوں کا بیہوش کیا تھا۔ کبھی رسوائی اور ذلت کے خوف نے انھیں نڈھال کیا، کبھی اولاد کی نعمت سے محرومی کے احساس نے انھیں رلایا اور کبھی وہ اپنے اس گمشدہ بچے کے لیے تڑپے جوان دونوں کے گناہ کا نتیجہ تھا۔۔۔۔۔۔ امیرا قین تمام تفصیلات کو الفاظ میں سموتا رہا اور احمد سے تعجب آنکھیں پھاڑے یہ سب سنتا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ اور مضطرب تھا۔ بالا آخر جب امیرا قین یہ داستان سنا چکا تو وہ کھڑا ہو گیا اور لرزتی محوئی آواز میں بولا۔

”تو اس داستان کے معنی یہ ہیں بابا جان کہ آپ کا فرزند ناجائز ہے اور آپ کی جوانی کی خطا اور گناہ آشکار ہے؟“

سوال بڑا عجیب تھا! امیرا قین اور ماروہ نے چونک کر بیٹھ کر دیکھا، پھر امیر نے کہا۔ ”ہم ایسا نہیں سمجھتے۔“

”پھر آپ کیا سمجھتے ہیں؟“ احمد نے دکھ سے کہا۔ ”کیا آپ نکاح سے قبل کی اولاد کو جائز قرار دے سکتے ہیں؟“



”اچھا! امیر اور ماروہ پریشان ہو گئے۔“ تم ہماری واحد اولاد ہو اور اس ریاست کے امیر ہو۔“
 ”مگر مجھے ایسی امارت نہیں چاہیے۔“ احمد کا انداز بدل گیا تھا۔ ”معاف کیجئے امیر، میرے نزدیک
 کو کسی کی ناجائز اولاد کھلوانے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ میں العیاس اور وسیلہ کا زر خرید غلام ہی کہا جاؤں
 اور غریب مگر عظیم شخص مجھ سے میری حقیقت اس لیے نہ چھپا سکا کہ وہ دروغ گوئی کا مرتکب نہ ہوں
 تھا اور نہ ہی مجھے اپنا بیٹا کہہ سکتا تھا اور آپ سولہ برس سے ایک گناہ کو چھپائے دنیا سے اپنی عزت
 رہے ہیں اور مجھے بھی اس مجرمانہ عزت میں حصے دار بنانا چاہتے ہیں!“
 ”سنو۔“ امیر اچھٹا کھڑا ہو گیا۔

”میں نہیں آپ سن لیں کہ میں ایک امیر کا ناجائز فرزند نہیں، ایک کسان کا زر خرید غلام ہوں۔“
 غلط نسبت سے جانا جاؤں اس سے بہتر ہے دنیا مجھے صرف غلام کہے۔“ احمد نے یہ کہا اور کرے سے
 گیا۔

امیر اچھٹا اور ماروہ حواس باختہ سے ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے
 نے برسوں ان کا پیچھا کیا تھا اس طرح انھیں اپنی لغزش کی سزا مل گئی تھی مگر انھیں علم نہ تھا کہ گناہ
 سنگین ہوتا ہے سزا اتنی ہی کڑی جیلیں پڑتی ہے۔ انھوں نے عمر میں ایک بار زنا کیا تھا، شریعت کی رو
 انھیں سنگسار ہو جانا چاہیے تھا مگر انھوں نے اس گناہ پر بڑی خوب صورتی سے پردہ ڈالا کہ کوئی انھیں
 دیکھ سکا نہ پکڑا سکا اور نہ وہ اپنی سزا کو پہنچے نہ ان کی رسوائی ہوئی تھی نہ ذلت نہ انھوں نے سرمایہ
 کھائے نہ ان کا انگ اکر لگایا بلکہ انھوں نے صرف ذہنی اذیت کو سزا سمجھ کر جھٹلایا لیکن حقیقت
 تھی کہ قدرت نے خود انھیں اس سزا تک پہنچا دیا تھا وہ پتھروں کے بغیر ہی سنگسار ہو رہے تھے آج
 کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

پھر امیر اچھٹا اور ماروہ زخمی دل و جگر کے ساتھ برسوں احمد کا انتظار کرتے رہے ان کی
 لادارت تھی مگر جانے والا پلٹ کر نہ آیا اور نہ کسی کو علم ہوا کہ وہ کہاں گیا!
 ہاں مصر کی فوج میں ایک غیر معمولی دلہر سپاہی کے بارے میں لوگ اکثر کہتے تھے۔

”وہ ایک غریب کسان کا زر خرید غلام ہے جس نے چند دنار کے عوض اسے خرید لیا تھا اور اس
 پر وہ ہمارے فخر کرتا ہے۔“!!

جیجتا اس سگڑ کی کنگڑی نڈی پہ بچھڑی خمی ہو پیروں میں کھنگڑو بانڈھے
 سافخانی تودہ موسم جیسا انھیں پتھر گیا

عرفان علی شاد

مونا اور پتھر

وہ اجنبی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا رخصت کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، نیچے جہاں بیڑی بنانے والے
 کر رہے تھے، وہیں سے ایک اوپر اٹھوڑا سا زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا اور پھر پہلے مالے کے بعد
 اس قدر اندھیرا ہوتا کہ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دیتا تھا۔ رخصت نے دیا سلائی جلائی اور اجنبی سے
 کہا۔ ”چل آؤ۔“ اجنبی وہ چند بیڑیاں نیچے ہی تھے کہ دروازہ کھلا۔ روشنی کی ایک ہلکی سی
 لہر نکلی۔ اور کوئی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نیچے اتر گئے۔ جو لڑکی مکی کی ساری پاندھے

دروازے تک آئی تھی، اس کی آواز بہت سہل تھی اور وہ دیکھتی میرا جیبا چرائے لیے جائے، گنگناہتی تھی لیکن رخصت کو آتا دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی اور دروازے سے دو قدم پیچھے ہٹ کر گویا نے گاہک کا ساکت کرنے کی۔ مسکراتے ہوئے اس نے ایک تھکی تھکی سی انگڑائی لی اور دیکھو اس سے رخصت کی طرف دیکھنے لگی۔ بیچ صحن میں کھڑے ہو کر لیے ترنگے مضبوط رخصت نے ادھر ادھر دیکھا اور لڑکی سے پوچھا۔ ”سلونی اور موتا کہاں ہیں؟“ ریشمال چونک کر پنجابن تھی اسی لیے اس کا لہجہ کراچی کے گجراتی لوگوں میں رہنے کے باوجود ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا اس نے کہا۔ ”سلونی کو گاہک (گاہک) لگا اور موتا چاول ابا ل رہی ہے۔“ تنہا سے ایک بچہ جس کی عمر نو دس سال ہوگی بھاگتا ہوا آیا اور رخصت کی ناگوں سے پلٹ گیا۔

”چاچا۔“

مگر رخصت نے اسے پیروں سے اتنی زور سے جھٹکا کہ وہ پیچھے کی طرف لڑھکتا ہوا چوتھرے کے پاس جہاں تل لگا تھا گر آ اور دوتا ہوا اٹھ کر باہر چلا آیا۔ ریشمال نے اس قدر شدید نفرت اور غصے سے رخصت کو دیکھا کہ وہ جو گاہک تھا وہ بھی ایک لمحے کے لیے پورے جسم سے سنٹا کر رہ گیا اور رخصت خفیف سا ہویا۔ ہو سکتا ہے اگر ان کے درمیان یہ گاہک نہ ہوتا تو ان میں تو تو میں میں ہو جاتی مگر معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دونوں مصلحتاً خاموش ہی رہے پھر بھی ریشمال کی آنکھوں سے اٹتی ہوئی نفرت کو دیکھ کر رخصت کو جیسے کسی نے اندر ہی اندر جھنجھوڑے رکھ دیا۔ ”میں ایسا کیوں کرتا ہوں؟ کیوں مجھے سننے سے نفرت ہے؟ اس میں اس کا کیا قصور ہے؟“ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ”گاہک نمداے۔“ اور بو بھل قدموں سے واپس پلٹ کر زینے سے نیچے اترنے لگا، حالانکہ میزبھوں پر اندھیرا اور بھی گہرا ہو چکا تھا مگر اس نے دیا سلائی جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

وہ ان میزبھوں سے خوب واقف تھا، وہ برسوں سے دلالتی کر رہا تھا۔ گلی کے کھڑے بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتا اور عقاب کی آنکھوں سے راہ چلتے لوگوں کا جائزہ لیتا اور اب تو وہ اپنے فن میں اس قدر ماہر ہو گیا تھا کہ بند آنکھوں کے ساتھ محض قدموں کی چاپ سن کر ہی وہ راہ گیر کا راہ اور بھانپ جاتا۔ وہ اکثر اپنے ساتھیوں سے کہتا۔ ”میں آدمی کو اس کی چاپ سے پہچانتا ہوں۔“ اور جب وہ بھانپ لیتا تو آواز دیتا۔ ”پابوئی! ادھر چلے آؤ۔“ اس کی آواز میں اس قدر رعب اور اعتماد ہوتا کہ ”پابوئی کسی طلسمی قوت کے تحت اس کے قریب پہنچ جاتے۔“ وہ دیکھو!

رخصت کہتا اور اس لیے اونچے والے کی ککڑی کی ککڑی اٹھتی اور کوئی میلا سا آٹھل سمندری ہوا کے نرم جھونکوں میں پھرتا لگتا جیسے وہ آٹھل نہ ہو کسی بے روزگار نوجوان کا دل ہو جو نوکری کے لیے پھیراں باکام اٹرو پڑے وقت اٹرو پڑنے والے سے خاموش نگاہوں میں التجا میں کر رہا ہو۔ ”دیکھو اگر تم نے مجھے ٹھل کر دیا تو۔۔۔ دیکھو اگر تم اوپر نہ آئے تو۔۔۔؟ ہانڈی کیسے چڑھے گی؟“ پچہ کیسے پلے گا؟ چھوٹی بن اسکول کیسے جائے گی؟

”بس یہی ہے؟“ پابوئی سوال کرتے۔

”نہیں اور بھی ہیں۔“ وہ دیکھو! کسی کے کوٹ کے کارٹھے ہوئے تھے اور کوئی پھولوں سے جھاڑا اور ادھر ادھر ہو رہا تھا۔۔۔ کوئی سانس کے لیے ترپ رہا تھا اور کوئی صرف مسکرائے جا رہا تھا!!

کھمبے سے زینے تک اور زینے سے کھمبے تک کھنچے ہوئے زندگی کے اس تار میں رخصت اس طرح الجھا ہوا تھا جیسے کوئی کٹی ہوئی چنگ پٹی دولتی آتی ہے اور پھر بجلی کے تاروں سے اور پھر ہوا کے زور سے اگر نکل گئی تو خیر در نہ پھٹ جائے گی، بارش سے بھجک جائے گی لیکن چٹنی رہے گی۔ وہ اس زندگی کا کچھ اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک ریشمال ملی تب تک رخصت تھا۔۔۔ تار اور چنگ کا رشتہ۔۔۔ اور مانتا کبھی کبھی بیچ میں ”بھائی“ ڈال دیتا، ”س سے رخصت متزلزل تو ضرور ہو جاتا لیکن ڈنڈا نہیں تھا۔!“

رخصت اور ریشمال کسی زمانے میں ساہیوال کے قریب، چک میں رہتے تھے۔ اس جیسا ٹریل وہ ان پورے گاؤں میں نہیں تھا۔ اس کا دلہا جڑے مضبوط اور سینہ چوڑا تھا۔ اپنی بگڑی کا شلہ لہاتا ہوا جب وہ گاؤں کی گلیوں میں آندھی کی طرح چلا تو کتنی ہی خیاروں کے دلوں میں چراغ لو اپنے نکلے اور وہ ایک بھلی سی ”سی“ کر کے رہ جاتیں۔ کبڈی کے پالے میں کبھی کسی نے اس کی پیٹھ لگتی نہیں دیکھی تھی۔ کتوں کی جگت پر کھڑے ہو کر جب وہ اپنی مونچھیں مروڑتا تو بڑے بوڑھوں کے ہرے بھی غرور سے تھمتا اٹھتے۔ وہ اپنے چک کی آن تھا۔ وہ اگر کسی سے ڈرتا تھا تو اپنی ماں، جس کی زبان بہت تیز تھی اور جس کے بغیر گاؤں کا کوئی جھگڑا یا بے چیمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اکثر فراق میں اپنی ماں سے پوچھتا۔ ”بے پے کیا لڑے بغیر تیری، روٹی بھنم نہیں ہو سکتی؟“ تو بے پے کے دو ہتھ اس پر برستا شروع ہوجاتے اور رخصت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا۔ آخر جب ماں ٹھک کر ہانپنے لگتی تو وہ اپنا سر اٹھاتا اور گردن پر اس طرح ہاتھ پھیرتا جیسے اس کے گلے میں کسی نے

اس مذاق کر رہے ہوئے تو اماں پھت سے نیچے جھانک کر پوچھتی "بیٹو! یہ رخصت کیا کر رہا ہے؟"
 "اے نیتہ نہیں آرہی، مجھ سے کہتا ہے، کہتا ہے....." بھابی کہنے لگتی۔
 وہ فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ "کچھ نہیں اماں میں کچھ نہیں کر رہا تو سوجا یہ دیور بھابی کا
 معاملہ ہے!"

اور اماں مسکراتے ہوئے کہتی۔ "زیادہ بکواس نہ کر چل اب سو جا اور بنتو تو ہمیں اب کام ختم کر
 دیکھی جائے گی۔" یہ کہہ کر اماں نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بنتو نے ہنسنے ہوئے
 کہا۔۔۔۔۔ "بات خوب بتاتا ہے۔ بتاؤں اماں کو؟"

"کیا؟" رخصت کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جتنی بات کہو؟" بنتو نے کچھ اس طرح پوچھا کہ اس سے کہتے ہی بنی "ریشماں!"

بھابی سوچ میں ڈوب گئی۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا پر سوچتی تھی شاید کوئی اور ہو۔" اس نے
 میرے سے کہا اور ہاتھ دھوئے لگی۔

"کچھ سوچ، خدا کے لیے کچھ کر۔" رخصت نے بچوں کی سی معصومیت اور بے تابی سے کہا تو
 بہت دیر تک سوچ لگی۔

"میں تو خود پتا نہیں تیرے لیے کیا کیا سوچتی ہوں مگر تو منہ سے کچھ پوچھتا بھی تھا۔" بھابی نے اس
 کی ناک پکڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب تو کرے گی کیا؟ تو بتا؟"

"میں اماں کے ساتھ ان کے گھر تیری بات لے کر جاؤں گی اور کیا کر دوں گی۔"

"کب جائے گی۔"

"کل ہی چلی جاؤں گی؟"

"مگر بے ہے؟"

"اس کو میں متالوں گی!"

"بھابی زندہ باوا! رخصت نے بھابی کے دونوں بازو پکڑ کر کہی ہوئی آواز میں غصہ لگایا۔

پھر تھوڑی دیر ایک دوسرے کو چھبھرنے کے بعد وہ دونوں پھت پر چلے گئے۔ اس وقت آسمان
 صاف تھا۔ نیلا جھیلکا چاند ہنستا گا تا چاند اور ستاروں سے سجا ٹھنڈا آسمان، جس ایک سفید ساراستہ
 ملاؤں میں گم ہو رہا تھا۔ نرم ہواؤں کے جھوکوں کے بیچ اس نے اپنی ٹھنڈی اعلیٰ چادر پر لیٹنے لپٹے

کوئی بات نہیں کر سکا۔ اسے آواز تک نہ دے سکا اگر وہ چاہتا تو اپنی جسمانی قوت سے ایک ہی
 جھٹ میں ریشماں کا جسم جیت سکتا تھا مگر اسے تو اس کے دل میں جگہ بنانا تھی اس لیے وہ دل ہی
 سے کام لے رہا تھا اور دل تو اس کا بہت ہی نرم اور کمزور تھا۔ اس بات کا احساس اسے ریشماں کی
 چاہت نے شدت سے کروا دیا تھا۔ وہ دور چلی جاتی تو وہ دل موس کر جھجھلاتا ہوا بگولے کی طرح
 اڑتا، سیدھا لال حسین کی چٹکی پر اگر دم لیتا اور لال حسین جو اندر کہیں گے یوں کی بوریاں ادھر ادھر
 کر رہا ہوتا اسے رخصت کی آواز چلی توڑتی ہوئی محسوس ہوتی۔ "لال حسین!"

وہ ہاتھ بھاڑتا ہوا باہر آتا۔ "الو کہہ چکے فضا کہیں کا ہے، انا تار کہیں ہے یوں تو بڑی مونچھے
 مروڑا بھرتا ہے، بزدل!" اور رخصت چپ چاپ شرمندہ سی مسکراہٹ لیے اپنی پندلی کے بالوں پر
 ہاتھ پھیرتا رہتا۔

"یار پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے! بہت دیر بعد وہ جیسے کسی گھرے کنویں سے بولا اور اس کی
 نیچا رگی دیکھ کر لال حسین اسے سینے سے چٹا لیتا پھر جب رخصت اٹھ کر گھر کی طرف چلا جاتا تو اس
 کے پیچھے لال حسین کی دو محبت بھری آنکھیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ پھر وہ بلی سے
 اٹھتا اور اندر جا کر اپنے کام میں لگ جاتا۔

رخصت کو بھابی سے بہت پیار تھا۔ اس کے ساتھ پھیر چھاؤں کرتے ہوئے اسے بہت لطف آتا تھا
 پر آج کل جو وہ کچھ کھویا کھویا سامنے لگا تھا تو بہت بھی فکر مند ہو گئی تھی۔ وہ بہت پوچھتی مگر کیا خیال
 جو وہ کچھ اگل دے۔ وہ بھابی کے ہر سوال کا جواب ایک خفیف سی مسکراہٹ میں گول کر جاتا۔ سب
 سوچاتے تو رخصت چپکے سے نیچے اتر آتا اور چھوٹے موٹے کاموں میں بھابی کا ہاتھ بٹانے لگتا۔ اب وہ
 پہلی سی شرارت اس میں نہیں رہی تھی، بھابی جب پوچھتی۔

"بیٹا تو سہی وہ کون ہے جس نے تجھے کاٹھ کا الو بنا کر رکھ دیا ہے؟"

تو وہ چڑ کر کہتا۔ "رخصت کوئی شریف تھوڑا ہے جسے بنتو نے مٹی کا داھو بنادیا ہے، دن بھر کو کھو
 کے تیل کی طرح کھیتوں میں جان مارتا ہے اور رات کو....."

"بکواس بند کر، نہیں تو اماں کو آواز دیتی ہوں۔" اسی لمحے بھابی بات کاٹ کر کہتی۔ اس سے ہاتھ
 جڑواتی، ناک سے لکیریں کھینچتی اور جب وہ اپنے دیو پیکل دیو کو یہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھتی تو
 ہنسنے ہنسنے اس کی بری حالت ہو جاتی۔۔۔ ایسے ہی جب لالہ ان دوئوں کے درمیان رکھی ہوئی
 اور بھابی کے ہاتھ مٹی سے لٹھڑے ہوئے ہوتے اور دونوں ایک دوسرے سے نوک جھونک اور

تھے، یہاں آکر چپک گیا تھا، کھڑکھوٹنا شروع کر دیتا اور باہر دروازے سے لگی ہوئی بجائی جب سکی لیتی تو رخن کو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی تنخیر اس کے سینے کے پار ہو گیا ہو۔ وہ دور سے اپنا سر دبا کر پر بارتا اور اسی لمحے کوئی گاڑی اسٹیشن سے سینی بجاتی ہوئی گزرتی کھٹا کھٹ... دھن دھن... تھنے میں کوئی زور زور سے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹتا۔ ”کھول دروازہ کھول! کیسے، لطفے“ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ کھول دروازہ۔“ اماں کی آواز سن کر اس کے روٹنے لگے کھڑے ہو جاتے پھر دھیرے سے دروازہ کھول کر چوٹ میں سر تھکانے کھڑا رہ جاتا۔ اماں اس کے منہ پر طمانچہ مارتی۔۔۔۔۔ ”ذلیل... کیسے... آج پھر پل کر آیا ہے۔ سو روتے اس آواز اور ریشوں کے لیے۔“ اس بھگوئی کے لیے یہ حال بنایا ہے؟ اور میں نے جو تجھے پال کر سائنہ کا سائنہ کیا تو وہ کچھ نہیں؟... سور... کتے۔۔۔ چنان... چنان... پیناں پھیرے بارش دھبی ہو کر پھوار میں بدل جاتی اور جب پوار بھی ختم جاتی تو اماں کی آنکھوں سے سادھن بھادوں کی سی تھڑی لگ جاتی اور وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر اس کے گلے پر اور اس کی چھاتی پر اور اس کے گالوں پر پیار کرتے کرتے کہتی۔۔۔۔۔ ”تو ایسا کیوں کرتا ہے میرے لال؟ تو اس ایک بار ”ہاں“ کر پھر کیونکہ تیرے لیے کسی چاندنی دلمن لاتی ہوں۔“ اور اسی وقت چاند پر کوئی گمراہیہ بادل منزلانے لگتا اور پونم کی بھرپور رات اماں کی رات میں بدل جاتی۔ تب رخن دھبی مگر اراڑوں سے بھرپور آواز میں کہتا۔

”نہیں ماں ایسا نہیں ہو سکتا، میں مجبور ہوں۔“ اور اس کے گالوں پر آنسوؤں کی جھبی ہوئی لکیر اس طرح رواں ہو جاتی جیسے بھاؤں کی برف گرمی کے پہلے جھوٹے سے کھیل کھیل کر میڈانوں کی طرف چل نکلتی ہے اور اس قافلے میں کوئی آواز بھی تو نہیں ہوتی، وہ خاموش رہتا اور اماں تھوڑی دیر کے بعد سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف چل دیتی اور ایسے میں یوں محسوس ہوتا جیسے نیم کے رخت کی شاخیں کچھ اور جھک گئی ہوں۔۔۔۔۔!

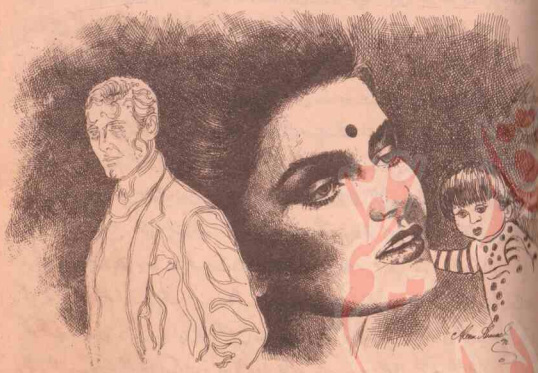
کی آنکھیں جو اب تک ایک غبار میں لپٹی ہوئی تھیں، کھل گئیں، اور پھر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
 آج بھابی نے بھی اس کو...؟؟ اس نے سوچا پھر پتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہ تیزی سے اپنے
 کمرے کی طرف چلا گیا۔ ”بھابی مجھے معاف کر دینا میں نے تجھے بہت دکھ دیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے
 دروازہ بند کر لیا اور بھابی بموت کی کڑی رہ گئی۔ اس نے دیر سے اٹھ کھڑا ہوا اپنی آنکھیں
 پونچھیں اور یہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی کہ وہ صبح اسے منالے گی لیکن جب اس نے صبح
 ”من“ میں نکل کر دیکھا تو رخت کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ بھاگ کر ڈیوڑھی میں گئی، وہاں بھی
 دروازہ کھلا تھا۔ وہ سر کے بال نوچتی اماں کی طرف دوڑی۔ ”اماں! اماں رختن چلا گیا۔“

پہلی.... آوارہ۔“ اور ریشماں پتھر کی بے جان مورت کی طرح خاموش تھی کہ اندر کو کھڑی سے کہہ سکتے تھے کہ آواز آئی۔ رجن نے چونک کر اس کے پیلے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کون ہے یہ؟“

ریشماں نے انتہائی بیزار اور مایوسی کے ساتھ روتی ہوئی بلی کی سی آوازیں کہا۔ ”یہ میرا بچہ ہے اور اس کی پہلی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے چہرے پر پھیلنے لگے اور پھیلنے لگے۔ رجن کی انگلیوں سے چھو گئے اس کی انگلیاں جیسے تیزاب سے کٹ کر رہ گئیں۔ اس نے ریشماں کا گلا اس طرح چھوڑ دیا جیسے اسے بلی کا شاک لگ گیا ہو۔ وہ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا، ریشماں کو کھڑی میں بیٹے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ کچھ سوچتا ہوا گلی میں آیا اور جن دلالوں نے ریشماں کو ایک دن پہلے کسی سے خریدا تھا، انھی دلالوں سے رجن نے اسے خریدا لیا۔

اور اب وہ ریشماں سے پیشہ کروا تھا اور خود آرام سے بیٹھ کر کھاتا تھا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس نے کبھی ریشماں کے جسم کو نہیں چھوا۔ جوں جوں مٹا ہوا ہوتا گیا، رجن کی نفرت شدت اختیار کرتی چلی گئی حالانکہ مناس سے بہت محبت کرتا تھا اور روتے روتے بھی اس کے پیروں سے چٹ جاتا تھا۔ ”مجھے کیوں مارتے ہو.... کیوں مارتے ہو؟“

اور اس شام جب رجن کی گاہک کو کٹھے پر بچھا کر کھبے کی طرف جا رہا تھا تو اسے منافذ پاؤں کے کسی لڑکے سے باتیں کرتا ملا اس کے ہاتھ میں ادھ جلی سگریٹ کا ٹکڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”فر دیکھے گا ایک دن ہم بھی بہت بڑا آدمی بنے گا۔ ہم پھر ادھر مایا (بازو) میں جو آٹھ مالے والا بلڈنگ ہے نا پارسی سیٹھ کا، وہ کھریڈے گا، پھر ہم بالکل اپنے رجن چاچا کی طرح ادھر نمٹا سے کھبے کے پاس کھڑا ہو کر سگریٹ پیے گا اور گاہک لوگ کو بلائے گا....“ بچہ اپنی روش میں کھتا چلا جا رہا تھا کہ رجن نے عقب سے آکر اس کے منہ پر طمانچے برساتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں.... تو ایسا نہیں بنے گا.... نہیں بنے گا.... میں بہت ذلیل آدمی ہوں.... تو میری طرح نہیں بنے گا....“ اور پھر ٹپ ٹپ.... رجن کے آنسو کے فٹ پاتھ پر گرنے لگے۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح نئے کو گھیتا ہوا سم تک لایا جہاں مرکزی لائٹ جل رہی تھی اور ایک جاتی ہوئی ٹیکسی کو آواز دی ”ٹیکسی۔۔۔۔۔!“
جب وہ سنے کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا تو ایک کھڑکی سے دو اداس آنکھیں نمودار ہوئیں۔ پھیلے ہوئے کاجل اور مٹکراتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان ریشماں نے دور جاتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھا، جس کی پچھلی سرخ روشنیاں پارش سے ٹیکسی ہوئی سڑک پر ابھی تک چمک رہی تھیں۔



یہی سے انتقام تک ایک ہی صوت تھی کہ وہ اس کی کڑک آباد نہ رہنے دے
ایک کھن پرست کہانیاں جدید صوتی کا دشمن تھا

نہم

نصیف جملہ عروسوں میں داخل ہوا تو اس کے تاثرات، جذبات اور احساسات ویسے ہی تھے جیسے کسی نے نوئلے دھوا کے پہلی پہلی شادی کے موقع پر ہوا کرتے ہیں، وہ کچھ دیر کھڑا اپنی بھئی ہوئی سانسوں کو دبانے میں لگا رہا پھر دیرے دیرے مسمی کی طرف بڑھا جہاں ایک سرخ گھڑی نما ڈھیر اس کا انتظار کرتا تھا، اس کا جسم تپتا ہوا تھا اور ہاتھ کا پ رہے تھے، وہ گر گیا اور سکون ہونے کی کوشش کرنے لگا، حیرت ہے یہ مجھے ہو کیا گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ہوں اس میں اتنا پریشان کرنے کی کیا بات ہے، شادی سب ہی کی ہوتی ہے اور یہ وقت بھی سب پر آتا ہے، پھر میرے ہاتھ پاؤں

ٹھٹھے کیوں ہو رہے ہیں؟" وہ کافی دور خود کو تسلی دیتا رہا، کیلے فورنیا کی سڑکوں پر غلامت کی مانند بکھرے عیاں مناظر یاد کرتا رہا، وہ ان گنت رنگین نظارے یاد کرتا رہا جو اس نے بار بار امریکہ کے چپے چپے دیکھے تھے، توصیف کی یہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی اور وہ اپنے جسم کی ٹھنڈک اور کپکپاہٹ پر فخر پانے میں کئی حد تک کامیاب ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چل ہوا مہسری کے پاس آیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس موقع پر کئے جانے والے وہ دلخواہ تصویر تھیلے اس کے ذہن سے نکل چکے تھے جو اس کے دوست احباب نے اسے سکھائے تھے، مشکل آن پڑی تھی، کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس نے تھک بار کر فیصلہ کر لیا کہ کچھ کہہ دے گا جو دلہن کا گھونگٹ اٹھانے سے پیشتر ظہری میرو کما کرتے ہیں، اسے یہی دکانے اس وقت آ رہے تھے، پھر وہ شروع ہو گیا اور سوچ سوچ کر ڈانیاں بولنے لگا۔ کافی دیر بولتا رہا۔ اس دوران اس نے قیمتی انگوٹھی بھی اپنی دلہن کو پٹنا ڈالی۔ دکانوں کا اشاک ختم ہو چکا تھا، اس نے آخری مکالمہ بولتے ہوئے گھونگٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے، گھبراہٹ، بھاری ہو گئی، اس کا سر سفید چہرہ سرخ ہو گیا اور سفید کپڑا گھونگٹ لپا تو کچھ جسم لرز نہ لگا۔ اس نے ناک پر آیا ہوا پینتہ پونچھا اور بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھونگٹ الٹ دیا، دلہن نے اپنا چہرہ گھنٹوں میں چھپا لیا تھا۔ توصیف پریشان سا ہو گیا، یہ مرحلہ تھا دشوار، اس نے بڑی کاوشوں کے بعد دلہن کا چہرہ ادا کیا، لیکن..... نظر ڈالتے ہی جمع اٹھا۔

"کون ہو تم؟" ہو کھلا ہٹ میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نازنین، باریک سی آواز تھی۔

"جو اس مت کرو، ج تاؤن کوں ہو تم یہ کیا مذاق ہے۔" توصیف کو ابھی تک حقیقت کا یقین نہیں تھا۔ دلہن توصیف کے اس رویے پر ہکا بکا ہو کر اسے نکتے لگی۔ اس کی آنکھیں بھرنے لگی تھیں۔

"یہ کوئی مذاق نہیں ہے میں ہی نازنین ہوں۔" وہ سہمی سہمی سی بولی۔

"ہمت خوب۔" توصیف کا انٹریج دلہن کے کلیجے کے پار ہو گیا۔ "تو آپ ہیں نازنین؟" اس نے سے پوچھا۔

"جی،" دلہن نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"آپ کا نام نازنین کس نے رکھا تھا؟" وہ گرجا۔

"میرے ماں باپ نے۔" وہ ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ ہو گئی۔

"شاید انھیں نازنین کا مطلب معلوم نہیں ہو گا۔" توصیف نے دلہن کے سیاہ چہرے کو گھور کر کہا۔

"کار نام تو شب و دیگر ہونا چاہیے تھا۔" دلہن مارے غمت کے رو پڑی۔ اتنی توہین پر کوئی بھی صبر کرنے کا یا ر انہیں رکھتا۔

"تم کیوں رو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے، میرے حسین تصورات کے تاج محل پر کالک بھیر کر تم کیوں رو رہی ہو؟ تمہیں تو کامیابی کا جشن منانا چاہیے، تم ایک خوبصورت اور پینڈم شوہر کی مالک بن گئی ہو۔ یہ تو صبح اماں سے پوچھوں گا کہ آخر میرے مقدر کو سیاہ کر دینے سے ان کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟" دلہن نے جواب ہی کہنا تھا جب مجھے کبھی فورنیا سے بلایا گیا تھا اور آنے کے ساتھ ہی ڈھول ڈھمکا شروع کر دیا تھا، لیکن مجھے اپنی ماں اور تمہارے ماں باپ سے اس قدر دشمنی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔" وہ غصے میں جھانک رہی تھی، کیا ایسا ممکن تھا کہ ایک بیکار اور کب تک بیکار دلہن کی چپ چاپ بیٹھی اس انگوٹھی ساگ رات کے لاشے کو بولی کرتی رہی؟ جب جیج جیج کر توصیف تھک گیا اور اس میں مزید چلانے کی سکت نہ رہی تو اس نے ایک منٹ کے ساتھ سکھ اٹھا یا اور کوئی نہ ہوئے صوفے پر جا کے پڑ گیا۔



شادی بھی عجیب سی حالات میں ہوئی تھی، چانک توصیف کو اپنی ماں کا مار لگا کہ فوراً پاکستان آ جاؤ، شادی ہو رہی ہے، اسے ایک ہفتے کے اندر اندر گھر پہنچنے کی ناید کی گئی تھی، دفتر سے چھٹی لینے اور وہ انہ ہونے میں ہی تین چار روز گئے، غرض جب توصیف گھر پہنچا تو اس وقت مایوں کی رسم ادا کی جا رہی تھی، فوراً اسے زور کپڑے پہنا دیے گئے اور اس پر اٹھن چھوٹنا شروع ہو گیا۔

"بھئی، مجھے بتاؤ بھی تو میری شادی کس سے ہو رہی ہے؟" وہ خوشی میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ امریکہ سے انسان تک کے سفر میں اس نے تصورات کے کیوس پر اپنی دلہن کے جو خدو خال اجاگر کیے تھے وہ دلکش تھے، ایک حسین، نازک خوش لباس، خوش مزاج اور خوشدل بیوی۔ وہ ہمیشہ سے حسن و جمال کا شوقین رہا تھا اور چونکہ حسن زدہ بھی تھا اس لیے ہر چیز میں حسن تلاش کرتا رہتا تھا، مصور ہوا یا شاعری، آواز ہوا یا خوراک انسان ہوں یا جانور، ہر جگہ وہ حسن دیکھتا چاہتا تھا، اور کیوں نہ دیکھتا، وہ خود ایک دلکش و دلکش خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس کے ماں باپ اس کے بہن بھائی اس کی بھاد بھیس، اس کے بھائی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔

اس کی ماں کے دوران ہی اسے خبر سنائی گئی کہ وہ عترت بی بی ایک خالہ زاد کا شوہر بننے والا ہے۔

"انہ وہ خالہ زاد اب تک کہاں تھیں اور اب جلوہ گر ہو گئی ہیں تو انھیں شادی کی اتنی جلدی کیوں

”ہوں۔“ ماں نے جیسے سب کچھ سمجھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ ”میرے خدشات درست ہی نکلے مثالیہ
”نازنین پسند نہیں آتی“

”وہ کسے پسند آسکتی ہے اماں، اس میں پسند آدلی چیز ہے ہی کیا،“ آپ نے میری تقدیر کا فیصلہ کرتے
ات مجھ سے پوچھ کر لیا ہوتا“ میں نے آپ پر اعتقاد کیا تھا، اپنے نصیب کی تمام باتیں آپ کے ہاتھ میں
دی تھیں، آپ نے میرے بھروسے کو خوب پاش پاش کیا ہے اماں۔“ اس کی آواز بلند نہیں تھی
مگر میرے لیے طوفان بول رہا تھا۔

”اپنے الفاظ کو تہذیب کا جامہ پہناؤ تو صیف، نازنین بہت اچھی لڑکی ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے
اہل صورت نہیں دیکھی جاتی، سیرت ہو تو صورت کے عیب چھپ چھپا کرتے ہیں۔“ انھوں نے
کہاتے ہوئے کہا۔

”میں اس کی اچھی سیرت کو چاٹ کر کیا کروں گا۔“ تو صیف چیخا۔ ”آپ تو میری ماں ہیں اور ماں اولاد
کی رگ رگ سے واقف ہوتی ہے۔ آپ نہیں جانتی تھیں کہ میرا ذوق کیا ہے، آپ کو خبر نہیں تھی کہ
اں اسی عیب دار چیز بھی پسند نہیں کرتا کہاں کہ بیوی۔“ وہ ہلے نہ ہوا۔

”ہوش میں رہو تو صیف! خدا کی پائی ہوئی صورت میں عیب نکالنا گناہ ہے پھر نازنین کا رنگ ہی تو ذرا
کم ہے اور تو سب کچھ ٹھیک ہے، ناک نقشہ، قد و قامت، آداب و قرینے۔“ ماں نے سرزنش کی۔

”ہونہ۔ رنگ ذرا کم ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ شادی سے پہلے مجھے یہ سب کچھ کیوں نہ بتایا گیا۔“
صیف شے سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ وہ تمہاری بچپن کی منگتیر ہے۔“ ماں نے اطمینان سے کہا۔
”کیا.....؟“ تو صیف حیرت سے چلا یا۔ ”بچپن کی منگتیر؟ لیکن مجھے کسی نے نہیں بتایا۔ آخر کیوں؟“

اس بات کا علم صرف مجھے تمہارے باپ کو اور نازنین کے والدین کو ہے، تمہیں اس لیے نہیں بتایا تھا
کہ خبریں کر تمہاری تعلیم و ترقی پر اثر پڑتا۔ نازنین کے پیدا ہونے سے پہلے ہی میں نے اسے
ارے لیے مانگ لیا تھا۔ اس کے بعد رشیدہ اور ان کے شوہر افریقہ چلے گئے۔“ اماں چھالیہ کاٹنے

”بہت خوب، مدی ست گواہ چست۔“ تو صیف طیش میں بڑھایا۔
”اواس مت کرو میں نے بہت برداشت کیا ہے۔“ اماں یکھت شے میں آگئیں۔

”لیکن میں بھی اسے اپنے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کیے

ہے کہ مجھے یوں بلایا جیسے جنگ شروع ہونے پر فوجیوں کو طلب کیا جاتا ہے۔“ اس نے اٹھن بھرے
ہاتھوں کی زد سے بچتے ہوئے پوچھا۔

”وہ جو رشیدہ خالہ تھیں نا افریقہ میں، نازنین بھابی ان کی بیٹی ہیں، رشیدہ خالہ تھوڑے ہی دنوں کے
لیے پاکستان آئی ہوئی ہیں اور ان کی خواہش تھی کہ یہ شادی یہاں قیام کے دوران ہی اختتام کو پہنچے، خالہ
میاں کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے سوچا کہ جلد ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“ تو صیف کی بڑی بہن
نے اپنے دو سالہ بچے کے ہاتھوں سے اٹھن چھڑاتے ہوئے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ تو صیف نے خوش ہو کر ہانچنے کو گو میں اٹھایا، لیکن شرر بھانچے نے اس
کے منہ میں اپنے اٹھن میں تھمرے ہوئے ہاتھ گھسادیے اور خوشی سے تالیاں بجانے لگا، تو صیف نے
تصور کی آنکھوں سے دیکھا کہ گود میں ایک خوبصورت سا بچہ اسے جو خوشی سے قھقھریاں مار رہا ہے

اسے پیار سے پیارے بچے بنتے بھاتے تھے، وہ اکثر اپنے بچے بھائیوں کے بچوں کو چوم کر کہا کرتا۔ ”یہ کہ
غلط ہے کہ بچے سب کو پیارے ہوتے ہیں، انسان کے بچے خوبصورت اور جھمکنہ نہ ہوں تو آنکھوں پر بو
گلتے ہیں اور یہ کہنا کہ سارے بچے خوبصورت ہوتے ہیں، ٹھیک بدہیت بچوں کے والدین کو قہقہہ دینا ہے
پھول اور بچے تو خوش رنگ اور تروتازہ ہی اچھے لگتے ہیں۔“



تو صیف ساری رات نہ سو سکا، صوفے پر پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا، اس کا سارا جسم نفرت اور شے کی
بھٹی میں تپ رہا تھا، لیکن الگ آرام سے مسری پر بیٹھی اپنی قسمت پر فوجہ کنال تھی بلکہ جگ کر رہی
تھی۔ تو صیف کی سہاگ رات کانٹوں کے بستر پر گزری، صبح اٹھتے ہی وہ منتھتا ہوا اپنی ماں کے پاس جا پہنچا
اماں اس کے تیر دیکھ کر لکھلا گئیں۔

”کیا ہوا، خیریت تو ہے؟“
”آپ نے خیریت کی گنجائش رکھی ہی کب ہے۔“ تو صیف شے میں ہونٹ بھیج کر غرایا۔

”بات کیا ہے؟ آخر؟ بیٹو تو سہی۔“ اماں نے اس کا بازو پکڑ کر بھٹانے کی کوشش کی مگر وہ کھڑا نہ ہوا۔
”اماں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے مجھے کون سے تصور کی اتنی بڑی سزا دی ہے، میں نے

آپ کی کبھی نا فرمانی نہیں کی، کبھی آپ کا دل نہیں دکھایا۔ اس کے باوجود آپ نے میری قسمت بھرا
دی۔“

اور آپ کے پورا پوری فو اساناؤسی کے درمیان اچھے معلوم ہوں گے؟ شاید ایسی اولاد کو میں وہ شفقت دے سکوں جس کی وہ حقدار ہوا کرتی ہے مجھے بد شکل بچے زہر لگتے ہیں خواہ وہ میرے اپنے ہی کیوں نہ

”اماں پھر زور زور سے رونے لگیں اور توصیف کو کوٹنے لگیں۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ سب ڈر گیا اسے خطرہ ہوا کہ کہیں اماں کو اس صدمے کی وجہ سے دل کا دورہ نہ پڑ جائے! ان کی حالت کافی جاری تھی، وہ تہذیب کے عالم میں بیٹھا بیٹھیاں ملتا رہا پھر۔۔۔ دل و داغ کے درمیان ہونے والی فتنہ ہو گئی۔ دل ہار گیا، داغ فتح ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے اماں۔“ اس نے اداسی سے کہا۔ ”بھئی آپ خاطر، آپ کی شکستہ کی ایک بات کی خاطر اور آپ کی دی ہوئی زبان کی خاطر میں یہ آنکھوں دیکھی کبھی کوتاہی نہیں ہوں۔“ اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور بارے بارے لپٹا لیا۔

”لیکن.....“ وہ رک کر بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میں نازنین کو طلاق نہیں دوں گا، وہ میرے ساتھ رہے گی۔ اس سے زیادہ کی توقع آپ مجھ سے مت رکھیے گا اور نہ مجھے مجبور کیجیے گا۔“

اماں خوش ہو گئیں، نہ ہونے سے کچھ ہونا ہی بہتر ہے، ہمارے بیوت کی لنگوٹی ہی بھلی۔ کسی بات کا دل نہ کرنا بت آسان ہے اور اس پر عمل بہت مشکل کام ہے، یہی تو صیغہ کے ساتھ ہوا، اس نے اماں کو دھوکا دیا تھا کہ نازنین کو طلاق نہیں دے گا لیکن ہر قدم پر اس کا عزم متزلزل ہو جاتا۔

ملای کے بعد پارٹیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا تو تصیف کے دوست احباب اور رفیقے دار کے اور نازنین کے اعزاز میں دو محفے کر رہے تھے، دعوت میں نازنین کو اپنے ساتھ لے جانے میں تو ایک کو اپنی سبکی محسوس ہوئی، وہ اکثر اکیلا ہی جا چنچا اور میزبان سے کوئی نہ کوئی بھانگہ گھڑتا۔ شروع میں تصیف نے بادل ناخواستہ اپنے دل پر ہمبر کی سل رکھتے ہوئے نازنین کے ساتھ تینا فینوں میں بیٹھ لی، لیکن اسے یوں لگاجیے ہر شخص کی نگاہیں انھی کی طرف گھراں ہیں اور تو تصیف اور نازنین کے

دورِ غریب بے گنگے جوئے کو استہزیائی نظروں سے گھور رہی ہیں۔ توصیف اپنی اس سوچ کے بارے
کی مدد تک بے گنجاب تھا۔ لوگ خوبصورت لڑکی کے پہلو میں تین ماں کو بھی گوارا لیتے ہیں لیکن
اور یہ مرد کا جو معمولی ہو تو انھیں قہقہہ ہوتا ہے۔ توصیف کے اکثر بے تکلف دوست اس سے
مکلی پکے تھے کہ آخر تاہمین کے علاوہ کہ ارض پر کوئی لڑکی نہیں رہی تھی؟ ساتھ ہی ساتھ کچھ تنگ
دل کی رائے یہ تھی کہ غالباً تاہمین سے شادی کر کے توصیف اس کی بے اندازہ دولت کا مالک بن گیا
اور اس بے جو شادی کی بنیاد پر دولت ہے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور یہ ساری باتیں توصیف کی

”ذرا غور کیجئے اماں، میری جگہ آپ ہوتیں تو کیا کرتیں؟ اگر آپ مجھے دودھ نہیں بخشیں گی تو میں جان دے دوں گا۔ آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں میں اب بھی نہیں کروں گا۔“

”مرنے کے لیے رضامند ہے نامراد؟ میری ہمو کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔ میں کتنے ارمانوں سے دلنہا کر لاتی تھی۔ تو نے اس کے سامنے مجھے سر اٹھانے کے لائق نہ رکھا۔“ اماں دوپٹے پر آنکھیں مڑو نہ لگیں۔

”دیکھیں نا۔ آپ اسے بڑے چاؤ سے لائی ہیں آپ کے دل میں پوتا پوتی کی خواہش بھی ہوگی۔
بچوں سے کتنا ہمارے یہ بھی آپ جانتی ہیں لیکن اماں ذرا سوچیں تو اگر میرے بچے نازنین کا عکس

عقل مند یا پاگل

لطیف بارون انرشید نے اپنے وزیر "ٹماہ" کو پاگل خانے کے معاملے کے لیے بھیجا۔ جناب ٹماہ جب پاگل خانے کے دروازے پر پہنچے تو انھیں ایک خوبصورت صحت مند نوجوان نظر آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ تو عقل مند ہے۔ وزیر نے چاہا کہ اس نوجوان سے بات چیت کی ابتداء کرے لیکن وزیر کے بولنے سے پہلے اس نوجوان نے کہا۔ "میں آپ سے ایک سوال پر بحثنا چاہتا ہوں۔"

وزیر بولا۔ "بڑی خوشی ہے۔ آپ کو بھی سوال کر سکتے ہیں۔"

نوجوان بولا۔ "سوئے والا شخص نیک کی لذت کس وقت محسوس کرتا ہے؟" ٹماہ نے کہا۔ "خند سے بیدار ہوتے ہیں۔"

نوجوان نے کہا۔ "جب آپ شخص صحت مند سے باہر آجگا ہے تو وہ نیک کی لذت کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ آپ کا جواب صحیح نہیں ہے۔"

وزیر نے کہا۔ "خند سے پہلے۔"

اس نوجوان نے فوراً اعتراض کیا۔ "جس چیز کو انسان نے ابھی دیکھا ہی نہیں اس کی لذت کیسے محسوس کر سکتا ہے؟"

ٹماہ نے کہا۔ "سوئے والا نیک کی حالت میں نیک کی لذت پاتا ہے۔"

اس نوجوان نے جواب دیا۔ "سوئے والا تو مرے والے کی طرح کوئی شعوری نہیں رکھتا پھر بغیر شعور کے کسی چیز کی لذت کیسے محسوس کر سکتا ہے؟"

اس وزیر بہت روت گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے وہاں سے ٹھک لینے میں غایت بھیجی اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی بھی کسی پاگل سے نہیں اچھے گا۔

مراسلہ۔ اعظمی۔ سودی رب

الہین سب کچھ سننی مگر کوئی کچھ نہیں۔

ازرا احتیاط اور پرہیز کے باوجود وہ ہو گیا جس کو توصیف کو کبھی امید نہ تھی۔ خدا جانے بد پرہیزی کا وہ لاشعور تھاجس نے توصیف کو باپ اور نازنین کو ماں بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ نازنین نے دلی زبان اور لفظ الفاظ سے جب یہ خبر توصیف کو سنائی تو پہلے تو وہ ہونچکا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ چٹ

سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں ہوگا۔

خدا کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ نازنین نے آہستہ سے کہا۔ لیکن اس آہستگی میں بھی خدائی کے تاثرات نمایاں تھے۔

"لو اس مت کرو۔" وہ حلق کے بل چنچا۔ "اے نہیں ہونا چاہیے۔ میں اسے دنیا میں آنے سے پہلے

ذہنی روح پر تازیانوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ہر فقرہ ہر جملہ توصیف کے وجود میں بھڑکتی ہوئی غصے کی آگ پر جیسے تیل چڑک دیتا اور وہ کھول کھول کر اپنا سارا غصہ نازنین پر اتارتا جو ہر قسم کے طعنے سننے کے باوجود توصیف کی خدمت میں گلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم و ستم کے جواب میں ایک آہ بھی نہیں نکالی تھی۔ توصیف اس کی خدمت مزار پر اور طیش میں آجاتا۔

"کیا کچھ رکھا ہے تم نے۔ تم اپنی ان اداؤں سے میرا دل جیت لوگی؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" وہ باڈا نا اور نازنین بغیر کچھ کے اس کی نظروں سے دور ہو جاتی۔ توصیف کی چٹھی ختم ہوئی تو وہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ نازنین کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائے لیکن اباں پھر آڑے آگئیں انھوں نے ضد کر کے نازنین کو بھی اس کی ساتھ روانہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ قریب رہنے سے اور پھر برائے ملک میں ایک دوسرے کے دکھ درد میں ساتھ دیکھتے دیکھتے خود دونوں کا ملاپ ہو جائے گا مگر اباں کو یہ پتا نہیں تھا کہ ان کی محض خام خیالی ہے، بغیر فوراً آکر توصیف نے نازنین سے خوب خوب بدلے نکالے جیسے اس کی بیوی کی ہر روز خرید لوٹتی ہو۔

"یہ تم نے کپڑے استری کیے ہیں۔" وہ سارے کپڑے اٹھا کر زمین پر ڈھیر کر دیا۔

"یہ کیا کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے جیسے کیڑے کو ٹوٹے گھول کر رکھ دیے ہوں۔" وہ سارن کا بھرا ڈونگا اٹھا کر پھینک دیتا۔

ذہنی جسمانی سکون سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ نازنین ازدواجی سکون سے بھی نہ آشنا تھی۔

"تم زبردستی ایک سازش کے نتیجے میں میرے سر مزہ دینی ہو، میں تم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں، تم مرکب نہیں جانتیں؟ میں تمہیں کبھی ماں نہیں بننے دوں گا، تم بچہ نہ ہو کر بھی نا بچہ رہو گی، میں نہیں چاہتا کہ تمہارے گھناؤنے رنگ کا عکس لے کر جو بچہ پیدا ہو وہ مجھے سے منسوب کیا جائے! تمہیں تمہارے لیے سلیو پوائس on ہے، تم کبھی ماں نہیں بنو گی۔" وہ لفظوں کا زہر نازنین کے وجود میں داخل کرنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔

"کاش میں بیس کسی نیم سے شادی کر لیتا، کم از کم یہ تو ضمانت ہوتی کہ بچے خوبصورت پیدا ہوں گے" میں ان پر فخر کرتا لیکن ابھی۔۔۔ اگر تمہارے زیر اثر پیغمبر سے جیسا پوچھ ہو گیا تو میں کس منہ سے اسے دنیا کے سامنے پیش کروں گا کہ لوگوں۔۔۔ یہ میرا پر ہے۔ اس شرمندگی سے بچنے کا واحد حل یہی ہے کہ میں کبھی باپ نہ بنوں کم از کم تمہارے بچے کا ہو سکتا ہے وہ میرے بجائے تمہارا اثر لے کر پیدا ہو ہو۔۔۔ وہ اولاد کیا جسے دنیا کو دکھائے تو شرم محسوس ہو۔"

ہی ختم کر دوں گا۔

”وہ ختم نہیں ہوگا۔ دنیا میں آئے گا۔“ نازنین نے مطمئن ہو کر سکون کے ساتھ جواب دیا۔

”تو..... کیا..... تیری یہ مجال۔ میں ابھی تیرا سارا گھنٹا لگا دیتا ہوں۔“ توصیف ہلکے ہلکے اور دیوانوں کی طرح نازنین پر پل پڑا لائیں۔ گھونے، تھپہ، گالیاں، جب ہانپنے لگا تو اس نے سنا۔ نازنین کہ رہی تھی۔ ”مسٹر توصیف آپ حد سے بڑھتے جا رہے ہیں اگر آپ نے مجھے ہاتھ لگایا اور میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں قانون کا دروازہ کھٹکناؤں گی اور آپ پر قتل کا مقدمہ دائر کر دوں گی۔“

”ہوں!“ تو تیرے بھی پر نکل آئے ہیں۔ چونکی کی موت آتی ہے تو اس کے بھی پر نکل آتے ہیں۔“ توصیف نے دانت پیسنے ہوئے زہر اگلا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نازنین کی دھمکی کا کام نہیں ہے۔

”تو سمجھتی ہے کہ مجھے نیچا دکھا دے گی کالی ڈائن! مجھے دھمکی دیتی ہے، لیکن میں تجھے کبھی غمزدہ نہیں ہونے دوں گا یہ ٹھیک ہے کہ کسی لحاظ کی غلطی کی بنا پر مجھے یہ وقت دیکھنا پڑ رہا ہے لیکن اگر تیری اولاد تیری جیسی ہوئی تو میں اسی وقت تجھے طلاق دے دوں گا، کبھی! دوسری صورت میں آئندہ کبھی وہ غلطی نہ کرے گا جس کا خیال نہ مجھے اب بھگتنا پڑ رہا ہے بلکہ اس امکان سے بچنے کے لیے تجھے تیری ماں کے پاس پیشہ کے لیے بھیج دوں گا۔“ وہ نفرت آلود الفاظ کی کچھڑ نازنین پر اچھٹا رہا مگر نازنین لا تعلق بنی اپنا کام کرتی رہی۔

نہ جانے کیوں توصیف کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کے ہونے والی اولاد نازنین سے مشابہ ہوگی، غالباً اس کی وجہ مشابہ تھا، ”توصیف نے اکثر یہ دیکھا تھا کہ اولاد ماں کے عجب زیادہ تیری سے قبول کرتی ہے۔ نسبت خبیوں کے مثل! اگر ماں باپ میں سے ایک چھوٹے قد کا ہے تو اولاد بھی ٹائٹلے قد کی ہوگی اگر ایک با

صورت اور دوسرا خوبصورت ہے تو اولاد کے بد صورت ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔“ یقین آنے کے ساتھ ہی توصیف نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس صورت میں نازنین کو اسی وقت طلاق دیدے گا اور اگر بچہ خوبصورت ہو جائے جس کے امکانات برائے نام تھے تو بھی توصیف آئندہ کا خطرہ ٹالنے کے لیے نازنین کو ہمیشہ کے لیے افریقہ بھیج دے گا اس کی ماں کے پاس، وہ اپنے آپ پر بھی ہزار لعنت بھیج رہا تھا اس وقت کو کوس رہا تھا۔ جب اس نے پتا نہیں کیسے اور کیسے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا، یہ غلطی اس کی پہلی غلطی تھی اور وہ اس کو آخری غلطی بنانا چاہتا تھا، اس لیے کہ پہلی غلطی کا بھیا یک شرم اس کے سامنے تھا۔ وہ آنے والے وقت سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس کی راتوں کی نیندیں اڑ چکی تھیں، دن کا چین حرام ہو گیا تھا، وہ مرتبہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ دوسری طرف نازنین تھی جو ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہر طرح کے دوسوے سے پاک خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ آئے

اے مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ توصیف اس کا یہ اطمینان دیکھ کر اور بھی ہلکا ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے نازنین مسلسل اس کا مذاق اڑا رہی ہو اسے شکست خوردگی کا احساس لگتا ہے۔ وہ دیکھنے کے رہ جاتا۔

”حرامزادی! اپنی گھناؤنی شہیہ میری تقدیر پر منتقل کر کے کتنی خوش ہے! اپنی سیاتی کے داغ میرے ماتھے پر لگانا چاہتی ہے۔“

وہ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگتا۔ ”نازنین پھسل کر گر پڑے اور وہ لحد آنے سے پہلے ٹل جاتا۔ جس نے مستقل توصیف کو سولی پر ٹانگ رکھا تھا، لیکن اس کی ساری دعائیں بے اثر لگیں چونکہ یہ دعائیں نہیں بدو دعائیں تھیں اور اگر خدا بد دعائیں بھی قبول کرنے لگے تو شاید دنیا کا کوئی شخص بھی زندہ نہ رہتا! آخر وہ دن آن پہنچا۔

توصیف طلاق کے کاغذات تیار کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ ہسپتال پہنچا۔ پتہ نہیں آج اسے کیا ہو رہا تھا۔ عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی زبردستی دھڑکا رہا ہو۔ اسپتال کے بھانگ کو عبور کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ہاتھ ڈال کر طلاق کے کاغذات کو ٹوٹا اور بے اختیار مسکرا دیا۔ ”نازنین بیگم! تم اب بہت خوش ہو گی لیکن ابھی میں تمہاری فتح کو شکست میں تبدیل کر دوں گا۔ مجھ سے ٹکرا کر تم نے ہار لی! نہیں کیا۔“

تمام دشمنی اور بغض کے باوجود عجیب و غریب سی خواہش اس کے دل میں اٹھ اٹھائی لے رہی تھی۔ اسے اس احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔

”بہٹی مبارک ہو مسٹر۔“ نرس نے اطلاع دی اور کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ توصیف پر جیسے کسی نے گولی پانی ڈال دیا ”بہٹی!“ اس کے منہ سے ایک پھٹی ہوئی سانس نکلی، نفرت، بھاری گھبراہٹ اور مایوسی کا آمیزہ اس کے دماغ میں کھولنے لگا اسے شروع سے بیڑوں کی خواہش تھی۔ وہ اکثر اس سے کہا کرتا۔ ”ماں! دیکھ لکھے گا میرے نصیب میں بیٹے بہت ہیں، میرا دل کہتا ہے۔“

اللہ میاں کو شاید اس کا بیڑا لپین پسند نہیں آیا اس کو کسی کا بھی غور پسند نہیں آتا۔ ہر چند کہ توصیف دل میں سوچ چکا تھا کہ اسپتال کے کمرے میں داخل ہوتے ہی طلاق نامہ نازنین کے منہ پر دے مارے گا اور واپس آجائے گا پھر بھی بیٹی کی اطلاع نے اس کے دل پر کچھ کے سے لگا دیے

اس کا ذہن سن ہو چکا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوا، سفید شفاف چادر پر نازنین کا نحیف و زار بدن بکھرا ہوا تھا۔ کمزوری کے باعث اس کی کالی رنگت نیلاہٹ اور میلاہٹن لے ہوئے تھی۔ اس کے پاس ہی بہت سی کپڑوں میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز پڑی تھی یہی توصیف کی بیٹی تھی۔

توصیف کو دیکھ کر نازنین غمازت سے مسکراتی توصیف نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مرتبہ پھر طلال کے کاغذات منو لے۔

نازنین نے بغیر کچھ کے اپنی بیٹی کے منہ سے کپڑے کی آڑ بٹادی توصیف نے دیکھا۔ ایک کالی کلاں چھچھوڑا، نما چیز نازنین کے پہلو میں پڑی ہوئی ہاتھ پاؤں ہلا رہی تھی۔ اس کی شکل بھی بالکل ماں جیسی تھی۔ بیٹی رونے لگی اور اس نے ہاتھ پاؤں زور زور سے چلانے شروع کر دیے۔ توصیف اپنی جگہ بیٹھ کر اسے دیکھتا رہا اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان تھا مگر آنکھوں میں طوفان موجزن تھا، وہ تنہا کی بانڈ سے دیکھ رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل میں بہت ساری سوئیاں پیچھ گئی ہوں نہ جا سکیں کیا طوفان تھا؟ جو اس کے جسم و جان میں پھیر رہا تھا اس کے وجود میں غماضیں مار رہا تھا۔

بیٹی رو رہی تھی، ہاتھ مار رہی تھی۔

توصیف کو بچی کی ایزیاں اپنے دل کی بھر، سنگناخ زمین پر پڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے ایک اور کی جھڑپ لڑی یہ کیفیت بوجھتی چلی گئی۔

بیٹی کی ننھی ننھی کالی کالی ایزیاں لگا آتے توصیف کے دل پر پڑ رہی تھیں اور پھر..... اس کے دل میں پتھر لے میدان میں لڑا ایک چشمہ زم زم سا نال پڑا۔ یہ چشمہ محبت تھا، چشمہ شفقت تھا اور اسے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی بات نہیں ہے وہ بھی اسے نہ روک سکا۔

توصیف تیزی سے آگے بڑھا اس نے اپنے تھر تھرتھارے ہونٹ بچی کی پیشانی پر رکھ دیے اس کے اندر ہاتھ نے نازنین کے ہاتھ کو اپنی مضبوط اور گرم گرفت میں لے رکھا تھا اور پایاں ہاتھ جیب کے اندر اندر طلاق کے کاغذات کو مروٹنے میں مصروف تھا!



مستاکہ کے مومروں پر کھنکھی گئی سیکڑوں کبائیاں ہم سب نے پہنی تھیں
مگر آج تک سالہا کدیانی کا یہ پہلو نظر نہ سے ارجھلا رہا
مصطفیٰ کو تیز نگہوں نے اسے ڈھونڈ کر افسانے کے کھپ صورت قالب میں ڈھالا ہے

نئی عورت

”میں درست کہہ رہا ہوں۔ طوائف صرف طوائف ہوتی ہے عورت نہیں ہوتی۔“ میں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”کیوں بند کرو۔“ شیخ میز پر ماکار کر ڈالا۔ اس کی یہی عادت تھی ذرا سی دیر میں آپے سے باہر آ جاتا تھا اور اتنی ہی تیزی سے نارل بھی ہو جاتا کرتا تھا، پھر اپنے بے ہودہ رویے کی معافی مانگتا تھا۔

”یہ کیوں نہیں ہے۔ ذرا غور نہیں ہے۔“ میں نے اس کی پچھاڑ کا کوئی ٹوٹس نہیں لیا اور اپنے موقف پر اڑا رہا۔

”تم انتہائی جھوٹے اور لچر آدمی ہو۔“ اس کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ میں اطمینان سے بیٹھا پاؤں ہلاتا



رہا۔ اسے تاؤ کھینے۔

”آخر تم خود کو سمجھتے کیا ہو ارسلان۔ چند گھنٹیا سے افسانے لکھ کر یہ سمجھتے ہو کہ تم نے تمام تر مشاہدات اور تجربات کا سمندر گھول کر پی لیا ہے۔ افسانہ نگار تو دیسے بھی اول درجے کے بھوٹے ہوتے ہیں، تم اس معاملے میں سب کے باپ ہو۔“ اس کی چیخیں بڑھتی چلی جاتی تھیں اور میں یوں لائق بیٹھا تھا جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہی نہ ہو۔ میری اس اور اسے شیخ کا پارا مزید چڑھا دیا۔

”اپنے افسانوں میں پچھارہ ڈالنے کے لیے اور انھیں قابل اشاعت بنانے کے لیے تم لوگ صرف عورت ہی کو ہدف کیوں بناتے ہو، اگر بناتے ہو تو پھر اس کی مکمل تصویر کشی کیوں نہیں کرتے بلکہ کردار کشی کر دیتے ہو یہ سب جھوٹ ہے، دھوکا ہے تم سب کے سب جھوٹے ہو۔ عورت صرف عورت ہوتی ہے۔“

”تم درست کہتے ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں جھوٹا ہوں، ساری دنیا جھوٹی ہے اس لیے کہ زندہ رہنے کے لیے مسلسل جھوٹ کھانا پڑتا ہے، جھوٹ پینا پڑتا ہے اور جھوٹ ہی اگلتا پڑتا ہے۔ میں زندہ رہنے کے لیے جھوٹ بولتا ہوں، اگر کچ بولوں تو یقیناً پوچھا جاؤں مگر مرنے کے بعد۔ لوگ منصوبہ کر سولی پر لٹکا دیں گے یا سڑا لے کر زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیں گے۔۔۔ اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔“ میں سانس لینے کے لیے رکا۔ ”اس کے باوجود میرا تجربہ، میرا مشاہدہ اور انسانی مطالعہ تم سے کہیں زیادہ ہے، تم مانو یا نہ مانو۔“ میں اپنی بات مکمل کر کے لا پرواہی سے پیگ بنانے لگا۔

”نیکو اس۔ فضول۔ حماقت۔“

”شیخ خدا کیا کیا کیا اول فول بکتا رہا، میں نے توجہ نہیں دی۔ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے بھی وہ حد بے جذباتی اور ضدی رہا کرتا تھا۔ تین چار بیگ چڑھانے کے بعد اور چار چاند لگ جاتے تھے۔ وہ مجھ سے دیک گالیاں دیتا رہا۔ میں نے برا نہیں منایا، مجھے خبر تھی کہ وہ اپنے تمام تر عیوب کے باوجود میرا عزیز ترین اور نہر خواہ دوست ہے۔ پار سالوں ایک دوسرے کے اتنے رفیق نہیں ہوتے جتنا میں ان سے اپنے والے، ایک میز کے گرد بوجھائے والے اور ایک ساتھ کوشے کے چکر لگانے والے ہو کرتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ تھا۔ دوسرے دن وہ حسب معمول مجھ سے معذرت کرتے لگا۔

”یار ارسلان، برا تو نہیں مانا؟“

”کس بات کا؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”یار۔ کل کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی، شاید میں نے تمہیں بہت کچھ کہا۔ معاف کرنا میں نے ذہن

بالکل آؤٹ ہو جاتا ہے۔“

”غیر نشے کے تم کون سا ہوش میں رہتے ہو۔ میں تو قمیص مستقل نشے میں ہی سمجھتا ہوں، کبھی ماربل لی نہیں ہوتے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایسے بھڑک جاتے ہو اور ضد کرتے ہو کہ کیا کوئی بچہ کرے گا۔“

”گویا تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ وہ ہنسا۔ ”چلو! خوشی میں ہیرا بازار کا ٹکٹ لٹائیں۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، فوراً اٹھ گیا۔ ہم وہاں پہنچے تو ہیرا بازار روڈ شیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہ اسی بازار کا ذکر ہے جس کے دروازے رات کو کھلتے ہیں اور صبح بند ہو جاتے ہیں۔ قسم قسم کی صورتیں درجوں سے جھانک رہی تھیں، اشارے کر رہی تھیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، دونوں گھاگ تھے ہم نے ان حیناؤں کے اشاروں کی کوئی پروا نہ کی اور آہستہ آہستہ چلتے رہے۔

”کیا خیال ہے۔ حینہ کے پاس چلیں؟“ شیخ نے مہینے گھرے خریدتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں وہیں چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے عورتوں کے اس ریوڑ میں وہی کی قدر مختلف لگتی ہے۔“ میں نے ایک گجرا سو گھٹتے ہوئے جواب دیا۔ شیخ مسکرائے لگا۔

”تم افسانہ نگاروں کی یہ عادت بڑی بری ہوتی ہے، ہر چیز میں ناچن تلاش کرنے لگتے ہو۔ حینہ کے االا خانے پر صرف ایک مرتبہ گئے ہو اور اسی ایک ملاقات میں تم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔“

”دیکھو دیکھو کی بات ہے۔“ میں نے شائے اچکانے۔ ”پھر بھی تم کل میرے مشاہدے کے قائل نہیں اور رہتے تھے۔“

”معافی تو مانگ لی۔ اب بس کرو۔“ معین گزری ہوئی کل کے تذکرے پر شرمندہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

”تم یہ دھندا اچھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“ شیخ نے حینہ سے سوال کیا، اور میں نے اس سڑے ہوئے گیسے بچے سوال پر ہیرا ہر کمند دوسری طرف بھیر لیا۔

”یہ دھندا اچھوڑ کر کون کیا؟“ جواب صدیوں پرانا تھا۔

”پر دھکی ہو، ذہین ہو۔ کیا زندگی گزارنے کے لیے اتنا کافی نہیں؟“ شیخ بدستور اتقانہ سوالوں کی پلٹتی کھولے بیٹھا تھا۔

”نہیں۔“ حینہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مشکل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت اپنی

قابلیت اپنی ذہانت سے نہیں پہچانی جاتی، اپنے جسم سے پہچانی جاتی ہے۔ فرض کرو، اگر میں تمہاری سوسائٹی میں نکل بھی آؤں تو کیا ہوگا۔ جہاں بھی نوکری دھوڑنے جاؤں گی، مجھے نوپنے کے لیے لے لے لے ناخنوں والے ہاتھ بڑھتے رہیں گے۔ پھر..... کیا فائدہ اس سے تو بہتر میں ہیں۔ یہاں لوگ آتے ہیں تو میرے آگے جھکتے ہیں، میں یہاں سے باہر نکلی تو خود مجھے لوگوں کے آگے بھٹکانا پڑے گا۔ میں حینہ کی دور اندیشی کا قائل ہو گیا۔

”تم ایک بے وقوف عورت ہو۔“ حنیف بدستور محاذ پر ڈٹے رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے اس کی اس ضد پر غصہ آ رہا تھا۔ بھلا ایک معمولی سی طوائف سے اس قدر طویل مذاکرات کرنے کی اور اس کو ٹٹولنے کی کیا ضرورت تھی؟

”میں ہی نہیں۔ ساری عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا کہ ایک عام عورت طوائف کے مقابلے میں زیادہ ہی احمق ہوا کرتی ہے۔“ حینہ نے کوکہ جواب حنیف کو دیا تھا مگر خون میرا کھول اٹھا۔ دو لکے کی عورت سر پر چڑھی جارہی تھی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حنیف کو اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن اس نے میرے اشارے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ ایک عجیب و غریب سا سوال حینہ سے پوچھ ڈالا۔

”تم تو ساری دنیا سے بیزار معلوم ہوتی ہو۔ کیا تمہیں اس دنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی؟“

”لگتی ہے!“

”کیا؟“

”بچے، چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچے، ہنستے ہوئے، کھلاکھریاں مارتے ہوئے، کھٹکے چلتے ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ بڑے ہوتے ہوئے۔“

”واہ واہ۔“ حنیف کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ حینہ اور حنیف کے درمیان ایک قدر مشترک دریافت ہو چکی تھی اور وہ تھے بچے۔ چھوٹے بچے حنیف کی جان تھے۔ سڑک پر گزرتے ہوئے بھی کوئی بچہ پسند آجائے تو اسے بھی گود میں اٹھا کر پیار کرنا اپنا فرض سمجھتا اور بچے کے والدین کی ناگوار کی کے باوجود اپنے پسندیدہ بچے کو کچھ نہ کچھ تحائف ضرور دلا دے۔

”بچے تو سب کو پسند ہوتے ہیں اس لیے کہ بچوں کی آمد اس بات کا چاؤ دیتی ہے کہ ابھی خدا اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا، اگر کسی بدذوق کو بچے اور پھول پسند نہیں تو اس پر ہزار لعنت ہو۔“ منجمنے نے آخری جملہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے بدن تن میں آگ لگ گئی اور میں نے اپنے اختیار پر یوں اٹھا۔

”ہر وہ چیز اچھی لگتی ہے جو اپنے پاس نہ ہو۔ لیکن جب حاصل ہو جاتی ہے تو بڑی جلدی دل بھر جاتا ہے۔“

”تم تو خاموش ہی بیٹھے رہو کثیر الاولاد شخص۔“ مجھے ستانے میں حنیف کو مڑا آ رہا تھا۔ میں نے ہار نہیں لی۔

”جان من! مجھے بھی بچے بے حد پسند تھے لیکن جب میری پسندیدہ مجھے اولادیں مل کر اودھم مچاتی ہیں اور رات کو پولیس کی طرح روتی ہیں تو میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزرتی ہے اور..... تم بھی جان جاؤ گے کہ تم پر گزرنے لگی کبھی دور کے دھول کانوں کو بہت بھلے لگتے ہیں لیکن قریب سے سنو تو کانوں کے آگے لرز کر رہ جاتے ہیں۔“ حنیف ہنستا رہا اور حینہ سے گفتگو میں لگا رہا۔ ”جب تمہیں اپنے بچے ہی پسند ہیں تو تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“ حنیف کا یہ سوال بلاشبہ اس صدی کا فضول اور احمقانہ ترین سوال تھا۔ مجھے پھر غصہ آنے لگا مگر میں نے یہ سوچ کر صبر کیا کہ ضرور آج حنیف کو زیادہ چڑھ گئی ہے۔

”بچے تو بغیر شادی کے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں خصوصاً اس ماحول میں جہاں کی میں پیدا ہوا ہوں۔“ حینہ نے کبھی مجھے ہی ایسا فلسفیانہ جواب دیا کہ حنیف غصیل جھانکتے لگا۔

”تو پھر..... یہی سہی۔“ حنیف، حینہ کے اسی ایک جواب پر ہلکا چکا تھا اور اس کی ساری گفتگو مزاحیہ ٹوہنوں پر چلی تھی۔

”نہیں۔“ حینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں؟ تم دیے بھی دنیا سے بیزار ہو اور بچے بھی تمہیں بے حد اچھے لگتے ہیں، تمہارا ماحول بھی اس قسم کے حالات کے لیے سازگار ہے اس کے باوجود تمہیں انکار ہے۔“

”ہاں۔ اس کے باوجود مجھے انکار ہے اس لیے..... وہ رکی اور لمبی سانس لے کر کہنے لگی۔ ”اس لیے کہ یہاں بچے نہیں پیدا ہوتے، چھوٹے چھوٹے لڑال پیدا ہوتے ہیں، چھوٹی چھوٹی بھینٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔“ اس کا اوجہ اتنا تلخ تھا کہ مجھے بھی اپنا حلق کڑوا کڑوا سا محسوس ہونے لگا۔

”تو شادی کیوں نہیں کرتیں؟“ حنیف کے اس سوال کا بظاہر حینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے لاشہ ہنستی ہوئی اٹھی اور ہمیں تسخیرانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی اور فلک شکاف قہقہے لگاتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ حنیف مجھے حیرت سے تنکرا رہا۔ میں شرمندہ ہو گیا اس لیے کہ میں جانتا تھا حینہ کے گلے سے بلند ہونے والے یہ قہقہے، قہقہے نہیں ہیں بلکہ نفرت اور ہلکا بھرا تھوک ہے جو اس نے ہم دونوں کے چہروں کو تمام انسانیت کا چہرہ سمجھتے ہوئے ہم پر اگلا دیا تھا۔

ہے۔ شاید ہیغم بھی یہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔

تقریباً تین دن تک میری اور ہیغم کی ملاقات نہ ہو سکی پھر ایک روز ہم نے تو اس نے ہم کا دمھا کر کہا
”میں حسینہ سے شادی کر رہا ہوں۔“

”آج ایک ہی بیگ میں آؤٹ ہو گئے۔“ میں نے حسب معمول لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں۔ آج تو میں صحیح معنوں میں ان ہوں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ مجھے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

”پاگل ہو گئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر۔“

”ہر وہ شخص جو شادی کرنا چاہے پاگل ہوتا ہے؟“ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

”جس قسم کی شادی تم کر رہے ہو وہ پاگل پن نہیں تو یہ پاگل ہونے کا ثبوت ضرور ہے۔“

”میں سمجھ لو۔“ اس نے سنجیدی سے کہا۔

”گویا تمہارا فیصلہ اٹل ہے۔“

”ہاں۔“ اس کا یہ ایک لفظ کی چٹانوں پر بھاری تھا۔

”پھر سوچ لو۔ اس قسم کی فضولیات تمہارے علاوہ بھی بے شمار کرچکے ہیں اور بعد میں اپنے نصیبوں کو
روتے رہے۔“

”میں اپنے نصیبوں کو نہیں روؤں گا۔“

مجھے اپنے دوست کو جانتے ہوئے بتانی کے عار میں گرتے دیکھ کر دکھ ہوا۔

”اگر بعد میں پچھتاوے تو؟“

”تم سے مدد یا مشورہ لینے نہیں آؤں گا۔“ مجھے ہیغم کے جیسے جوابوں پر غصے کی بجائے رحم آرہا تھا

میں نے آخری پاپھینکا۔

”تمہارے ماں باپ رضامند ہو جائیں گے؟“

”وہ رضامند ہو چکے ہیں۔“ یہ فقرہ مجھ پر بجلی بن کر گرا۔ اور میں چند لمحوں کے لیے سکتے میں رہ گیا۔

”حسینہ کی حقیقت معلوم ہے انھیں۔“ میں نے مرل سی آواز میں پوچھا

”ہوں۔“ اس نے انہایت میں سر ہلادیا۔

”اس کے باوجود؟“

”ہاں۔ اس کے باوجود۔“

اب مجھ میں کچھ کرنے کا یار نہ تھا اور نہ ہی کچھ کرنے کی تمنا بکس باقی رہ گئی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا

باربا۔ ہم دونوں پر سکوت طاری تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا اور میں اپنے خیالات میں۔

”اگلے جیسے کو آ رہے ہو تا میری شادی میں؟“ اس نے سکوت توڑ دیا اور ساتھ ساتھ میرا دل بھی۔

”کو شش کروں گا۔“ میں نے ہنسل کہا۔

”اپنی کوشش میں کامیاب ہو جانا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”پوچھو۔“ وہ رک گیا۔

”ایسا دنیا بھر میں تمہارے لیے صرف حسینہ ہی رہ گئی تھی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے الفاظ میں

اٹ گئی۔ وہ مسکرائے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتمندی تھی، غرور تھا۔ پھر اس نے ہماری آواز میں

کہا۔

”اگرچہ بڑا مغفیل لفظ ہے مگر میں کہوں گا ضرور۔ وہ یہ کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔“

”کیوں، کیسے؟ اسی سے کیوں کسی اور سے کیوں نہیں۔“ میں نے جرح کرتی شروع کر دی۔

”محبت اور نفرت کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”دونوں کیس بھی کسی

بھی اور کیس پر بھی ہو سکتی ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے ہو سکتی ہے۔ سمجھے۔“ وہ لمبے لمبے دگ بھرتا ہوا چلا

کہا۔

☆☆☆☆☆

ہیغم کی شادی ہو گئی نہ درمیان میں سانج آیا، نہ نائمہ آنی اور نہ ہی ہیغم کے والدین۔ شادی

اور نہ ہی انجام پائی۔ ہیغم کے ماں باپ نے بلا کسی تیل و جھت کے حسینہ کو بطور ہو قبول کر لیا۔ غرض

کہانی ایسی بات نہ ہوئی جو ہونا چاہیے تھی مجھے اس صورتحال سے بالواسی ہوئی، میں کسی ایسے معجزے کا

ظہر تھا جو یہ شادی رکاوٹ دے۔ میرا دوست آنکھوں دیکھی مکھی نگل رہا تھا اور میں خاموشی سے کڑھنے پر

اور تھا۔ اس لیے کہ کڑھنا ہی میرے اختیار میں تھا۔ کوئی معجزہ ظہور پذیر نہ ہوا، کوئی کڑبڑ نہیں ہوئی اور تو

اور نکاح کے وقت مہر کا جھگڑا بھی چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ ہیغم اور حسینہ ایک عام سی زندگی گزارنے

لگے جیسا کہ عموماً شادی شدہ لوگ گزارتے ہیں۔ ہیغم اب بھی مجھ سے اکثر ملا کرتا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا

میں اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کوئی ایسی بات نہ کرید سکا جو میاں بیوی کے درمیان ناگواریاں یا ناچاقی

کا باعث ہو۔ میرے تمام اندازے تمام مشاہدے باطل ثابت ہوئے تھے، ایک طوائف، عام عورت کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ کوئی حینہ کو دکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی طوائف بھی رہ چکی ہے، بار بار دیکھنے کے باوجود وہ ایک عام سی، پرانی سی عورت لگتی، دیکھی ہی نابل عورت جو کہ شریفوں کی سوسائٹی میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ میں ضیغے سے اکثر ہوجھا کرتا۔ ”زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“ تو وہ مسرت سے گلگلتا۔ ”بہت خوبصورت، پہلے سے زیادہ حسین۔“

میں خاموش ہو جاتا۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے تنگ آکر یہ سوال طیف سے پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ طیف کی شادی کو دو سال گزر گئے۔ وہ اب بھی کبھی کہتا۔ ”یار میری ساری حسرتیں پوری ہو گئی ہیں بس اولاد کی کمی ہے، خدا کرے یہ بھی جلد پوری ہو جائے۔“

پھر ایک روز اچانک میرے مٹانسز آرڈر آ گئے، مجھے کراچی چھوڑ کر لاہور جانا تھا۔ میں سب لوگوں سے ملا غم نہ بھی میری الدعا کی، اور ایشین کرکٹ کونسل کے ہونے آہستہ سے ہوا۔

”اسلامان - میری طرف سے داتا دیوبند پر منت مان لیتا“ سنا ہے وہاں سب کی حرا دیں پوری ہوتی ہیں۔“

”کیسی منت؟“ میں چونکا۔

”اولاد کی دعا کرتا میرے لیے۔“ اس کی آواز میں بے شمار سسکیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے حینہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں برس رہی تھیں اور وہ نادانستی میں اپنی ہتیلیاں مسل رہی تھی۔

”ہاں لوگ نمانت؟“ ضیغم نے اٹھ کھڑی تو جیسے کسی نے میرے قلع میں ٹھک بھردیا۔ شاید میں آنسو بہا تھا۔ ضیغم جو کبھی مجبور نہیں ہوا تھا، کبھی نہیں ہارا تھا، آج کتنی بے کسی کے اٹھا کر رہا تھا۔ اپنے دوست کے حالات، مجھ سے دیکھنی نہ گئی اور میں نہ پھر کر ٹرن میں سوار ہو گیا۔

میں لاہور گیا۔ شروع شروع میں چند ماہ خیمہ سے اور دیگر پرانے دوستوں سے جو کراچی میں تھے، خدا کو ثابت باقاعدگی سے جاری رہی۔ لیکن پھر آنکھ اور جبل بھاڑا، جو بھل کے محاورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اور فرصت کی کمی کے باعث یہ سلسلہ کم ہوتے ہوئے بالکل ختم ہو گیا۔ میں تو ویسے ہی خدا کھینے کا چور ہوں، کسی کو کیا غرض تھی کہ بغیر کسی جواب کے میری خیریت دریافت کرتا پھر اتنا البتہ کبھی بھار خیمہ کا مختصر سا خط ضرور آجایا کرتا تھا جس میں اس کی اور حسینہ کی خبریت کے ساتھ ہی داؤد آریا پر موت ماننے کی تاکید بھی ہوتی۔ میں خیمہ کی تاکید پر عمل کرتا رہا۔ منشی ماترا با پھر شاید خیمہ صاحب اولاد ہو گیا یا پھر منشیوں اور نوکروں سے اس کا اعتماد جو لایا ہی اٹھ گیا کہ کبہ کہ اب اس کے خدا آئندہ ہو چکے تھے۔ مجھے خدا

کابٹ ختم ہو جانے پر نہ حیرت ہوئی اور نہ افسوس اس لیے کہ میں نے اس کے بیسیوں خطوط کے جواب میں بھگنل چار یا پانچ خط لکھے تھے۔ دس برس تیزی سے گزر گئے۔ اس عرصے میں میرا سرور میاں سے گھٹیا ہو گیا اور گالوں پر واٹھی بونہی گئی۔ ان تمام تبدیلیوں کے باوجود جب خیر نم نے مجھے مزنگ پتگی کے چرے پر رکھا تو فوراً پہچان لیا۔ وہ بھی بہت بدل چکا تھا۔ اس کی قلبیں بھوری بھوری سی ہو گئی تھیں اور توند یا ہر نکل آئی تھی اور اس کے سدا مسکراتے چہرے پر مجھ سے بھی زیادہ غلٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ غالباً جو لوگ جوانی میں بہت زیادہ مسکراتے اور قہقہے لگاتے ہیں ان کے چروں پر نسبتاً زیادہ غلٹیں پائی جاتی ہیں شاید اس لیے کہ ان کے چہرے مسلسل دراڑوں کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں خواہ مسکرا ہٹ ہی لارہے۔

”تم لاہور کب آئے؟“ میں نے اسے اچھی طرح پہنچ لینے کے بعد پوچھا۔

”پندرہ بیس دن ہو گئے۔“

"اور مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔" اس بات کے جواب میں وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا تو میں خود بخود فرمندی ہو گیا اور اوجھڑ مٹانے کے لیے جلدی سے بولا۔ "میرے کرنے آئے ہو یا کوئی کام ہے؟"

"اب میں مستقل میں رہوں گا۔" اس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

”حیرت ہے۔ کراچی چھوڑ کر یہاں رہو گے حالانکہ تمہیں تو نوکری کی بھی ایسی کوئی مجبوری نہیں، اپنا بس ہے۔ پھر کراچی کو کیسے چھوڑ سکو گے؟“

”میں اب بہت اکتا چکا ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا، میرے کان کھڑے ہو گئے اور دل میں انجانے لہروں کی دھمک ہونے لگی۔

”حسینہ کیسی ہیں؟“ میں نے اپنے وسوسوں کی تصدیق کے لیے پوچھا۔

”ٹھیک ہے میرے ساتھ آئی ہے۔“ اس نے مطمئن لہجے میں کہا اور مجھ پر اوس پڑ گئی۔

”کیسی گزری ہے؟“ میں نے مزید کریدنے کی کوشش کی۔ جواب میں وہ ایک کرب انگیز ہنسی ہنس

سوال تو جوان لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں تو سب کی کسی نہ کسی طرح گزر رہی ہوئی

میں چپ ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے اپنا ہاتھ دیا، میرا پتہ لیا اور گھر آنے کی تاکید کرتا: "واحد! گیا۔ اس کے
 اندر میں ایک دفعہ اس کے گھر گیا۔ میں نے حسینہ کو دیکھا، اس کا جسم اب بھی جی حد بچکڑا تھا اور آواز میں

رس گھلا ہوا تھا اور آنکھوں میں چمک بھی باقی تھی جب کہ سر کے بال کھجوری ہو چکے تھے۔ میں نے ادا لگا لیا کہ اگرچہ دونوں میاں بیوی میں اب بھی بہت محبت ہے پھر بھی ان دونوں کے مزاج میں چھڑاؤ وٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور میرا خیال یہی تھا کہ یہ بیزاری اور جھگڑا ٹھٹھا بے اولاد ہونے کی وجہ سے پیچھے تو بڑی حد تک سنبھل گیا اور کچھ کچھ تو فلی سا ہو گیا۔ گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا۔ کئی کئی دن سکرانے پر پہنچ کر ادا کو بھی ایسی بے گلی باتیں کرنا کہ مجھے اس کے صحیح الدماغ ہونے پر شبہ ہونے لگتا۔ بچوں کا پیغمبر کے ساتھ میرا وقت گزر گیا، میرا مطالعہ بھی مکمل ہو گیا اور ادا ایک موقع پر مجھے پورا یقین ہو گیا کہ پیغمبر کے بے وفائی اور حسد کی زندگی سے بیزار ہونے کا سبب محض اولاد سے محرومی ہے اور اسی کی وجہ سے محرومی نے دونوں کو شدید ذہنی دباؤ کا مریض بنا دیا ہے۔ دونوں شادی سے پہلے ہی بچوں کے عاشق اور ادا کے خواہشمند تھے اور یہی قدر مشترک تھی جس نے پیغمبر حسد کی محبت اور اس کے بعد شادی میں کردار ادا کیا تھا۔ مجھے اپنے دوست کی تباہ حالی پر بہت افسوس ہوا ساتھ ہی ساتھ حسد پر غصہ بھی اس جاتی کی جزئینہ ہی تھی اور اسی وجہ سے آج پیغمبر نوٹ کر رہ گیا تھا اور اس دن تو پیغمبر کی حالیہ کمر میرے آنسو بے اختیار نکل پڑے جب میں نے اس سے کہا۔

”آؤ۔ آج داتا دربار چلتے ہیں۔“
”کس لیے؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

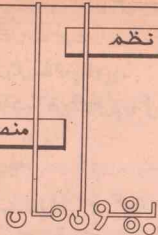
”کس لیے؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”وہاں جا کر اولاد کے لیے دعا کرنا“ انشاء اللہ قبول ہوگی اور تمہارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ بے تکلف بھڑک اٹھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی اس نے زمین پر مار دی۔

”میں خانہ کعبہ جا کر دعا مانگ چکا ہوں سمجھے۔“ وہ ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اس کا ہر ہر لفظ تیرا تھا جو میرے کیلیے میں کھب گیا اور لمحہ اتنی مایوسی لیے ہوئے تھا کہ میری آنکھوں کے گوشے پر بھیجے مجھے شدت سے حسینہ پر غصہ آنے لگا اور میرا جی چاہا کہ اسے جا کر گولی مار دوں اگر وہ ذرا سی تیرا اور ہیغی کی دوسری شادی ہو جائے تو اس کی حسرت پوری ہو جائے گی۔ لیکن شاید وہ اتنی ایثار پسند ہے جیسی ہیغیم آج تک بے اولاد ہے۔ میں نے ایک خالص اور روحانی انداز میں سوچتے ہوئے تمام کام مقصود حسینہ پر رکھ دیا۔ میں تیری سے اٹھا اور ہیغیم کے گھر چل دیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ آج حسینہ صاف صاف بات کر کے ہیغیم کو اور خود حسینہ کو اس پر نرغہ سے نجات دلاؤں گا۔ تھکنے کے جواب میں فوٹو نکل کر آئی اور مجھے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہ مجھے حرا، لگا رہا، تم، جانی

نظم

منصورة أحمد



انجانے میں شاید مجھ سے ہی

کچھ ایسی بھول ہوئی ہے

دودھ بلوٹی ماں کی آنکھیں

تو آقا کیوں رہی ہیں

ماں کہتی ہے

دعوتِ نولو

حصہ ٹے حصہ ٹے قدم اٹھاؤ

آوازوں کی گونج دھمک سے

قرمہا کی لوجھا رہی تھی۔

دائماً رہا، رہا، رہا، رہا

دل داغ، ہمہ رکس، جنگل، رات، اتری ہے

گو کہ چہ کہو : ادنیٰ ہو

میری پڑھت اور لکھت ہے

اعمالی و اسطوپ بی روی

میں کو سائیہ اے۔ جس ہے

اس نے اپنی ماں سے
جتنی بھی باتیں کہیں

جیسے دھڑلے بند پائے کے

پتے پتے جیل جہاں ہے بے سوس

ہیں ان۔ پ سے بیوں یا ہ

یہی وہی سید سیما ہے

آل-ع-درے



نام کے آگے پڑاتے ہوئے منظر کے قریب
 ایک خورشید نکلتا ہے مریے گھر کے قریب
 وہ کہ عمو سے بعضی دور کہ نسبت بھی نہیں
 گھر نہ ملے آئے ہیں مریے گھر کے قریب
 ایک کراپ ایک بچہ جاتا ہے ان اکھن میں
 ایک بال پھول محبت لیتا ہوں بستر کے قریب
 کہ وہ جیگان سے کیا کاسم کریں جاتا ہوں
 ایک داسی ملاقات کو مندر کے قریب
 ایک اکھن کا فخر کہ تو نہیں ہے جہاں
 میری تیرہ جوں جوں جاذب کبھی ساغر کے قریب
 آئے اس کو بچنے سے بچا اور عاصم
 وہ اب گاہ پیٹنے کو ہے اس گھر کے قریب

1990

مجھے اس وقت اس طوائف زادی کی شکل بہت زیادہ کرمہ لگی، وہ مجھے ایک ایسی ڈائن محسوس ہوئی کہ اپنے لیے لے جانے والی تھیں۔ میرے دوست کے جسم کو اور اس کی روح کو رفتہ رفتہ کھا رہی ہو۔ میرا خون کھولے لگا۔ ہشکل میں نے خود پر قابو پایا۔

”آپ۔ اس وقت۔“ وہ پوچھتے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہاں۔“

”نیرت تو ہے؟“

”یہ تم اپنے آپ سے پوچھو۔“ میں تلخ ہو گیا تھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ واقعی کچھ نہیں سمجھی تھی۔

”میں تمہیں وہی کچھ سمجھانے آیا ہوں جو اب تک تم نہیں سمجھ سکی ہو۔ خود غرض عورت۔“ میرے

لفظوں نے اسے بھونچکا کر دیا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”وہی جو تم سن رہی ہو۔“ میں نے بے رحمی سے کہا اور اس کے بعد مزید تمہید میں وقت ضائع کرنا

مناسب نہ سمجھا۔ ”ہیغم کی حالت دیکھ رہی ہو، اس کے پاگل ہونے میں ذرا سی کسر رہ گئی ہے۔“ وہ

خفیف سی ہو کر صوفے کے ایک کونے میں سڑک کر بیٹھ گئی۔ ”میں کتابا ہاں۔“ اور اس کی وجہ صرف اور صرف

اولاد سے محرومی ہے سمجھیں تم! اسے بچہ کتنے پسند ہیں اور تمہیں بھی۔ خدا کے واسطے میرے دوست تم

رحم کرو اگر تم اس کے بچوں کی ماں بننے کے قابل نہیں ہو تو اسے دوسری شادی کرنے دو، بچوں کو تمہارا

بھی برسوں کا شوق پورا ہو جائے گا۔ ورنہ..... ورنہ یقین کرو، وہ دیوانہ ہو جائے گا، مر جائے گا، اس نے

تمہیں گندگی سے نکالا ہے، اسی احسان کا بدلہ چکا دو۔“ میں نے اپنی تقریر کا رد عمل دیکھنے کے لیے حید

کے چہرے پر نظر ڈالی اور وہاں پر لاناہنی سکون دیکھ کر کم صبر رہ گیا۔ وہ بڑی متانت سے بولی۔

”میں تو ان سے خود کئی بار یہ کہہ چکی ہوں۔ وہ مانتے ہی نہیں۔“

”کیوں؟ وہ کیوں نہیں مانتا۔“ میں نے سٹپا کر پوچھا۔ حینہ کا یہ جواب میرے وہم و گمان میں بھی نہ

تھا۔

”ہں۔“ وہ شرانے لگی۔ ”وہ کہتے ہیں کہ مجھے صرف تم سے محبت ہے اور محبت، محبت ہوتی ہے۔“

ضرورت نہیں اور ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔“

میں ڈھیلا پڑ گیا اور میرے دہکتے ہوئے اعصاب میں برف سی بھر گئی۔ ”مگر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی وہ

روحانی ڈاک کے قارئین متوجہ ہوں

دوشیزہ ڈائجسٹ کے قارئین ”روحانی ڈاک“ کے عنوان سے اپنے خطوط ارسال کیا کرتے تھے جن کے

اہم بات بابا سید شان احمد صاحب دیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے باعث یہ سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔ اسی

ادارے سے ”چچی کمانیاں“ بھی شائع ہوتا ہے جس میں ”مسئلہ یہ ہے“ کے عنوان سے قارئین کے مسائل

کا جواب دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ ”چچی کمانیاں“ میں مندرجہ ذیل پتے پر ارسال

کر سکتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے

ماہنامہ چچی کمانیاں

۱۰۸۔ آدم آرکیڈ سہیلڈ روڈ۔ کراچی

ضروری نوٹ..... اپنے مسئلے کے ساتھ جوابی لفافہ ارسال نہ کریں، براہ راست جواب نہیں دیا جاتا۔

مسئلے کا حل ”چچی کمانیاں“ میں شائع کیا جائے گا۔

(ادارہ)

اولاد کے لیے دوسری شادی کر لے اور تم سے بدستور محبت کرتا رہے اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دونوں

معاہدہ صل ہو جائیں گے۔ حالات عجیب موثر اختیار کر چکے تھے، میں خود اپنی ہی ملامت کا نشانہ بن رہا

تھا اور حینہ صاف بچ گئی تھی۔

”وہ نہیں مانتے ان کا خیال ہے کہ اس اقدام سے مجھے تکلیف پہنچے گی، عورت کتنی ہی دیریا دل ہو،“

میں برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ یہی کہتے ہیں گو کہ میں ایسا نہیں سوچتی اور کئی بار انہیں یقین دلا چکی

ہوں۔“

”اچھا۔“ میں نے کئی لمبی لمبی سانسیں بھریں اور پھر بولا۔ ”تم لوگوں کی ذہنی حالت تو خود تم دونوں سے

بھی پوشیدہ نہیں ہوگی؟

اس کے جواب میں حسینہ کچھ نہیں بولی، خاموشی سے سر جھکا کر دوپٹے کا کونا مسلنے لگی گویا اسے اس بات کا اقرار تھا۔ میرا سارا غصہ جو حسینہ کے لیے مختص تھا خدا جانے اب کہاں چھپ کر بیٹھ گیا تھا بلکہ اب تو مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میری کیفیت عجیب بیچارگی کی سی تھی، کئی منٹ میں کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔ کمرے میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ حسینہ سر جھکائے بیٹھی۔ جیسے اپنے بانجھ پن پر شرمندہ ہو۔ مجھے تسلی دینے کے لیے بھی الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد میرے منہ سے نکلا۔ ”کوششیں تو کی جاسکتی ہیں اور ضیغم کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ جدوجہد کر سکے۔ اب تو سائنس دانوں نے شیشے کی نلیوں میں بچے تیار کرنا شروع کر دیے ہیں، بانجھ پن کا علاج دریافت کر لیا ہے پھر۔۔۔۔“

”چپ ہو جائیے۔“ وہ اچانک چیخنی اور میں گھبرا گیا۔۔۔ یہ نئی چویشن قطعی غیر متوقع تھی۔ ”میں بانجھ نہیں ہوں۔“ اور اب میں اس کے چیخنے کی وجہ جان گیا۔ کسی بھی عورت کے لیے بانجھ ہونے سے زیادہ بڑی کوئی گالی نہیں۔

”تو کیا ضیغم۔۔۔“ میرا سر جھک گیا۔

”نہیں۔“ اس کی آواز اب بھی بہت بلند تھی۔ ”آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“ وہ خاموش ہو کر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی اور میں اس کے کچھ بولنے کا انتظار کرنے لگا بہتہ تن گوش ہو گیا۔

”کوئی بھی ڈاکٹر کوئی بھی سائنس داں کسی عورت کی مرضی کے بغیر اسے ماں نہیں بنا سکتا۔“ حسینہ کے الفاظ آگ کی لہریں کر میرے کانوں میں داخل ہوئے اور سارے جسم میں پھیل گئے۔ میرا بدن سنسنانے لگا، انگلیاں جلنے لگیں اور حلق سوکھ گیا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں اپنی کمزور آواز کو خود بھی نہ پہچان سکا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ میں غصے کے کڑھاؤ میں کھولنے لگا۔

”ضیغم کو یہ بات معلوم ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”وہ اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہیں۔“

”مگر یہ جاننے کے باوجود کہ تمہاری اور ضیغم کی بیمار روح کا علاج صرف اولاد ہے، اس سے پرہیز کیوں؟“ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس طوائف زادی کی بوئیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں۔ میرے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا روتی رہی۔ میرا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔

”مدا جوان رہنے کا اچھا نسخہ ایجاد کیا ہے تم نے۔ خواہ اس کے لیے میرا دوست پاگل ہو جائے“
 ”میرے آنکھوں کے آگے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے۔“ وہ ہنکیاں لینے لگی۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا مزید کچھ نہ بول سکا۔ وہ خود ہی بولی۔ ”کوئی ماں اپنی اولاد میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھ سکتی چاہے اولاد ابھی پیدا بھی نہ ہوئی ہو اور میں اسی لیے ماں نہیں بننا چاہتی۔“ وہ رک کر دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی۔ ”میں اپنی اوقات نہیں بھولی ہوں ارسلان صاحب۔ ہیغم لاکھ معزز سی، میں تو طوائف زادی ہوں۔ ہر پینتہ ہماری اولاد کی ولایت پر ہیغم کا نام ہو گا لیکن اس کے باوجود دنیا اسے رتڑی پچھ کے گی، کے گی نہیں تو سمجھے گی ضرور۔ اور اس میں کیا غلط ہے مگر اس کے باوجود ایک ماں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے جگر گوشے زمانے کی نظروں میں ہمیشہ غیر معتبر رہیں۔ یہ کوئی ابھی ہوئی بات نہیں ہے ارسلان صاحب! روز مروی زندگی میں آپ کو ایسی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ لہذا میں نے اپنی مٹا کی قربانی دے دی، ان ہاتھوں کو ہمیشہ کے لیے سن کر یا جو کسی ختمے سے وجود کو تھکنے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ مجھے کوئی حلق نہیں ہے دنیا میں اگر لوگوں کے ذہریلے ذک کھانے سے بہتر ہے کہ وہ بیچ دنیا میں ہی نہ آئیں۔ میں اپنی قربانی پر ثابت قدم رہوں گی خواہ مقام مرگ تک ہی کیوں نہ پہنچ جاؤں۔“ اس کے لہجے میں عزم ٹپک رہا تھا۔ میرے سامنے ایک نئی عورت کھڑی تھی۔ ایک قابل احترام اور قابل تعظیم عورت۔ میں اس عظیم بانجھ ماں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ میری نظریں اپنے پاؤں پر گڑی ہوئی تھیں۔ میرا سر اتنا وزنی ہو چکا تھا کہ گردن جھک گئی تھی۔ ”تو پھر تم نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے ہیغم سے شادی کیوں کی تھی؟“ میں نے آخری سوال پوچھا۔ چٹان کی مانند کھڑی ہوئی حسینہ تباہ شدہ مکان کے لیے کی مانند صوفے پر گر پڑی۔ پھر میں نے بانجھ مٹا کی ٹوٹی ٹوٹی شکست خوردہ آواز سنی۔

”وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اور..... اور..... میں بھی، پھر مجھے بھی تو پاکیزہ زندگی گزارنے کا حق ہے۔“

میرے کان بند ہو گئے۔۔۔



عید کے دن وہ داماد کر گئے، نگا سکا

گرا فٹ تلے دیے عید کے خرباز تیرا فٹے سا گتے تیرے

مصنف کا نام رحمہ

سفیرِ روش

میں کچھ خبر بھی ہے، عید آنے والی ہے۔“

والی کی بات دار آواز پر شیدے پہلوان نے چونک کر سر اٹھایا۔ انھیں پر دونوں کا حساب کیا اور بے

الان بولا۔ ”ابھی تو تقریباً ڈھائی تین مہینے بڑے ہیں عید میں۔“

اس حال آنے کی توسی۔ ”بانو کی ماں بحث پر تلی ہوئی تھی۔“

”دو“ ہر سال ہی آتی ہے۔ اس مرتبہ تمہیں عید کے آنے پر اتنا اعتراض کیوں ہے؟“ شیدا پہلوان

الان رحمہ پیشا۔

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ میں تو تمہیں یاد دلا رہی تھی کہ عید قریب ہے اور اس پار انتظام ہی کرنا پڑے گا۔ بعد میں نہ کہنا کہ عین وقت پر بتایا۔“

”کیسا انتظام؟“ شیدا کچھ نہ سمجھا۔

”ارے پیوں کا انتظام اور کیا انتظام۔ زندگی بھر جو کچھ کشتیوں سے کمایا وہ تو تم نے اپنے پیٹ میں اتار لیا۔ یہ کبھی نہ سوچا جیسا جو ان ہوگئی تو کیا ہو گا۔ اس کے بیاہ کے لیے حسب حیثیت سے آگے۔ کسی نے جج کہا ہے کہ پهلوان کے دماغ پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ تمہیں اپنی ڈنڈ ڈنڈ فرصت ملتی تو کچھ اور بھی چربی بھرے دماغ میں آتا۔“ بانو کی ماں نے شیدے کے تن بدن میں آٹا وہ جھک کر گر جا۔

”ایک تو تمہاری اس قسم کی باتوں نے میرا ناغہ بند کر دیا ہے۔ جب دیکھو جلی کئی جب دیکھو میں کیا کروں۔ کہاں سے لاؤں پیسا؟ زندگی میں صرف پهلوانی سیکھی تھی اس سے بھتا کچھ کرنا اب جب کہ رنڈاز ہو چکا ہوں تو کیا کروں مجھے کبھی نہیں آتا۔“ پھر رک کر مزید تلخ لہجے میں بولا۔

”نہیں ہونا کہ تیرا شوہر جیپٹن رنڈاز ہوا۔ عمر بھر تیرا دل دھل لڑے اور کسی ایک میں بھی ناقابل تخیر رہا۔ تو کیا جانے بڑے بڑے پهلوان اب بھی میرے نام سے کاٹتے ہیں۔ حالانکہ وہ رنڈاز ہو چکا ہوں اکھاڑوں اور رگوں میں ابھی میری دھوم ہے اور عوام مجھے بھولے نہیں۔“

”ہونہ۔“ بانو کی ماں زرب لب کچھ بڑبڑانے لگی۔

”یہ اتنے سارے کپ تھے؟“ انعام۔ تجھے یہ سب دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی؟“

”ہوتی ہے بہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب تھے اور انعامات دے کیا سکے ہیں؟ رنڈاز تو تم ہوئی آتمی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ عید پر کیا ہو گا؟“

”بھئی اچھا خاصا گزارا چل رہا ہے۔ اگر میرا بھائی بزنس کے ہمانے میرے دولاکھ روپے پر جاتا تو گزارا اور بھی اچھا چل رہا ہوتا۔ بہر حال اب بھی کیا رہا ہے۔ سفید پوشی تو قائم ہے اور عید پر کیا مسئلہ ہے؟“

”بانو کی سرال کو بھول گئے۔“ اس نے اپنی آواز فوراً دھبی کر لی۔

”ہونے والی سرال کو۔“ شیدے نے بات کاٹ دی۔

”ہاں ہاں۔“ وہ جھلا گئی۔ ”رشتہ طے ہونے کے بعد یہ پہلی عید ہے کپڑے اور عیدی بھرا ضروری ہو گا۔“

شیدا پہلوان اب صرف شیدا رہ گیا تھا۔ پہلوانی سے دو سال قبل رشتاڑ ہو چکا تھا۔ جب تک رنگ رہا اس نے کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ اس کے دستبردار ہوتے ہی اندھا دیر ساقی میزنگ لڑ گئے تھے۔ وہی میزنگ جو کل تک اس کے پاؤں تلے آکر دو بار اٹھنا بھول جاتے تھے۔ اب اس کے منٹ کے بعد بڑے بڑے خطایات و القابات اپنے نام کے ساتھ لگائے اکھاڑے کے بادشاہ بن رہے تھے۔ اکھاڑہ چھوڑنے ہی قسمت نے بھی شیدے کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جب تک عروج پر رہا دولہا کھلتا رہا۔ عرش سے فرش پر آیا تو خود بھی مشت خاک بن کر ٹھکڑا گیا۔ عمر بھر پیسے کو پتنگ کی طرح اڑاتا تھا۔ پہلوانی ترک کی تو کل جمع پونجی دو لاکھ روپے تھی جو اس نے بھائی کے بزنس میں لگا دی، لیکن ساری دولت سمیٹ کر کا دیار بند کر کے اچانک ملک سے باہر بھاگ گیا تھا۔

اب شیدے کے پاس صرف ایک مکان تھا۔ یہ مکان بھی اچھے وقت میں بن گیا تھا اور چونکہ وقت میں بنا تھا اس لیے آرائش اور زیبائش میں اپنی مثال آپ تھا۔ دنیا کو کیا خبر کہ اس قیمتی ٹکڑے بایں وال روٹی پر عمر گزار رہے ہیں۔ بہترین غذائیں کھاتے والے اور شیدا وال سبزی کھاتے آتا ہوا شروع شروع میں تو اس سے یہ سب کھایا ہی نہیں گیا۔ اسے حلی ہی ہونے لگتی تھی، پیٹ خالی خالی لگا اور ستوں میں مل پڑنے لگتے تھے پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ ان پاؤں کا عادی ہونا چلا گیا۔ مکان کے شیدے کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی تھا اور یہی ٹکڑا وال روٹی کا سبب تھا۔

سب کچھ ہو چکا تھا مگر شیدے کی دھاک باقی تھی۔ لوگ اکھاڑے میں اس کی مثالیں دیا کرتے تھے اس کے ایک ایک داؤ کو یاد کرتے اور گھنٹوں بحث کرتے۔ شیدا جہاں سے گزرتا عزت افزائی کا قرا پا تا بوڑھا اور کمزور ہونے کے باوجود پہلوانوں کی صف میں جو عظمت اور مثالیں اس نے قائم تھیں ہوز زندہ تھیں اس لیے کہ اس سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کوئی بھی نہ کر سکا۔

”عید کے بارے میں کچھ سوچا۔“ دونوں کے بعد بانو کی ماں نے پھر بتو کرہ چھیڑا۔

”سوچنے سے کیا ہوگا۔ کیا کیا جائے؟“ وہ بے حد پریشان تھا۔

مجھے تو عید کی فکر کھائے جا رہی ہے۔“ بانو کی ماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”زمین بچ دوں؟“ شیدے نے سوالیہ نظروں سے بانو کی ماں کی طرف دیکھا۔

وہ ہلکا لگی۔ ”نہیں، نہیں، زمین نہ بیچنا، ہرگز نہ بیچنا۔“

”کیوں؟“

”زمین بک گئی تو کھائیں گے کہاں سے۔ دوسری بات یہ کہ.... کہ لوگ کیا کہیں گے۔ یہی سمجھیں

پہلا پہلوان فقیر ہو گیا۔ زمین بکنے کی خبر سارے زمانے میں پھیل جائے گی اور..... اور ہماری سفید اناج میں مل جائے گی۔“ بانو کی ماں سننے لگی۔

پھر کسی سے قرض لینا پڑے گا۔“ شیدا اچھے اپنے آپ کو قتل کر رہا تھا۔

اس سے بھی برا ہوگا۔“ بانو کی ماں نے آہستہ سے کہا اور شیدا اٹھنے سے سانس لے کر رہ گیا۔

رات قیامت کی نہیں تھی لیکن شیدا برنخ سے گزر رہا تھا۔ خیالات کا ایک جھوم بے کراں تھا جو

اس کی ساری رگوں میں پھیل گیا تھا۔ اس نے ذہن کے سارے درجے کو دھکیل دے تھے پھر بھی ہوا کا زور

اور دھڑکا۔ عجیب طرح کا صحنہ تھا اس کے دماغ میں اندھیرا تھا کہ کوئی رہ بھائی نہ رہتی تھی۔ وہ اٹھ

اور ابل جلا دی۔

اور دوشی میں وہ اپنے جسم کا بغور جائزہ لینے کا جیسے ابھی رنگ میں اترنے والا ہو بازو کی پھیلیاں زور

لے کر پے جان ہو کر ٹک گئی تھیں، سینے کا گوشت ڈھل رہا تھا، رانیں اپنی تختی اور ٹھوس پکن ہو چکی

اس کے چہرے پر بایوسی کی لکیریں پھیل گئیں۔ اکھاڑے سے دو سال کے قطع تعلق اور وال سبزی

مسل خدائے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا مگر نیند کو نہ آتا تھا اور نہ آئی۔

اس صادق کی کرن پھیلی تو شیدے کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ کرن اس کی روح کے اندر تک سرایت

لی ہو۔ ذہن کے تاریک پردوں پر بجلیاں اور ان بجلیوں کی کڑک میں کھینچے گئیں اس نے راستہ

ان کر لیا۔ اس کا بی چاکہ کٹک کٹک قہقہے لگا کر سب کو اٹھا دے۔ سوئے ہوئے شہر کو جگا دے اسنے

ارے ہنے کہ اس کی گردا رہی بانو کی سرال تک پہنچ جائے اور وہ لوگ سم کر رہ جائیں اسنے

ایک ہو جائیں کہ زندگی بھر بانو ان کے درمیان سر اڑائے پھرے۔..... مگر..... اس نے قہقہے نہیں

کرے۔ گردا رہی بانو کے سرال تک نہیں پہنچائی۔ بسزریٹ گیا اور پر سکون نیند سو گیا۔

دوسرے روز وہ دن چڑھے تک سو تا رہا۔ بانو کی ماں کو اس تبدیلی پر بڑی حیرت ہوئی۔ شیدا تو سر شام

نہلا اور نہ اندھیرے اٹھنے کا عادی تھا۔ آج کیا ہو گیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ رات کیا سے کیا ہو گیا۔

شیدا جب اٹھا تو اس کا رنگ خوشی اور تپش نے اور تھما دیا تھا۔ بات بے بات ہنس رہا تھا۔ بلا وجہ

رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ بانو کی ماں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔

”تو سمجھ تو گیا ہے اب۔ عید بڑے چاؤ سے آئے گی۔ میں اپنی بانو کو سرال میں بیٹھ کے لیے سر

اور کسوں گا۔ اپنے داماد کو ایسی عیدی دوں گا کہ وہ تو لوں کا دواں اٹھا نہیں پائے گا۔ انگریزی سوٹوں کا

ایسا کپڑا تھیں جسے دو لگا کر بڑے بڑے سورما نہیں خرید سکتے، پھر جب وہ مجھے عید کا سلام کرنے آئے اس کی گردن جھکی ہوگی اور میرا سینہ غور سے تتا ہوا ہوگا۔ تب میں اسے سینے سے لگا لوں گا۔ اتنا پیار کرنا گا، اتنا پیار کروں گا کہ بس۔“ شیدا نیم دیوانہ لگ رہا تھا۔

”مگر یہ سب ہو گا کہاں سے؟“ بانو کی ماں شیدے کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”بس! تم دیکھتی جاؤ۔ سب کچھ ہو جائے گا اور تمہاری توقع سے بڑھ کر ہوگا۔“ شیدا باہر نکل گیا اس چال ایسی تھی جیسے سارے زمانے کو اپنے قدموں تلے پھیل رہا ہو۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”اے تمہیں بیٹھے بیٹھے کیا ہوا؟“ بانو کی ماں نے اخبار کی خبر یا تو کی زبانی سن کر شیدے پر دھاوا بول دیا۔
”کیوں اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔“ شیدا مسکرایا

”زرا پاگل پن ہی ہے۔ رٹنا زمنٹ کے بھی دو سال بعد اتنے بڑے پہلوان کو چیلنج دینے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہو نہر! اکیلی اور بڑا پہلوان۔“ شیدا زور سے ہنسا۔ ”کل تک میرے آگے رویا کرتا تھا پت پت آج جیمپن بنا پھرتا ہے۔ اگر میں کشتی لڑتا نہ چھوڑتا تو اکیلی، اکیلی ہی رہتا، سراپا اکھاڑا کا خطاب حاصل نہ کرتا۔“

کچھ بھی ہوئی احوال اسی کے ڈکنے بچ رہے ہیں۔ کسی میں اسے چیلنج کرنے کی ہمت نہیں ہے اور نہ اس کا چیلنج قبول کرنے کی، تم بڑے میاں ٹھہرا تو نہیں گئے۔“

”نہیں۔ تم دیکھتی جاؤ ہو کیا ہے۔“ انھیں کھلی اور زبان بند رکھو۔“ شیدے نے سر جھبے میں کہا۔
شیدے کے چیلنج کی خبر جنگلی کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ماہر کشتی کو پیاسا فیصد سے زائد فیض پہنچا کہ شیدا اب بھی اتنا دم خم رکھتا ہے کہ اکیلی کو جت کر دے گا۔ رنگ میں شیدا کی واپسی کا لہر گرجو شے سے خیر مقدم کیا گیا۔ شیدے اور اکیلی کی کشتی جگہ جگہ بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ اکیلی

خیال بھی تھا کہ شیدا ایک بار پھر جیمپن بن جائے گا۔ اسے کشتی ترک کیے صرف دو سال ہی تو اوہ تھے۔ غرض بچے بچے کی زبان پر شیدے اور اکیلی کا نام تھا۔ ہر ست یہی دھوم مچی ہوئی تھی۔

کشتی کی تار تار تلے ہو گئی۔ ٹھیک دو ہفتے کے بعد مقابلہ شدہ زوری کا تھا کہ شیدے نے نوٹوں کا بڈل بانو کی ماں کے حوالے کیا۔

”کیا ہے؟“

”کھول کر دیکھ لو۔“ شیدے نے پراسرار مسکراہٹ کا داؤ مارا۔ بانو کی ماں رومال کی گرہ کھولنے لگی۔
”ارے..... یہ کہاں سے آئے؟“ نوٹوں کی گندیاں دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”کشتی کا معاہدہ ہوا ہے نا؟ اسی میں سے ملے ہیں۔ باقی مقابلے کے دن ملیں گے۔“ شیدے کی آواز نہ لے لیں بھرا نے گئی۔ بانو کی ماں روپوں کے نشے میں مست ہو چکی تھی۔ اس نے غور بھی نہ کیا کہ اسے کالجی کتنا کر ب ناک ہو گیا ہے۔

اگر وہ دن آتی گیا۔ رنگ کے چاروں طرف جیسے انسانی سراگ آئے تھے۔ یہاں سے وہاں تک اس کی فصل سی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ چہ یگوئیاں بڑھ گئی تھیں پتہ نہیں چلنے والے۔

پھر چاکل ایک جانب سے شیدا اپنے مخصوص گاؤں میں نمودار ہوا اور فاتحانہ انداز سے رنگ میں لایا۔ شیدے کو رنگ میں دیکھتے ہی اس کے حامیوں نے نعرے لگنا شروع کر دیے۔ اتنا غل غپاڑا مارا کہ سن نہ ہونے لگے۔ شیدا منانت سے مسکرایا یکت شور بڑھ گیا۔ اکیلی رنگ میں آ رہا تھا چیمپن کی صورت پر مرنی چھائی ہوئی تھی۔ مرن چال چلتا ہوا وہ رنگ میں داخل ہوا تھا مٹائیوں نے آسمان سر پر لایا۔ جیج پکار سے اندازہ ہوتا تھا کہ شیدے کے طرف دار تعداد میں زیادہ ہیں۔ اکیلی کا حوصلہ اور کم

شعری شروع ہونے والی تھی۔ دونوں پہلوانوں نے مصافحہ کیا۔

”پانادھ یاد ہے نا؟“ اکیلی نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ہاں۔ لیکن باقی کے سات ہزار اسی وقت میرے گھر بھجوا دو۔“ شیدے نے آہستگی سے کہا۔

”اوکل ختم ہونے کے بعد بھجوا دو گا۔“ اکیلی منٹایا۔

”میں ابھی اور اسی وقت مجھ پر ایسا وقت آیا ہے کہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا اگر بعد میں تم مر جاؤ۔“

”اوکل ہے۔“ اس کی ساتھ ہی اکیلی نے پیچھے ہٹتے ہوئے رنگ کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کی ایک ایک ایسا اشارہ کیا جیسے صرف شیدا اکیلی اور اکیلی کے ساتھی ہی سمجھ سکتے تھے۔ اکیلی کا ساتھی لایا۔ اس نے ہاتھ سے بندھے ہوئے رومال کا ایک گوشہ ہٹا کر شیدے کو رقم کی جھلک دکھائی اور وہاں ہار گیا۔ شیدا اس کے جاتے ہی بے حد مطمئن نظر آنے لگا تھا پھر وہ شروع ہی میں اکیلی کو رگیدتا چلا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اکیلی شیدے کے تجربے اور صلاحیتوں کے آگے بے بس ہے۔ دس میں سے

پانچ راؤنڈ ختم ہو چکے تھے اور شیدا اسی کی اچھی طرح پہچان بنا تھا۔

چھٹے راؤنڈ میں شیدے نے دھوپنی پاٹ مار کر اس کی کو زین پر شیخ دیا اور آرم لاک لگا کر اس کو پھانسی کی کوشش کی۔

”تم معاہدہ بھول تو نہیں گئے۔ دے ہوئے اس کی نے موقع ملے ہی شیدے کے کان میں دہرایا۔

”بے فکر رہو الو کے پٹھے۔ چیپٹن تو ہی رہے گا۔ کچھ تو میری بھی عزت ہے۔ کیا پہلے ہی راؤنڈ ختم ہو جاتا۔“ شیدے نے دکھ سے کہا۔

اس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیدا اپنے لگا ہے۔ اس کی سانس پھول چکی ہے اور وہ روتا رہا ہے دم ہو جاتا رہا ہے۔ اس کی تو جیسے مرتے مرتے زندہ ہو گیا۔ جو فن اس نے اب دکھانا شروع کیا تھا اب تک نہ جانے کہاں چھپا رکھا تھا۔ اس کی ہر ضرب کاری پر ڈری تھی۔ جوش اور جذبات نے اسے اندازہ کر دیا تھا۔ شیدے کے حمایتی سکتے کے عالم میں بیٹھے یہ خون ریز لڑائی دیکھ رہے تھے شیدا بری طرح لڑ رہا تھا۔ قہقہے کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس کی ہر ایک فلاٹنگ کلک شیدے کے حلق میں ایک نئی جیج کی دے رہی تھی۔

اور پھر..... اچانک تماشا یوں کو سانپ سو گھٹ گیا اس کی شیدے کو پیٹ کے بل فرش پر گرادیا تھا اس کی کمر پر چڑھا ہوا تھا۔ اس کی چہرے پر خوف ناک دیوانگی چھائی ہوئی تھی۔ فتح کے تصور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور داغ بے قابو ہو جا رہا تھا۔ وہ شیدے پر ایک خطرناک داؤ لگا رہا تھا۔ ”لگائے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیدا مسلسل چلا رہا تھا لیکن اس کی فوج کے گھمنڈ نے جیسے ہر ایک کی کوشش کرتا رہا اور..... اور پھر اس کی اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا زوردار تڑانے کے ساتھ ہی شیدا کی ہیکل میں نے تماشا یوں کے کلیجے پھاڑ دیے اور اس کے بعد شیدا خاموش پڑا رہا اس میں اور بھی حرکت نہ رہی۔

عید بڑے کور فرسے آئی۔ شیدے کا ہونے والا دامد سسرال کی طرف سے دیے گئے قیمتی اور ان تھائف کے بوجھ تلے دیا ہوا عید کا سلام کرنے آیا تو اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

لیکن..... شیدا اپنی خواہش کے مطابق داماد کو گلے سے لگا کر بے اندازہ پیار نہ کر سکا۔ اسے نہیں سکا اس لیے اس لیے کہ سفید پوش شیدا اچھے دھڑے معذور ہو چکا تھا۔ سفید پوشی کے گراؤ اس کی کمر توڑی تھی۔



ادنیٰ نسل کے اس شخص کا دل ایک بھنگن ہوا تھا

ایک دلچسپ کہانی ایک منفرد موضوع سے مصنف نے درخشاں دیکھے بطور خاص لکھا

منزلِ مرد

مطلق ایک ایسا کہتا ہے جو حسن کی بڑی بے تمنا شاپک پڑتا ہے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ بڑی سی ہے، لگائے کی ہے، کونٹ کی ہے، گھوڑے کی ہے یا گدھے کی ہے یا گدھے سے بھی زیادہ اسیل، بکا رہ اور فضول جانور کی۔ کتا تو پھر کبھی ہوتا ہے اسے تو صرف بڑی سے غرض ہوتی ہے اور کہاں کہ عشق کا کتا۔ اب کے بھی یہ کتا جو الطاف کا تھا ایک خوبصورت صحت مند اور داماد بڑی دیکھ کر بے قابو ہو گیا تھا اور رال ٹپکانے لگا تھا۔ یہ بڑی اہلسی کی تھی۔ اگر الطاف بھی عام اور نا اندیش نوجوان ہو تا تو یقیناً اب تک جذبات کی چکا چوند میں اندھا ہوا کراس کے عشق اہلسی کے حسن کی بڑی کو منہ نہ دیتا اور کہیں نہ کہیں بھاگ نکلتا لیکن ایک تو یہ کہ وہ عام انسان نہ تھا عاقل نہیں تھا، دوسرے یہ کہ ہر کام کرنے سے پیشتر اچھائی برائی اور آئندہ آنے والی حالات پر غور کرنے کا عادی تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ایک بہت کامیاب بزنس مین تھا اور شہر

کے بڑے تاجروں میں اس کا شمار ہونے لگا تھا گو کہ ابھی بالکل نوجوان تھا۔ ظاہر ہے اگر نوجوان نہ ہوتا تو ایسا عشق ہی کیوں کرتا۔ یہ دھندلے تو اسی عمر کے بچپن ہوتے ہیں۔ تیسری سب سے بڑی اور دھماکہ خیز وجہ یہ تھی کہ ایسی کوئی ایسی ویسی عام لڑکی تھی جو الطاف بلا کچھ سوچے سمجھے اس سے اپنا حال دل کہہ بیٹھتا۔ ایسی کا شمار ایسی چند لڑکیوں میں ہوتا تھا جنہیں شر کے شرچا ہا کر کے ہیں، آنکھوں آنکھوں میں ہمت سے پیغام دیتے ہیں، نظر دڑتے ہی ملتی بجاتے ہیں، ہوائی بورس اچھال دیتے ہیں لیکن ان تمام چاہتوں اور محبتوں کے باوجود کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ شادی کا پیغام دے سکے۔

میری اس تمہید سے قارئین کی سوچ کا رخ ایسی کی شخصیت کے ایسے پہلو کی جانب ہو چکا ہو گا جو دراصل اس کی شخصیت میں موجود ہی نہیں تھا۔ جی ہاں آپ سب غلط سوچ رہے ہیں۔ وہ کوئی ایسی ویسی چلتی پھرتی لڑکی نہیں تھی۔ شر کی حسین ترین بھینگ تھی۔ جی ہاں وہ بعد اینی تھی۔ آپ لوگوں کو یقیناً اس بات پر بھی حیرت ہوگی کہ اگر وہ بھینگ تھی تو پھر حسین کیسے تھی؟ تو جناب یہ بات غلط نہیں ہے۔ بھینگ بھی حسین ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ آج کل ہمت سے لوگوں سوشلسٹ بھی ہوتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں، کیونٹ بھی ہوتے ہیں اور خود کو مسلمان کہہ سکتے ہیں۔

ہاں تو صاحب! ایسی کا شمار لاہور کی بھینگوں میں ہوتا تھا اور وہ ان سب میں سرفہرست تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ اتنی حسین نہ ہو جتنی نظر اینی تھی یا پھر یہ کہ بقول شاعر

بھینگیں لگا ہیں دیسے نظارے

یعنی تاؤنے والی نظروں نے خود ہی اس کی شخصیت میں حسن کا پرتو جھانک لیا تھا۔ بہر حال ایک خوبصورت بھینگ تھی یا اس لیے خوبصورت لگتی تھی کہ عام طور پر بھینگیں خوبصورت نہیں ہوتی ہیں بلکہ بد شکل اور سیاہ پن کے ریکارڈ تو فنی معلوم ہوتی ہیں۔

الطاف نے جب سے ایسی کو دیکھا تھا۔ مسلسل دلچسپی سے اسے چاہے چلا جا رہا تھا لیکن اس تک محبت کا یہ ترنیک دن نہ تھا۔

الطاف جب بھی صبح کو نو دس بجے کے لگ بھگ ماڈل ٹاؤن میں واقع اپنی عالی شان کوٹھی چنکتی ہوئی کار میں کارخانے کی جانب روانہ ہوتا تو فیروز پور روڈ گلیبرگ کے چوراہے کے بعد گاڑا گاڑا ٹاؤن کو مڑنے والی سڑک کے کنارے ایسی کو اپنے جلوے بکھیرتے دیکھتا۔ وہ گھنٹوں کے ذرا

اور میں بلبوس، میلی چیکٹ قمیص سے آراستہ اور مٹی اور کچھ میں تھڑے ہوئے ننگے پاؤں لیے، ہاتھ میں بڑی سی بھاؤ سنبھالے اور دوسرے میں ٹوٹی ہوئی نوکری پکڑے سڑک کے کنارے کنارے صفائی میں مصروف ہوتی، فٹ پاتھر پر بیٹھے ہوئے چمچ فروش اور آتے جاتے راہ گیر حسن الطاف کی اس اگلیٹھی سے اپنی آنکھیں میٹکے، اپنی اپنی ذہنی سطح اور ظرف کے مطابق کچھ نہ کچھ اڑا دیتے، ریمارکس پاس کرتے یا اشاروں ہی اشاروں میں ہمت کچھ کسے کی کوشش کرتے اور ہاتھ میں ہمیشہ موٹی موٹی فٹش گایاں سن کر یوں مسکراتے جیسے یہ گالی گھلی نہ ہو بلکہ ایسی نے اڑا دیتا محبت کر لیا ہو۔

الطاف نے پہلے کبھی عشق نہیں کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے چڑے کے کارخانے میں اس قدر اہل رہتا تھا کہ ابھی اس فیلڈ میں آنے کا وقت اور موقع نہیں ملا تھا ورنہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آج کل کا نوجوان اور عشق سے بالندہ؟ آج کل تو بچہ بولنا سیکھتا ہے تو سب سے پہلے اس کے منہ سے عشقیہ قلمی گانے ہی اچلتے ہیں۔

شروع شروع میں الطاف اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا لیکن کئی راتوں کا عذاب سننے کے اور خوابوں میں کئی رات ایسی کو دیکھنے کے بعد اس نے حتمی فیصلہ کر لیا کہ وہ اب عاشقوں میں ہونے لگا ہے۔ اس قسم کے گھٹیا عشق کے نزول پر الطاف نے سچے دل سے خود پر بار بار لعنت لگائی۔ ایسی کے خیال کو ذہن سے کھینچ دینا چاہا لیکن بے سود۔ دل کو ہمت سمجھایا کہ گھٹل میں اٹھوں کا بیچو نہ کسی نہیں لگ سکتا۔ جذبات کو ہتیرا تیلی دی کہ اگر عشق ہی کرتا ہے تو ہمت سی اس کی لڑکیاں مل کتی ہیں، ایک بھینگ ہی کیوں لیکن وہ دل ہی کیا جو سمجھانے سے سمجھ جائے کہ جذبات ہی کیا جنہیں تالیوں کی دیوار سے روکا جائے۔ اپنے آپ کو سمجھانے میں اور خود پر جبر کرنے کے دوران اکثر ایسا ہوا کہ بے بسی کے شدید حملے سے الطاف کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ اس کا ایسا ہوا کہ اس نے غصے میں اپنا ہاتھ چاؤ ڈالا مگر تھکے صفر۔ ایسی نے کسی خوش آشام چگاڈوری سے الطاف کے دل و دماغ پر ایسے نیچے کاٹے تھے کہ الطاف بلبلارہ گیا اور آخر اس نے ہتھیار اٹھالے۔ لیکن اب سب سے بڑا مسئلہ ایسی تک اپنے جذبات و خیالات پہنچانے کا تھا۔

دوسرے دن جب ایک نئی اننگ اور ولولے کے ساتھ الطاف گھر سے نکلا تو فیروز پور روڈ گلیبرگ کے چوراہے کے بعد گاڑا ٹاؤن مڑنے والی سڑک کے کنارے اس کی کار کی رفتار خود بخود کم ہو گئی۔ اس نے دیکھا ایسی آج پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی گو کہ اس نے وہی

اپ رکھنے پر مجبور تھا ہم سب چوئین کے مطابق خواب دیکھنے پر مجبور ہیں۔

کی جب الطاف بیدار ہوا تو اس کے ذہن پر رات کو دیکھے ہوئے خواب کا کمر اٹھ تھا اور اسی اثر
اور اس سے وہ اپنی طبیعت میں غیر معمولی بلاشت اور سکون محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی محض خواب
طاف کی بنا پر اس نے تہہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے آج وہ ایسی سے ہر قیمت پر بات کرے

اس نے جان بوجھ کر تیار ہونے میں دیر لگائی، آدھے گھنٹے تک نہاتا رہا اس کے بعد پندرہ منٹ
بڑے بڑے دلتا رہا پھر جوتے پہننے میں بھی پانچ منٹ لگائے اور ناشتہ سترہ منٹ میں کیا اور اتنی دیر
کا نتیجہ وہی نکلا جو الطاف چاہتا تھا۔ جب وہ گاڑن ٹاؤن کو مڑنے والی سڑک کے کنارے پہنچا
وقت تک ایسی جھاڑو دیتے پھل فروشوں سے کافی آگے پہنچ چکی تھی۔ یہ جگہ نیشا دیران
اور آس پاس کوئی دکان بھی نہیں تھی۔ الطاف بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ ایسی کے سامنے کسی ایسی
دل محمول کر رکھے جہاں زیادہ لوگ نہ ہوں کیونکہ اگر ایسی اس کے کھلے ہوئے دل پر حملہ
الاف کی جھاڑو پھیرے، جیسا کہ ایسی سے بعید نہ تھا تو بغیر ٹکٹ کا متاثر دیکھنے والوں کی تعداد کم

۱۱۱۔

الاف نے گاڑی کی رفتار بالکل آہستہ کر کے ایسی کو دیکھا۔ وہ سر نہ کائے بڑے انہماک سے
کھڑی ہوئی کھڑے کی لید جھاڑو سے کھچ رہی تھی۔
الاف نے گاڑی اس کے نزدیک لے جا کر اس طرح روکی کہ جھاڑو کی ٹوک گاڑی کے پیچھے
اگر دب گئی۔

الاف سمجھتا ہے آگے کر گاڑی۔ "ایسی نے بڑی کمرہ آواز میں کہا۔ الطاف نے گہرا کراہیک
والی آگے بڑھادی اور پھر لوکھاٹ میں جلدی سے نیچے اتر آیا۔ ایسی دوبارہ اسی انہماک سے
الاف کی لید کھینچنے میں مصروف تھی۔ الطاف کچھ دیر کھڑا اپنی سانس درست کرنا رہا اور حواس
اگر رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایسی کے قریب آیا۔ ایسی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور
اپنے کام میں لگی رہی۔

الاف سوچتا ہے تم سے کچھ کہنا ہے۔ "کئی سطحوں میں الطاف کے حلق نے یہ الفاظ اگلے۔ اس
الاف منہ اوپر کر کے الطاف کو دیکھا۔

میں دے گا؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

پرانی کشنوں سے نیچی شلوار اور میلی چیکٹ قبض پائی ہوئی تھی اور ہاتھ میں وہی جھاڑو اور نوکری
تھی مگر نہ جانے آج وہ پہلے سے زیادہ حسین کیوں لگ رہی تھی۔ الطاف کی کار کی رفتار خود بخود مزہ
کم ہو گئی۔ ایسی چپ چاپ سر جھکائے سڑک جھاڑو تھی۔ "موقع اچھا ہے۔" الطاف نے دل
ہی دل میں سوچتے ہوئے بریک پر دباؤ ڈالا مگر اس سے پہلے کہ کار کٹی، ایسی نے سر اٹھا کر پان والے
کو اتنی زبردست گالی دی کہ الطاف کے کان جھنجھٹا اٹھے۔ اس نے دانت کچکچا کر پان والے کو گھورا
جس نے کوئی بے ہودہ جملہ ایسی کی طرف اچھال کر اس کا مڈ آف کر دیا تھا۔ پان والا اپنے گتے
میں رنگے ہوئے دانت نکالے ایسی کی گالی پر برا خوش اور نازاں لگ رہا تھا۔ الطاف نے رفتار بڑھا
دی اور پان والے کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا کارخانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایسی کے منہ
سے اتنی موٹی گالی سننے کے بعد اس میں ہمت نہیں تھی کہ سر راہ اس سے کوئی بات کرتا۔

کئی دن گزر گئے۔ الطاف کسی طرح اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پارا تھا کہ ایسی کے آگے منہ
کچھ بول سکے۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست سے بھی مشورہ نہیں کر سکتا تھا جس سے کئی
کتنا وہ اسی پر قہقہو کرتا اور مہنگی اڑاٹا۔ الطاف نے طے کر لیا تھا کہ پہلے ایسی سے بات کرے
گا اور اس کے بعد حالات کی روشنی میں فیصلہ کرے گا اگر ایسی کی طرف سے ہمت افزائی ہوئی تو
نتائج کی پروا کیے بغیر اس سے شادی کر لے گا اور اگر اس سے سرخ جھنڈی دکھادی تو ٹھک سے ہار
چلا جائے گا مگر کرے گا اور ایسی کو بھلائی کی کوشش کرے گا۔ اگر اس کوشش میں کامیاب ہو
تو کہیں اور شادی کر لے گا ورنہ تمام عمر کوتاہ رہے گا اور ایسی کی یاد میں زندگی گزار دے گا۔
سب کچھ طے کرنے کے بعد الطاف کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے رگ و پے میں سکون کا سہرا
نشاخیں مار رہا ہو۔ وہ یوں مطمئن ہو گیا جیسے روتے ہوئے بچے کے منہ میں چینی دے دی جائے
اس رات جب وہ سویا تو اس نے خواب میں ایسی کو دلہن کے روپ میں دیکھا۔ وہ ایک
خوبصورت پچھر کٹ پر جملہ عروسی میں سکڑی سمنی بھٹی تھی۔ خواب ہی میں الطاف نے دیکھا
کتاب کی شیرازہ پنے ہوئے سما جھایا آیا۔ دلہن کے پاس بیٹھ کر بڑی آواز سے اس نے ایسی
گھونٹ اٹھایا۔ اس کے حسن کی تعریف میں چند ڈیباگ بول کر آخری سانس تک ساتھ لہا
کی تمہیں کھائیں اور پھر ایسی کے حسن کی شان میں ایک مشہور قلمی گیت گانے لگا جو ایک فلم
بھی ساگ رات کے دوران ہی گایا گیا تھا۔

اس قسم کا ڈرامائی خواب دیکھنے میں الطاف کا کوئی قصور نہیں تھا۔ چوئین ہی ایسی تھی کہ

”کھ کیا؟“ الطاف ہکا بکا رہ گیا، پھر جلدی سے بولا ”جتنے تم مانگو۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ ایسی کا یہ سوال اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

”ہوں!“ ایسی نے ہکا بکا رہا۔ ”جتنے میں مانگوں؟“ یہ جملہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ کمر اس طرح رکھ لیے جیسے ابھی دنگل لڑنا شروع کر دے گی۔ ”یاد دغ ہو جا رہاں سے ورنہ میں ہمارا تیرے منہ میں گھیر ڈوں گی۔“ اس نے بھانڑ اتنی تیزی سے الطاف کے منہ کی طرف بڑھائی کہ چاچ ٹھیکڑ دے گی۔

”لہلہ۔ لیکن۔“ الطاف نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر خود کو جھاڑو کی زد سے بچالیا۔

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ یہاں سے کالا منہ کر گئے منہ۔“

الطاف کی کھوپڑی میں جیسے کسی نے انجم بھر دی۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا۔ اس فرشتوں کو بھی اس قسم کی صورت حال کی امید نہ تھی۔

”دفع ہوتا ہے کہ لوگوں کو اکٹھا کرلوں۔“ اتنا کہ ایسی نے جلدی سے ڈھیر ساری ہوا اپنے پیچھے ٹھوس میں بھری۔ وہ شور مچانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔ میں چلا جاتا ہوں۔ تم شور نہ مچاؤ۔“ الطاف نے جلدی سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ وہ کی فٹا سمجھ چکا تھا۔

ایسی اسے خود بخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

”بھری صرف ایک بات سن لو۔ میں اس کے بعد چلا جاؤں گا اگر تم کوگی تو اس دنیا سے اٹھ جاؤ گا۔“ الطاف رو ہانا ہو گیا۔

”خوب جانتی ہوں کہ تیری ایک بات کیا ہے۔“ ایسی نے تیزی سے ویدے نچائے۔

کہا۔ ”تم کاروالے جب خود اپنی گاڑی سے اتر کر ہم جیسی عورتوں کے پاس آتے ہو تو ان کی بات کا مطلب کیا ہوتا ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔“

”مگر تم غلط سمجھی ہو۔“ الطاف کا گلہ رندہ گیا۔

”میں غلط نہیں سمجھی۔ جب سے جھاڑو لگانے سڑک پر نکلی ہوں، مجھ جیسے سیکڑوں کا کاروالا اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کر چکے ہیں اور میں نے سب سالوں کی ایسی دھتائی کی ہے کہ بھر یاد رکھیں گے۔“ پھر اچانک ایسی کی آواز میں غمی گھٹی۔ وہ ذمہ خوردہ لمبے میں کہنے لگی۔

نہیں تم بڑے لوگ ہمیں کیا سمجھتے ہو۔ ویسے تو ہمیں پاس بٹھانا بھی پسند نہیں کرتے لیکن تم

کہ کر خود بخود پھسل جاتے ہو۔ ہم تمہارا شرف صاف کرتے ہیں، تمہارے مکانوں کی گندگی باہر ہیں اور تمہیں۔۔۔ تم لوگوں کو ہمارا پاک صاف رہنا بھی کووارا نہیں۔ کبھی ہماری بستیوں میں آکر وہ بدعتی غلیظ اور گھناؤنی ہوتی ہیں۔ ہم تمہاری گندگیاں اٹھاتے ہیں اور خود گندگی میں رہتے اگر ہمیں صاف نہیں کر سکتے تو کم از کم اور زیادہ گندا بھی نہ کرو۔“ اس کی آواز میں آسوس کا تھا الطاف کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ منک اس کی شرایوں میں دوڑنے لگا ہو وہ تڑپ کر بولا۔

”تم نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔ میں تمہیں آلودہ کرنے نہیں بلکہ آلودگی سے نکالنے کے لیے ہوں۔ سب کاروالے ایک سے نہیں ہوتے۔“ ایسی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر زور سے مار مار کر پیش پڑی۔ الطاف سٹپا گیا۔

”یادو! تم اب یہ کہو گے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔“ وہ مسکرائی۔

الطاف بوکھلا گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”ہاں ہاں۔ لیکن تمہیں کیا پتہ چلا کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔“

”تجربہ ہے یاہو صاحب۔ تم جیسے سوئڈ بوڈ لوگ دولت کا جال نہیں پھینکتے تو الفاظ کے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے لوگ یہ سب کچھ کہ چکے ہیں لیکن جب میں اداری کرنے کا کہا تو بھاگ لیے۔ میں ایسے دھوکے میں آنے والی نہیں یاہو۔۔۔ خدا نے حسن دیا اس کی حفاظت کے لیے عقل بھی دی ہے، پچلے جاؤ یہاں سے۔“ وہ پھر گرم ہونے لگی۔

”اگر میں شادی کے نام سے نہ بھاگوں تو۔“ الطاف نے بڑی بہت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ایسی حیرت سے الطاف کی صورت دیکھنے لگی۔

”تم تمہیں شادی کرو گے۔“ اسے حیرت کے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گئی۔

اس میں تم سے شادی کروں گا۔“ الطاف نے ثابت قدمی سے کہا۔

”اس کے بعد ایسی کو تسلی ہو گئی اور جب کئی ہفتوں تک الطاف نے ایسی سے سوائے چند باتوں کے اور ان باتوں کو جانے والی سڑک کے کنارے کی جاتی تھیں، کسی اور بات کی ڈیمانڈ نہ کی تو اسے یقین ہو گیا لیکن آخر ایسی اس صورت حال سے آگاہی۔ ایک دن اس نے الطاف سے کہا۔ ”یادو صاحب تم مجھ سے اب شادی کر لو۔“ کب کرو گے؟“

”میں تو گھڑی کی چوٹھائی میں کرنے کو تیار ہوں۔ تمہارے مال باپ رضامنہ ہو جائیں گے اپنی مال سے باہر شادی کرنے کے لیے؟“ الطاف نے سوال در سوال کیا۔

”میری ماں ہے نہ باپ۔ ایک بہن ہے وہ بھی میری کام کرتی ہے اور اس کی میں پروا بھی نہیں کرتی۔“ ایلیسی نے اپنی سوانح عمری سادی۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے، کل ہی شادی کیے لیتے ہیں۔“ الطاف نے خوش ہو کر کہا۔ ”کل تم میرے ساتھ چلی چلتا۔ آج میں جا کر قاضی کا انتظام کروں گا۔“ چاک وہ بولتے بولتے رک گیا۔ ”مگر تم تو کہتے ہو۔ قاضی سے کیسے کام چلے گا اور میں گر جائیوں گا۔“ الطاف کے اس ایک لفظ نے چیونگ پاؤڈر کی طرح ایلیسی کے چہرے کا سارا رنگ فق کر دیا۔ وہ کئی منٹ تک گہری سانس ڈوبی رہی۔ الطاف بھی اپنے پہلے مشتق کی ناکاوی پر رنجیدہ ہو گیا۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایلیسی ڈوبی آواز میں بولی۔

”میں..... میں تمہاری خاطر مسلمان ہو جاؤں گی یاہو۔“ وہ اپنے اس فیصلے پر متذنب کا شکار رہی تھی، الطاف کا چہرہ کھل گیا۔

”ٹھیک ہے تم کل ہی میرے ساتھ چلی چلتا۔ ایک دوست کے گھر میں نکاح کا انتظام کروں گا۔“ ”کیا....؟“ ایلیسی کا ایک چیخ پڑی۔ الطاف پریشان ہو گیا۔

”تو تم مجھ سے خفیہ شادی کرو گے؟“ اس نے چلانے کے انداز میں پوچھا۔ الطاف نے دھڑکنے لگی آنکھوں سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

”تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔“ ”اس میں تمہارے بے وقوف ہونے کی کیا بات ہے؟“ الطاف نے پوچھا۔

”میں خفیہ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔“ اس کی آواز کم نہیں ہوئی تھی۔ ”آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ الطاف منہ بیا۔

”میں تمہاری خاطر اپنا مذہب چھوڑوں، اپنی برادری چھوڑوں، اپنے رشتے دار چھوڑوں اور مجھ سے خفیہ شادی کروں۔ اس کے بعد تمہارے ماں باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا یا تم نے ان کو کہنے میں آکر مجھے طلاق دے دی تو پھر میرا پرسان حال کون ہو گا؟ ہتا کون پوچھتے گا مجھے؟“ اس نے الطاف کو جھنجھوڑا۔ خفیہ شادی کے نام پر اسے زبردست شک لگا تھا۔

الطاف کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک معمولی سی بعد ازنی افلاطون کو بھی مات کر دیتی ہے۔

گی۔

”تو پھر کیا ہو؟“ وہ سر ہٹا کر بولا۔

”یہ ہو کہ تم باقاعدہ رات لے کر مجھے بیانے آؤ۔ اپنے ماں باپ کو ساتھ لاؤ اور اگر یہ سب ممکن نہیں کر سکتے تو مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو اور آئندہ کبھی مجھ سے مت ملنا۔“ ایلیسی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میرے ماں باپ تو کبھی بھی اس شادی پر رضامند نہ ہوں گے بلکہ اگر میں نے ان کے سامنے سارا نام بھی لیا تو ایسا جان بلا بظاہر مجھے جائز اور دولت سے عاق کر دیں گے۔“ الطاف نے بچی است ہادی۔

”تو تم میری خاطر دولت اور جائداد بھی نہیں چھوڑ سکتے۔“ ایلیسی کے آنسو اور تیز ہو گئے۔ ”نہیں۔ اس لیے کہ مجھے جھاڑ دینی بھی نہیں آتی کہ تمہارے ساتھ شادی کے بعد سڑکیں ہی مار کر نہ لگوں۔“

”تم بڑے کینے ہو یاہو....“ اس کے آگے ایلیسی کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا اور وہ سسکیاں لینے لگی۔

”روتی کیوں ہو۔ میں دولت بھی نہیں چھوڑ سکتا اور تم سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ دولت ہی ضرورت ہے اور تم میری پہلی محبت ہو۔ میں تم سے ضرور شادی کروں گا اور دھوم دھام سے کروں گا۔“ اس نے ایلیسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔“

”میں تمہارے لیے ساری عمر انتظار کرنے کو تیار ہوں۔“ ایلیسی الطاف کے بالکل قریب ہو گئی، ”الطاف کے نعتوں میں اس کی مخصوص ہماند گھی تو وہ ناگواری سے پیچھے ہٹ گیا۔

”کپڑے تو بدل لیا کرو۔ نہایت بھی ہو یا ایسے ہی گزارا ہو رہا ہے۔“ ”کپڑے میرے پاس صرف دو جوڑے ہیں اور نہانے کے لیے اتنی دور سے پانی لانا پڑتا ہے کہ

میں سے اتنی محنت نہیں ہوتی، صرف پینے کا پانی بھر لیتے ہیں۔“ ایلیسی آنے والے وقت کے تصور سے اتنی مسرور تھی کہ اسے الطاف کے طنز کا احساس ہی نہیں ہوا یا پھر یہ کمال لگتی۔

”اچھا اچھا پیچھے ہٹو۔“ الطاف ناک پر رومال رکھتے ہوئے پیچھے کھڑا۔ دراصل یہ پہلا موقع تھا کہ ایلیسی اس کے اتنے قریب آتی تھی۔ شادی کی خوشی میں وہ الطاف سے بالکل بھڑکی تھی۔ اس

کے پہلے وہ وہی دور سے بات کرتی تھی مگر شادی کی بات پر ایسی مست ہوئی کہ خود بخود الطاف کے لب لہجہ آگئی ورنہ وہ مردوں کے قریب آنے سے احتیاط ہی برتا کرتی تھی، اس قربت میں اس کا کوئی

سور بھی نہیں تھا۔ کتنی ہی محتاط لڑکی ہو۔ شادی کے نام پر خود بخود اپنے محبوب کے قریب یوں چلی

آتی ہے جیسے اس میں معنایں لگا ہوں۔

الطاف کو ایسی کی بسانہ سے ناگواری ہوئی لیکن صرف چند لمحوں کے لیے، جب اس نے ہم ہٹ کر اپنے تنہوں کو ایسی کی زد سے محفوظ کر لیا تو دوبارہ وہی محبت اٹھ کر آئے گی۔

”گدڑیوں میں سے جب لعل نکالے جاتے ہیں تو کچھ دیر تک ان میں گدڑیوں کی بو آتی رہتی ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلی دی۔

دوسرے دن محض سن گن لینے کے لیے اور اپنے والدین کی رائے معلوم کرنے کے لیے الطاف ناشے کی میز پر خود ہی اپنی شادی کی بات نکالی۔

”ای۔ میرا خیال ہے اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔“ اس نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا اس کی امی نے گھور کر دیکھا۔ اس کے والد ضیاء الدین صاحب نے بھی اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔

”لیکن صرف تمہارے خیال سے کیا ہوتا ہے جب تک ہم سب کی رائے نہ ہو۔“ امی کے اس جواب پر الطاف چونک پڑا۔ اسے ایسا لگا جیسے امی کو تمام واردات کی اطلاع مل گئی ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے ماں اور باپ دونوں پر نظروں کی لکیریں ڈالنے کے آثار کر مطمئن ہو گیا اور اپنے لمبے شوشی پیرا کر کے بڑے لاڑے بولا۔

”فرض کریں امی میں آپ نے اپنی پسند کا اہتمام کروں تو کیا آپ میری بات مان لیں گی۔“

”اے بے کہیں تم اپنی شادی طے ہی تو نہیں کر کے آگئے۔“ امی نے بڑے غور سے اس چہرے کو پڑھتے ہوئے پوچھا۔ ضیاء الدین صاحب بھی شک و شبہ کی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”اے نہیں امی۔ آپ تو خواہ مخواہ شبہ کر رہی ہیں۔“ الطاف نے بظاہر تو قہر لگایا مگر اندر اس کا دل کانپ رہا تھا۔ ماں باپ واقفی ماں باپ ہوتے ہیں۔ اولاد کی رگ رگ سے واقف۔

”فرض کریں۔ صرف فرض کریں۔ کہ میں آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کر دوں تو پھر؟“ الطاف پھر پوچھا۔

”آج کل کے لوگوں کے دماغ میں تو الوٹے انڈے دے دیے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی فرض کی بات ہے۔“ ضیاء الدین صاحب اپنی بھاری آواز میں بولے۔ الطاف ڈر گیا۔ اب اس میں سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

”چلو فرض کر لیا کہ تم نے ہمیں اپنی پسند بتادی پھر؟“ امی کے اس جملے نے الطاف کو بے حد ڈنک دی۔ ”پھر یہ کہ آپ کیا کریں گی؟“

”دیکھو میاں! اگر تم کوئی ایسی دلی لڑکی کے پتھر میں بڑھنے ہو تو کان کھول کر سن لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کل کے ماں باپ اولاد کے آگے مجبور ہو جاتے ہیں مگر ہم مجبور نہیں ہیں، تم لڑکی کا نام بتاؤ؟ خاندان بتاؤ۔ اس کے باپ کا نام بتاؤ۔ پیشہ بتاؤ اگر ساری باتیں معیاری ہوں تو ہمیں تمہاری ہاند پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ دولت کی بات چھوڑو۔ اس کے بغیر بھی گزارا ہو جاتا ہے لیکن تم ہانتے ہو کہ ہم خاندانی لوگ ہیں، تمہاری نہیں۔ ہمارے خون اور ہڈی میں کثافت شامل نہیں ہونا چاہیے۔ ایک عورت آئندہ آنے والی نسل کی معیار ہوتی ہے اگر وہی کسی گھٹیا خاندان کی اور اولاد قسم کی ہو تو پھر محبت کو اپنی نسل کی بہتری پر قربان کر دینا چاہیے۔ آج کل کے لڑکے جوانی میں سب باتیں نہیں سوچتے لیکن بڑھاپے میں احساس ہوتا ہے۔“

ضیاء الدین صاحب کی تقریر نے الطاف کو بالکل بیٹگی بلکی بنا دیا انھوں نے تو جیسے الطاف کو ہی ارکٹ بنا کر سارے حیر چھوڑے تھے گو کہ ایسا نہیں تھا مگر الطاف کو اس لیے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر کی دماغی میں تنکا تھا۔ وہ چپ چاپ میز سے اٹھ گیا۔ ماں اور باپ دونوں اسے جاتا دیکھتے ہے اور ان کسی نے نہیں روکا۔ دونوں جانتے تھے کہ بیٹا جوان ہے اور یہ نا ممکن سی بات ہے کہ جوانی میں محبت نہ کی جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس سے محبت کی جائے اسی سے شادی بھی کی جائے اس لیے کہ محبت ہو جاتی ہے اور شادی کی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ محبت ہر کسی سے کی جاسکتی ہے مگر اولاد صرف کسی کسی سے کی جاسکتی ہے۔ محبت میں نہ کچھ دیکھا جاتا ہے نہ سوچا جاتا ہے، شادی اس محبت کچھ دیکھا جاتا ہے اور سب کچھ سوچا جاتا ہے۔

الطاف کا موڑ بے حد خراب تھا۔ بات بے بات اپنے اسٹاف کے لئے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ ادھر اس کی شرط تھی کہ عزت لے کر آؤ۔ ادھر ماں باپ تھے جو کتا لہا چھوڑ دیتا تو کیا کر لیا کتاں سے کھانا اور پیٹنا۔ وہ پرانے زمانے کا فریاد یا جھجھکی نہیں تھا جن کے دماغ میں صرف محبت کا گوبر بھرا ہوا تھا، بیسویں صدی کا ڈاورن اور امی کا شوق تھا جس کے ذہن

میں غلٹات کے بجائے کھیڑ لگے ہوتے ہیں۔

اسے آرام کرسی پر نیم دراز ہوئے بیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا اور بیڑھ گھنٹے سے اس کا داغ اور جھیزن میں تھاکہ یہ مسئلہ کیسے حل کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کی سوچوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔

”کیا ہے؟“ وہ زور سے دھاڑا۔ ”میں نہ کہہ دیا تھا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”مرید۔ وہ کراچی سے مرزحشت کا فون ہے۔ آپ سے ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ آپ بڑی خوفزدہ آواز آئی۔ مرزحشت کا نام سن کر الطاف نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

”تھیک ہے مادو۔“ اس نے آواز پر قابو پاتے ہوئے آہری سے کہا۔

”ہیلو۔ الطاف بیٹے۔“ مرزحشت کی آواز سنائی دی۔

”جی ہاں آئی میں الطاف ہی بول رہا ہوں۔“ الطاف کافی حد تک منبھل چکا تھا۔ ”کیسے ہے؟“

”فراہا۔“

”بس تم آج او فی الحال تو یہی کام ہے۔ تو پھر کل آرہے ہو نا؟“ انھوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جی ہاں ضرور پہنچ جاؤں گا۔“

”آجانا بیٹے۔ بھول نہ جانا۔ اچھا خدا حافظ۔“ مرزحشت نے فون بند کر دیا۔

الطاف سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیا کام ہو سکتا ہے۔ مرزحشت سے اس کی ملاقات آٹھ نو ماہ پہلے ہوئی تھی۔ مرزحشت اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر اس کی عورت میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی اور پھر یہ کشش اس وقت بھر دی میں بدل گئی تھی۔ اس نے مرزحشت کے حالات جان لیے۔

مرزحشت حال ہی میں بیوہ ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر مرزحشت صاحب کافی عرصے سے برائے میں مقیم تھے، وہاں ان کا کپڑے کا بہت بڑا برنس تھا۔ شوہر کی موت کے بعد مرزحشت پاکستان آئے تھے۔ ان کی بیوی کا ارادہ کراچی میں ایک ٹیکسٹائل مل خرید کر مستقل یہیں رہنے کا تھا جب ان کا یہ معلوم ہوا کہ مرزحشت بے اولاد بھی ہیں تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ مرزحشت نے اپنے بے اولاد ہونے کا تذکرہ کچھ ایسے انداز میں کیا کہ الطاف کی پکلیں بھی میگ گئیں اور اس نے جھٹلایا۔ اپنے آپ کو بطور میٹا پیش کر دیا۔

پھر پاکستان آکر بھی الطاف لاہور سے بھاگ کر کراچی جاتا رہا اور مرزحشت کے برنس میں ان کا ہاتھ بیٹا رہا۔

مرزحشت کا فون آنے کے بعد سے الطاف سوچ میں پڑ گیا کہ آخر ایسا کون سا کام ہو سکتا ہے جس کے بارے میں اتنی رازداری برتی جا رہی ہے اور مرزحشت نے کچھ بتایا بھی نہیں۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ کراچی ضرور جائے گا پھر چند کہ ایسی کا مسئلہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ تبدیلی آپ وہاں ہو گی تو اعصاب کو بھی سکون میسر ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ کوئی مناسب حل سوجھ جائے۔ وہ کراچی جانے کی تیاری کرنے لیے دفتر سے اٹھ گیا۔

الطاف ڈینس میں واقع مرزحشت کی عظیم الشان کھڑکی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اراٹنگ روم یوں سجا ہوا ہے جیسے کوئی تقریب ہونے والی ہو لیکن وہاں مہمان ایک بھی نہیں تھا۔ کھانے کی میز بھی انواع و اقسام کی چیزوں سے بھری پڑی تھی جب تک مرزحشت اس سے ملنے کے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو الطاف کو ایک اور جھٹکا لگا۔ بیش بہا انتہائی سادہ سفید لباس میں رہنے والی مرزحشت سرے کام کی ساری باندھے ہوئے تھیں۔ انھوں نے سنگھار بھی کیا ہوا تھا۔

”تم آگئے بیٹا۔“ ہزار اہتمام کے باوجود ان کے چہرے اور آواز کی اداسی برقرار تھی۔

”جی ہاں۔“ وہ مرزحشت کو حیرت سے تنکھا رہا۔

”بیٹھو۔“ انھوں نے صوفے پر بیٹھنے ہوئے کہا۔

”آج کیا کوئی تقریب ہے؟“

”ہاں۔“ انھوں نے مختصر جواب دیا۔

”لیکن مہمان تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا اور یہ کس نوعیت کی تقریب ہے۔“

الطاف کے اس سوال پر مرزحشت کی آنکھیں پھٹتی چلی گئیں۔

”سالگرہ کی۔“

”سالگرہ کی۔“ الطاف مسکرایا ”تو آج آپ کی سالگرہ ہے۔ بہت خوب بہت مبارک ہو۔

اپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں کوئی خفہ لے کر آتا۔“ لیکن جب الطاف نے مرزحشت کے گالوں پر آنسو بہتے دیکھے تو شرمندہ سا ہو گیا۔ ”کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“

”ہاں۔ یہ سالگرہ میری نہیں ہے۔“ وہ آنسو پونچھنے لگیں۔

”اودہ تو آپ کے شوہر کی رسی ہوگی؟“ الطاف نے ایسے کہا جیسے ابھی فاتحہ پڑھنے والا ہو۔
”نہیں۔“

”ہیں۔ تو پھر کسی کی سالگرہ ہے، میری؟ لیکن میں تو جون میں پیدا ہوا تھا اور یہ مہینہ ستمبر کا
ہاں لیکن آپ تو بے اولاد ہیں۔ الطاف بالکل چھدن گیا۔
”ہاں۔ میں بے اولاد ہوں۔ پھر بھی آج میری بیٹی کی سالگرہ ہے۔“ وہ پچکیاں لیتے ہوئے بولیں۔

”تو کیا آپ کی بیٹی مر گئی ہے؟“ الطاف نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ تڑپ کر بولیں۔ ”خدا نہ کرے اللہ اسے سلامت رکھے۔“

اب الطاف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا پوچھتے اور کیسے پوچھتے مسز شمس نے خود ہی اپنی
کہانی سنائی اور ان کی اس طویل کہانی کا باب لباب یہ تھا کہ ان کی بیٹی عشرت، ان کے بڑا بڑیل
کے قیام کے دوران تعلیم کی غرض سے لندن بھیج دی گئی تھی۔ اس نے بچپن سے وہیں تعلیم پائی اور
جوان ہو کر ماں باپ کی مرضی کے خلاف ایک انگریز سے شادی کر لی۔ شمس صاحب نے اپنی
زندگی میں ہی عشرت کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی اور اسے اپنی تمام جائداد سے محروم کر دیا
تھا۔ مسز شمس اسی لیے پاکستان لوٹ آئی تھیں کہ اپنے وطن کی مٹی میں بڑا سکون ہوتا تھا۔
ہواؤں میں برسی یاد آتی ہوتی ہے بڑی فرحت ہوتی ہے اور مرنے کے بعد دفن ہونے کے لیے وطن
سے بہتر کوئی مقام نہیں۔

”لیکن آپ نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ آپ بے اولاد ہیں۔“ الطاف نے دھیرے سے پوچھا۔
”کس منہ سے کہتی؟ اس نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ سارے خاندان
کی عزت خاک میں ملادی۔“ انھوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔
”تو پھر یہ سالگرہ۔“ الطاف جملہ پورا کیے بغیر کہ گیا۔

”آخر میں ماں ہوں اور الطاف بیٹے۔ میں نے اسے جنم دیا ہے۔ اماں کے آگے کوئی جواز قابل
قبول نہیں ہوتا۔ دل کو بہت سمجھایا کمرتا کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں وہ مجھے اب بھی اسی
طرح یاد آتی ہے۔ جیسی بھی ہے آخر ہے تو بیٹی۔ مستقل اس کی جدائی میں تربیتی ہوں اس کی سالگرہ
کے دن یہ تڑپ دوچند ہو جاتی ہے۔ میں نے اس لیے ہمیں بلایا ہے۔ بیٹے کہ کوئی تو ہو جس سے کہ
کہہ سن سکوں۔ میں اسی لیے لوگوں سے کٹ کر رہتی ہوں کہ کوئی میرے غم کی وجہ نہ جان لے۔

الطاف تصویر جرت بنا ہوا تھا۔ مسز شمس زار و قطار رونے لگیں۔ الطاف گھبرا گیا۔ ”کک کیا
ہوا؟“

آج میری بیٹی کی سالگرہ ہے۔“ انھوں نے پچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

ہاں رہنے والے رشتے داروں نے جب بھی عشرت کے بارے میں پوچھا میں نے یہی کہا کہ لندن
میں تعلیم پا رہی ہے لیکن ہر یاد یہ جھوٹ بول کر کیجیے پر ختم سالگرہ ہے اسی لیے میں نے ہمیں بلایا
ہے کہ تم پر سب سے زیادہ اعتماد کرتی ہوں۔ جھوٹ بول کر کیجیے میں سوراخ ہو گئے تھیں
کی بات بتا دینی تو جیسے کسی نے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس سے ملتی ہوں تو
نرت جاتی ہے نہ ملوں تو جان جاتی ہے۔“ مسز شمس ساری کے دامن سے ناک پونچھتی رہیں اور
روتی رہیں۔ ان کی سنائی ہوئی داستان نے الطاف کے اعصاب کو ایک اور شدید جھٹکا پہنچا دیا۔
اسے یوں لگا جیسے مسز شمس نے تسلیم کر لیا ہوا صاف و شفاف آئینہ اس کے چہرے کے سامنے رکھ
دیا ہو۔ یوں محسوس ہوا جیسے یہی کہانی اس کے مستقبل میں دہرائی جاتی ہو، جب مسز شمس جیسی
آزاد خیال اور مغرب کی پروردہ عورت اپنی انوکھی بیٹی سے اس طرح قطع تعلق کر سکتی ہے تو الطاف
کے باپ تو پھر پرانی روایتوں پر ڈٹے ہوئے خالص اور غلیظ مشرق تھے خصوصاً خلیا الدین صاحب تو
الطاف کو ایسی سے شادی پر دونوں کو نہیں تو کم از کم الطاف کو ضرور بے درجہ گولی مار دیتے۔ الطاف
کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی جیسے اس نے سچ جیج ایسی سے شادی کر لی ہو اور اب ڈرا ساسر کا کھنکھار
اپنے ماں باپ کے حضور کھڑا ہو۔

مسز شمس رونے جاری تھیں لیکن الطاف میں اتنا یار بھی نہیں تھا کہ انھیں تسلی دے سکے۔
تھوڑی دیر بعد مسز شمس خود ہی چپ ہو گئیں ان کے دل کا بوجھ کسی حد تک آنسوؤں کے
راستے کم ہو گیا تھا۔

”چلو بیٹا چائے پی لو۔“ انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ الطاف چپ چاپ گم صم ان کے ساتھ جا کر
کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔ باخول پر عجیب سی سوگوار سی کیفیت طاری تھی۔ بیگم شمس اپنی بیٹی کی یاد
میں غمگین تھیں اور الطاف بھی خاموش تھا۔ مسز شمس یقیناً یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ ان کی پردہ
داستان نے الطاف کو بھی اداس کر دیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ الطاف کو اپنی بڑی ہوئی تھی۔
الطاف چپ چاپ چائے کے سپ لیتا رہا اور اچانک اس کے ذہن میں بجلی سی کنڈی۔ اس

نے گھبراہٹ میں گرم گرم چائے کا بہت بڑا گھونٹ بھر لیا اور پھر اپنا قلع سسلانے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اتنے زور سے ہنسنے کہ اس کا گلہ چھل جائے، اتنی زور کا قہقہہ مارے کہ آسمان بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو جائے۔ اسے اپنے مسئلے کا حل سوچھ گیا تھا، وہ اپنے آپ کو کسی گیس بھرے غبارے کی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ آسمان پر اڑنے لگے، لیکن اس مسئلے کا سارا دار و مدار مسز حشمت پر تھا اس نے اپنے آپ کو جڑ کا پاد لگا لیا اور مسز حشمت کی چائے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مسز حشمت نے جیسے ہی آخری گھونٹ کے کچائے کی پیالی پرچ میں رکھی الطاف نے تابی سے بولا۔

”آئی آپ سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گی۔“

مسز حشمت نے استغماہیہ نظروں سے الطاف کی طرف دیکھا۔ الطاف نے ان کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ جلدی سے دوبارہ بول پڑا۔

”دیکھیں آئی یہ میری زندگی کا سوال ہے اور کچھ عجیب نہیں کہ اس مرحلے پر ناکام ہو کر میں اور کئی پر مجبور ہو جاؤں۔ آپ اور صرف آپ میری مدد کر سکتی ہیں۔ خدا را انکار نہ کیجیے گا۔“

”لیکن آخر بات کیا ہے جس کے لیے تم نے اتنی تمہید یا مندی ہے۔“ مسز حشمت نے اشیائی سے پوچھا اور ان کے اس سوال کے جواب میں الطاف نے اپنے اور الہی کے عشق کی ساری مشق ایک سانس میں سادی۔ ساری کٹھا کمانی بنا کر الطاف نے مسز حشمت کے چہرے پر نظر ڈالا تو وہاں برہمی اور ناگواری کے آثار پائے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی الطاف کہ تمہارا ذہن اتنا پت ہو سکتا ہے۔“ انھوں نے دوا سے کہا۔

”آئی! یہ بات کسی کو پتا نہیں ہے۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا تھا میں آپ پر اعتماد کر رہا ہوں، ٹھیک ہے کہ میری پسند بہت گھٹیا ہے مگر آئی۔ بعض اوقات گھٹیا چیزیں بھی دل کو لگتی ہیں اور انسان انھیں حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اگر دل پر اختیار ہو تو شہزادہ سلیم بھی انارکلی کے خواب نہ دیکھتا، مارگریٹ اسنوؤ اڈن سے شادی نہ کرتی۔ میں بھی ایک انسان ہوں، عام انسان، اپنے دل پر اختیار نہیں ہے اور آئی اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو شاید دل پر لگی ہوئی یہ پالی پھانسی زہر کا کانا ثابت ہو کر میری جان لے لے۔ میں خود کئی کر لوں گا آئی۔“ الطاف پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو پڑا۔

”لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔“ مسز حشمت نے پیار سے الطاف کے سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اس طرح رونے سے وہ نرم پڑ گئی تھیں۔ الطاف آنسو پونچھ کر بولا۔

”آپ کی بیٹی لندن میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہاں سب کو یہی معلوم ہے۔ اب آپ کی بیٹی کو واپس آ جانا چاہیے اور وہ ضرور آئے گی اور پھر مجھ سے اس کی شادی ہو گی۔ میرا مطلب ہے آپ الہی کو عشرت بنا دیں۔“

”کلیہ کیا۔۔۔۔۔“ مسز حشمت ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں۔ ”ایک بھنگن کو میں اپنی بیٹی بنا لوں۔ الطاف اوش کے ناخن لو جو منہ میں آتا ہے بھلے چلے جاتے ہو۔“

الطاف بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے کہنے لگا۔

”دیکھیں آئی جب تک وہ آپ کے پاس نہیں ہے الہی ہے الہی ہے الہی کو عشرت بنتے ہیں صرف اتنا دلت درکار ہے کہ وہ آپ کی دالینا کر لے۔“

”ہو نہ بے وقوف لو کہ تم واقعی اس صدی کے سب سے بڑے احمق ہو۔“ انھوں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”میں نے جس وجہ سے اپنی سگی بیٹی کو چھوڑ دیا وہی تجربہ اب تم کرنا چاہتے ہو۔ عشرت نے ایک انگریز سے شادی کی تو میں اپنی اکلوتی اولاد کو چھوڑ کر یہاں چلی آئی اور اب عمل اب تم وہر انے کے درپے ہو۔ کیا اس حرکت پر تمہارے ماں باپ تمھیں گولی نہ مار دیں گے۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھیں

ان کی اس بات پر الطاف کے پسینے چھوٹ گئے لیکن پھر فوراً بولا؟ آئی آپ خود سوچیں۔ اپنی بیٹی سے قطع تعلق کرنے کے بعد آپ نے ایک لمحہ بھی چین کا نثارا ہے؟ آپ اپنی بیٹی کو خود چھوڑ کر ال ہیں لیکن پھر بھی اس جدائی نے آپ کی زندگی سے خوشی کی ایک ایک بوند نچوڑی ہے۔ اگر آپ الہی کو عشرت نہ بنایا تو میں پھر بھی اس سے شادی کر لوں گا، ٹھیک ہے کہ اب جان بچھ عاق کر کے گھر سے نکال دیں گے اور ساری عمر شکل نہ دیکھیں گے گھر میں اپنی ضد اور وعدے کا پکا ہوں پھر اس کے بعد میری ماں بھی میری عذاب سے گی جو آپ۔ یہ رسی میں میرے باپ کے آنسو چہرے پر بہ شک نظر نہیں آئیں گے مگر روح کے رخسار ضرور تر رہیں گے۔ انصاف کیجیے آئی، آپ کی ارا اسی مدد سے سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ الہی، عشرت بن جائے گی تو میرے والدین خود آپ سے رشتہ مانگنے آئیں گے، اسے بیاہ کر لے جائیں گے، نہ بیگ لگے گی نہ پتھری اور رگ بھی چوکھا اہائے گا۔ دوسرے یہ کہ مصنوعی سہی، وہ آپ کی بیٹی تو ہو گی۔ آپ کے دل کو کچھ تو سکون ملے

الطاف نے اپنی تقریر ختم کی تو سرزشتہ اس وقت اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ الطاف نے اپنے الفاظ سے آئندہ آنے والے واقعات کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ ان کا دل کانپ اٹھا تھا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ انھوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ شاید الطاف کے دلائل سے وہ قائل ہو گئی تھیں یا پھر انھیں الطاف کی ماں کا خیال آ گیا تھا۔
 ”تم جیسے نوجوانوں نے ہی قوم کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے خیر جیسی تمہاری مرضی۔“ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور الطاف نے خوش ہو کر ان کے گلے میں انہیں ڈال دیں۔

الطاف کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ ایسی اتنی جلدی اور بغیر کسی بحث مباحثہ کے اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔
 ”میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔“ بس تو ٹھیک ہے برسوں صبح تیار ہو کر ایئر پورٹ پہنچ جانا میں وہیں آؤں گا اور ہاں وہ جو میں نے تمہیں پے دیے تھے۔ ان سے کوئی اچھا سا جو خرید کر پہن لیتا اور خدا کے لیے کوئی نہ کوئی سینٹ بھی خرید کر اپنے اوپر چھڑک لیتا تاکہ تمہاری بے اندام سوگھ کر جہاز کے مسافر تمہاری اصلیت نہ جان لیں اگر نہ ابھی لو تو کوئی مضائقہ نہیں۔“

الطاف نے پوری ہدایت کی فہرست ایسی کو سنادی۔
 ”کل میونسپلٹی کے دفتر میں اپنا استعفیٰ بھی دے دوں گا۔“
 ایسی نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں“ یہ غلطی کبھی نہ کرنا اور نہ ہی اپنے کراچی جانے کا ذکر کسی سے کرنا اپنی بہن سے بھی چھپانا سمجھیں۔ ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میں مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ الطاف نے تیز لہجے میں اسے سمجھایا۔ ایسی سرلاٹا ہوئی خوش خوش مبتکی ہوئی چلی گئی۔
 عیسٰی الطاف اور ایسی کو لے کر ایئر پورٹ سے سرزشتہ کے ہنگلے پر آ کر رک گئی۔ الطاف کرایہ دینے کے بعد جب چاکلے سے اندر داخل ہوئے تو گاؤں ایسی نے پوچھا۔
 ”یہی گھر ہے یا۔“

”ہاں۔“ الطاف نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا اور الطاف کا جواب سنتے ہی ایسی نے کھلی سی تیزی سے اپنی شلوار اوپر چڑھا کر نیچے سے اڑس لی۔ شلوار گھٹنوں سے ذرا ہی نیچی رہ گئی تھی۔

”دیکھو بابو اب تو یہی گھر میرا ہے۔ راستے میں اور جہاز میں تو دوسرے لوگ دیکھ رہے تھے مگر ماں کون دیکھنے والا ہے یہ تو میرا ہی گھر ہے جو جی میں آئے کروں گی۔“
 ”لیکن آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ کیا تم ٹھیک طرح سے شلوار نہیں پہن سکتیں۔“ الطاف ابا کا کہنا۔

”بابو سچی بات یہ ہے مجھے عادت ہی نہیں ہے شلوار گھٹنوں سے نیچے آتی ہے تو میری پٹریوں میں گدگد رہی ہونے لگتی ہے بڑی دیر سے میں ممبر کے ہوں مگر اب تو۔۔۔ ایسی فقرہ مکمل کیے بغیر یہ ہو گئی۔

الطاف نے اسے تہہ آلود نظروں سے گھورا پھر جھک کر ایک جھکے سے اس کی شلوار ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔
 ”میں انھیں آدی بنانے کے لیے لایا گیا ہے سمجھیں۔ انسانوں کے طریقے سیکھو۔ چلو اندر۔“
 سرزشتہ کی کوشش کی شان و شوکت دیکھ کر ایسی کی آنکھیں پھٹی جاری تھیں وہ ڈرائنگ روم میں کھڑی ہکا بکا سے ایک ایک چیز دیکھ رہی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اب اس کے قریب میں رہے گا۔

دیکھ کر سرزشتہ انہیں اور غور سے ایسی کو دیکھنے لگیں، ایسی نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی، ڈرائنگ روم کے معائنے میں مصروف رہی۔
 ”بہت خوب۔“ بتیم حشمت تعریفی انداز میں بولیں ”تم نے گندی ٹالی میں سے کالج کی چمکتی ہوئی ٹالی نکالی ہے الطاف۔“ ان کی نظریں بدستور ایسی کا جائزہ لے رہی تھیں اور واقعی وہ اس وقت ان لباس میں بہت حسین لگ رہی تھی۔
 ایسی، سرزشتہ کی آواز سے چونک پڑی۔ ”سلام بتیم صاب جی۔“ اس نے بوکھلا کر سلام کیا۔

”ولیم السلام۔“ سرزشتہ مسکرا دیں۔

”بتیم صاب جی نہیں۔ آج سے یہ تمہاری ہی ہیں۔ انھیں لی ما کہہ۔ میں تمہیں کتنا سمجھا کر قائم رہوں لگتا ہے جیسے ہمیں کے آگے بین بھانڈا رہا ہوں۔“ الطاف ایسی کی حرکتوں پر کڑھ رہا تھا۔

”اچھا بھولو گئی۔“ مسز شمسٹ نے ایسی سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ایسی نے چلا مارا اور زمین پر ہی پاؤں پسا دیے۔ لیکن اب کے اظاف کو زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی اس کے صرف گھورنے پر ہی ایسی جلدی سے اٹھی اور صوفے کے ایک کونے پر سکر کر بیٹھ گئی۔

”اظاف! ہتھیلی پر مسروں جمانے کی کوشش ہرگز مت کرنا ورنہ نقصان میں رہو گے۔“ مسز شمسٹ نے اظاف سے بولی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ اظاف شاید سمجھا نہیں۔

”مطلب یہ کہ اسے عشرت تو کیا فی الحال انسان بنانے میں بھی کافی عرصہ لگے گا۔“ مسز شمسٹ نے ایسی کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے اس ریمارک پر ایسی کا منہ برا سا بن گیا اور وہ اپنا رخ بدل بیٹھ گئی۔ ”مجھے کوئی جلدی نہیں ہے جب آپ اس کی تربیت مکمل ہونے کا سرٹیفکیٹ دیں گے اس کے بعد ہی میں کوئی دوسرا قدم اٹھاؤں گا۔ پھر بھی انداز بتاؤتے لگے گا۔“

”کیا کہا جا سکتا ہے۔ اسے ہر ہر بات پر سکھانی پڑے گی جیسے ننھے سے بچے کو سکھائی جاتی ہے۔“ مسز شمسٹ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”ایمان نہ ہو کہ آپ کے گھر پلو اور دیگر ملازمین یا ملنے والوں کی وجہ سے ایسی کا راز فاش ہو جائے اور جب ہم اسے عشرت کے روپ میں پیش کریں تو بھائی اچھوٹے کے ساتھ ساتھ میری قسمت بھی پھوٹ جائے۔“ اظاف نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

”میں نے اس پبلو پر بہت پہلے غور کر لیا تھا اور اسی وجہ سے میں نے محمد علی سوسائٹی میں اسے بیٹھ کرانے پر لے لیا ہے اور وہاں بالکل نئے نوکر رکھے گئے ہیں کسی کو اس بیٹھکی کی بابت معلوم نہیں ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں ایسی کو وہاں شفٹ کر دوں گی اور پھر یہ اسی دن یہاں آنے کی پوری عشرت میں چلی ہوگی۔“

”وہ تنہیک یو مائی ڈیر آئی۔“ مائی سوٹ آئی۔“ اظاف خوشی سے بے قابو ہو کر مسز شمسٹ کے گلے کا ہار بن گیا۔ ”مگر آئی آپ اس کے پاس آتی جاتی رہیے گا اور کڑی نگرانی کیجیے گا۔“

خامی نہ رہ جائے۔“

”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میرا زیادہ تر وقت اسی کے پاس گزرے گا۔ یوں بھی میرے لیے یہ لالچ ایک دلچسپ مشغلہ ثابت ہوگی، میں نے کبھی جانور نہیں سداہائے ہیں۔ اچھا تجربہ رہے گا۔“

نوجوان آرٹسٹ خالد خان انتقال کر گئے

”ارمین!“

ہمارے موجودہ شمارے کی پیشکش ہو رہی تھی کہ اچانک ایک جانکاہ خبر ملی، آرٹسٹ خالد خان کا انتقال ہو گیا۔ خالد خان کے بنائے ہوئے کچھ اسچورس شمارے میں شامل ہیں۔ یہ خراجی اندوہناک بھی کہ پورا اٹاف سناکت رہ گیا۔ خالد خان نوجوان آرٹسٹ تھے، ان کی اس اچانک موت پر پورا اوارہ اہم ہے اور خالد خان کے گھروالوں کے غم میں برابر کا شریک ہے، خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر عطا کرے (آمین)

ارمین جملہ مسز شمسٹ نے اگریزی میں کہا تھا اس لیے ایسی کی سمجھ میں نہ آ سکا ورنہ شاید وہ اس ایک اس جملے کی وجہ سے ہی ناراض ہو کر واپس چلی جاتی البتہ اس جملے پر اظاف کا بھرپور جواب اس کے حلقوم سے آزا ہو گیا۔ ایسی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی مسز شمسٹ اور ایسی کو محمد علی سوسائٹی والے بیٹھکے پر پھوڑ کر اظاف والیں لاہور جانے کے لیے ایئر پورٹ چلا گیا وہ یہ حد مطمئن تھا۔

دو رات مسز شمسٹ نے ایسی کے ساتھ محمد علی سوسائٹی ہی گزارا۔ ایسی کا کہنا تھا کہ نئی اسے اکیلے میں نیند نہیں آتی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ نیند تو دینے بھی اسے فوم کی مسری پر نہیں آتی جب بھی کروٹ لیتی تو کندھوں کندھوں تک فوم میں دھس جاتی، اسے یہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کا جسم مسری پر ٹکا ہوا ہے بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے نیچے کچھ بھی نہیں ہے اور وہ خلاؤں میں تیر رہی ہے۔ بھلا خلاؤں میں تیرتے ہوئے نیند کیسے آسکتی ہے۔

دوسرے دن علی الصباح جب مسز شمسٹ بیٹنی پینے کے بعد بیٹھکے کے لان میں چل قدمی کر رہی تھیں تو انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایسی ہاتھ میں لوٹا پکڑے ان کی نظروں سے بچ نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ماں جا رہی ہو؟“ انھوں نے بلند آواز میں پوچھا۔ ایسی سہم گئی اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔

”ادھر آؤ۔“ انھوں نے اسے بلایا تو وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں ان کے نزدیک آکر کھڑی ہو گئی۔

کہاں جاری تھیں کیا یہ کیا ہے؟ انھوں نے لٹکی طرف اشارہ کیا۔

”جی... جی... وہ۔“ آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔

”بہاؤ نا۔“ انھوں نے قدرے نرم آواز میں پوچھا۔

”جی... وہ جاری تھی۔“ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

”آخر کہاں؟“ وہ کچھ بھی نہ سمجھیں۔

”جی وہ صبح جاتے ہیں نا جنگل... میں بھی...“ وہ خاموش ہو گئی۔

”ہوں۔“ مزرشت نے ٹھنڈی سانس لے کر یوں سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔

لیکن ایک بات تو یہ ہے کہ یہاں کہیں جنگل نہیں ہے، دوسرے یہ کہ تمہارے کمرے کے ساتھ اُتھا تھ روم کس مرض کی دوا ہے؟

”دیکھیں بیگم صاب جی...“

”بیگم صاب جی نہیں۔ امی کو۔“ انھوں نے بات کاٹ کر کہا۔

”ہاں جی تو امی جی۔ ہاتھ روم میں بڑی گھٹن ہوتی ہے جی۔ میرا سانس اکھڑنے لگتا ہے ہم تو بی

کھلی ہوا میں بیٹھنے کے عادی ہیں۔“ ایسی نے ایک سانس میں داستان غم سادی تو مزرشت نے

اپنا سر پکڑ لیا۔

”بہر حال۔ تمہارا سانس اکھڑے یا دم نکل جائے یونہی گزارا کرنا ہو گا سمجھیں اور اپنی پرانی

عادتیں چھوڑنا پڑیں گی چلا اندر جاؤ۔“ انھوں نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔ ایسی جیسے جیسے بیزار قدم

اٹھاتی اندر چل پڑی۔

ایسی کو عشرت بننا بہت مزہ پڑ رہا تھا۔ اس کی ہر بات پر روک ٹوک ہوتی تھی۔ قدم قدم پر سبق

پڑھائے جاتے تھے۔ مزرشت نے اس کے لیے ایک استانی اور ایک گورنس ملازم رکھی تھیں

جن کا کام اسے پڑھانے کے ساتھ ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھانا بھی تھا۔ ایسی اپنے آپ

بہت کنٹرول کرتی تھی لیکن فطرت کا منہ زور گھوڑا آسانی سے قابو میں نہیں آتا ایک دن جب مزر

شت نے اسے جعدا رنی کے ساتھ جھاڑو دیئے اور پونچھا پھیرتے دیکھا تو وہ آپے سے باہر ہو

گئیں۔

”عشرت! یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ دھاڑیں۔ ان کے سوال کے جواب میں ایسی نے بتایا کہ وہ

جعدا رنی کو جھاڑو دنا سکھا رہی ہے اور پونچھا پھیرنے کے اہم نکتے بتا رہی ہے نیز یہ ہے جعدا رنی کو

مالی کام ڈھنگ کا نہیں آتا لہذا اس کی مستقل چھٹی کر دی جائے اور صفائی سٹرائی کا اہم محکمہ
ایسی کی نگرانی میں دے دیا جائے۔

مگر مزرشت نے بھی عذر کیا تھا اور یہ چیلنج خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا کہ وہ اسے عشرت

کا رکھو گیس۔ کبھی کبھار ڈانٹ پھینکار سے اور اکثر پیار و محبت سے وہ اسے تہذیب سکھاتی

رہیں۔

پھر جب ایک دن الطاف ”عشرت“ سے ملے اور اس کی تربیت کا جائزہ لینے کے لیے آیا تو

عشرت نے اسے بڑے اسٹائل سے گلزار تک کہا۔ الطاف کے دل کی کلی کل اٹھی ”اس نے خوشی

سے پوچھا“ ہاؤ آریو مائی سوٹ پارٹ“

اور جواب میں عشرت ہڑبڑا کر اپنی گورنس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سر۔“ آپ ان کے سبق سے بہت آگے چلے گئے ہیں۔“ گورنس نے مسکرا کر کہا۔ لیکن الطاف

کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی ذہانت میں کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ بڑی تیزی سے ٹھنک

کے مراحل طے کر رہی تھی مزرشت اسی طرح دلچسپی سے رہی تھیں جیسے ایسی جیج انھی کی بیٹی

ہو۔ جب وہ اسے عشرت کہہ کر پکارتی تھیں تو انھیں ایسا لگتا تھا جیسے جلتے ہوئے کلیجے پر کسی نے

دھک کی ڈلی رکھ دی ہو جب وہ انھیں امی کہہ کر پکارتی تو ان کی روح کو تازگی کا نیا پیرہن مل جاتا۔

اسے رفتہ رفتہ سب کچھ سکھایا جا رہا تھا۔ مہمانوں کو ریسپونڈ کرنا، رخصت کرنا، انگلش میں خوشی

اور غم کا اظہار کرنا، حال احوال پوچھنا، چمڑی کاٹنے سے کھانا، منہ بند کر کے کھانا، پینڈوں کا انتخاب،

اعلا درجے کا لباس پہن کر اترانے کے خاص خاص انداز، منہ نیڑھا کر کے اور بھوسیں اچکا اچکا کر

ہاتے پوچھنے اردو کے الفاظ کو توڑنا مروٹنا، موسیقی کے ریکارڈ چننا، انگریزی دھن پر STEP دینا۔

فرض وہ سب کچھ جس کے بغیر نئی تہذیب نا مکمل ہے اسے سکھایا جا رہا ہے۔ اسے یہ سب کچھ سیکھنے

میں بھی کبھی سخت ناگواری اور تکلیف برداشت کرنا پڑتی، بعض اوقات وہ شدید احتجاج بھی کرتی۔

جب مزرشت نے اس سے پال کٹوانے کو کہا تو بہت بگڑی روٹی دھوئی لیکن پھر ہتھیار ڈال

دیے۔ اسی طرح جب گورنس نے مچھنے سے اس کی موٹی موٹی ہموں کو نوچ کر باریک کرنا شروع

کیا تو وہ خوب چیچی چلائی اور اس نے گورنس کو خوب خوب نوحا کھوٹا۔

ایک دفعہ جب الطاف اس سے ملنے کے لیے آیا تو یہ دیکھ کر باغ و گیاہ کہ ایسی گورنس کی کر

ہا ہاتھ ڈالے ایک انگریزی دھن پر ڈانس کی پریکٹس کر رہی ہے۔

الطاف نے سوچا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ اپنی منزل مراد حاصل کر لے گا۔ اہلیسی اسی رفتار سے سیکھتی رہی تو بہت جلد مکمل شریعت بن جائے گی اسے کوئی شناخت نہ کر سکے گا اور یہی موقع گا جب الطاف اپنے ماں باپ کے آگے عشرت کا نام لے گا اور ان کے پاس انکار کا کوئی جواز نہ ہوگا بلکہ وہ خود عشرت کو پسند کریں گے۔

ماڈرن ہونے کے دوران اہلیسی میں جو اب عشرت ہوتی جا رہی تھی یہ تبدیلی آئی کہ وہ الطاف کا باپو صاحب کی بجائے پیار سے ”اُمّی“ کہنے لگی۔ اپنا یہ نیا نام الطاف کو بہت بھایا اور وہ سوچنے لگا کہ اس کا نام واقعی الطاف کی بجائے اُمّی ہی ہونا چاہیے تھا۔ کس قدر مٹھاس اور اپنائیت تھی اُمّی نام میں۔

اس روز سز شمت کی زبانی الطاف یہ سن کر تقریباً پاگل ہو گیا کہ عشرت جیم خانہ کلب گئی ہوئی ہے۔

”آئی! جیم خانہ جانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب پوری عشرت بن چکی ہے پھر دیر کا ہے کی ہے؟ اس کے لندن سے واپس آجانے کا اعلان کر دیجئے نا۔“

”زیادہ بے صبرے مت بنو۔ ابھی انگلش بولنے میں کہیں کہیں اس کی زبان لڑکھاتی ہے۔ تھوڑے دن کی بات اور ہے میں چاہتی ہوں کہ وہ کچھ اور انگلش میں شرکت کر لے تو اور اچھا ہے۔ بس انشا اللہ مہینہ ڈیڑھ مہینے کی بات اور ہے پھر اس کے بعد ”عشرت“ کی آمد کی خوشی میں ایک عظیم الشان دعوت کی جائے گی۔“ سز شمت معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولیں۔



”عشرت“ کے لندن سے واپس آجانے پر جب سز شمت نے اپنی ونیس والی کو بھی میں امراء کی دعوت کی تو اس میں الطاف مع اپنے والدین کے شریک ہوا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق تکمیل کو پہنچ جانے پر اتنا خوش تھا کہ بات بے بات اس کے لبوں سے قہقہے پھوٹ رہے تھے۔ ایسے ہی خوش تھا جیسے کوئی استاد اپنے طالب ترین شاگرد کو انشک اور کڑی محنت کراتا ہے اور پھر اس کی امتیازی کامیابی پر اپنی رگوں میں مسرت و انبساط کی لہریں دوڑتی محسوس کرتا ہے ایسی طہانیت قلب محسوس کرتا ہے جیسے ”گورامین“ چلا دی گئی ہو۔

عشرت اس دعوت میں شعلہ بنو الابی برق کی مانند ادھر سے ادھر کو نہر رہی تھی۔ ”یہ میری مٹی اور یہ ڈیڑی ہیں۔“ الطاف نے اس کا تعارف اپنے ماں باپ سے کر دیا۔

”ہیلو انکل اینڈ آئٹھ۔“ اس نے ایک گرمی مسکراتے ان دونوں پر اچھالی۔ ”ڈونٹ مائنڈ میس آپ سے پھر بات کروں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ پھر مہمانوں کی بھیڑ میں گم ہو گئی۔ مہمان بہت تھے اور اسے سب کو نمٹانا تھا۔

الطاف کی امی، عشرت کو پسندیدہ نظروں سے اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

الطاف نے گردن اٹھما کر دھیرے سے ضیاء الدین صاحب کو دیکھا، ان کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات نہیں تھے بلکہ الطاف نے تو یہی اندازہ لگا دیا کہ ان کی چہرے پر پسندیدگی کی لہرں ٹھانٹیں اور یہی تھیں چنانچہ جب الطاف نے سز شمت کے گھر سے واپس آکر دبی زبان میں عشرت کا تذکرہ کیا تو ضیاء الدین صاحب چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور الطاف کی امی مسکراتے لکھیں۔

الطاف کے دوبارہ پوچھنے پر انھوں نے معمولی سی رسمی ردود قح کے بعد اپنی رضامندی اور عشرت کے لیے پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ الطاف کو یوں لگا جیسے وہ خوشی سے مری جائے گا۔ اس نے فوراً شکرانے کے نقل ادا کیے جن کی نیت اس نے اہلیسی کو سز شمت کے گھر بھیجنے سے پہلے کی تھی۔ فقیوں میں ڈھیر ساری خیرات باغی اور دانا دوبار پر بروکیر کی چادر چڑھائی۔ اس کے بعد کئی روز تک مصروفیت کے سبب الطاف کو کراچی جانے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے پیٹ میں شدید موڑ اٹھنے لگے تھے اور اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اگر یہ خبر جلد از جلد اس نے عشرت کو نہ سنائی تو اس کا بہت ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے گا۔

لہذا جیسے ہی اسے تھوڑی سی فرصت ملی وہ فوراً کراچی پہنچ گیا۔ سز شمت سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ عشرت اپنے کمرے میں ہے اور ابھی ابھی ایک استقبالیہ سے شرکت کے بعد واپس لوٹی ہے۔ الطاف دیوانہ ویرا ہما گیا تو اب عشرت کے کمرے میں داخل ہوا۔

”عشرت! عشرت۔“ الطاف پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان تقریباً چلائے لگا۔ ”جی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ الطاف نے شدت خوشی اور انتہائے جذبات میں اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ عشرت نے اپنے آپ کو الطاف کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ”جان۔ ہم اپنی منزل مراد کو پہنچ گئے۔“



اچھے سامنے کے اوراق پلٹ کر سوچئے، آپ کا ذوق کیا تھا؟
پہلے پہلی محبت تک کھٹک رہی تھی کیا

رفتہ صدیقی

نیاز فرماؤ

مالی جان بڑی بے چینی سے کرے میں ٹل رہے تھے۔ ان کے مینا ہیر آئل سے چڑے
کرے ہوئے لیکن دراصل بڑی ہی توجہ سے بیٹائے گئے سیاہی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔
موتی کرچی آنکھیں بار بار جھپک رہی تھیں۔ کسی قدر چپٹی سی ناک پر ننھے ننھے سینے کے قطرے جمع
ہوئے اور ماسوں سے بھرا ہوا چہرے کو لڑکھڑکے سے چکنا چار اچالا کیا تھا جیچ جیچ کر اعلان کر رہا تھا کہ
اے اے اے اور دھڑلے سے بے شمار انگوں اور خواہشوں پر سوار آئی ہے۔ دہلے پتلے کھجور کے سے
ٹہنی ملل کا کرنا، اندر پنی ہوئی بنیان کی پردہ داری کر رہا تھا ساتھ میں ہرک پاچا جامہ سفیدی چیل

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔
”تم آئی اور ابیا جان کو بہت پسند آئی ہو۔ میں نے ان سے بات کی تھی وہ رضامند ہیں میں بہت
جلد انھیں یہاں بھیجوں گا۔“ الطاف حیزی سے بولتا چلا گیا۔
”تو وہ رضامند ہو گئے۔ کسی نے بھی مجھے نہیں پہنچایا؟“ وہ خوش ہو کر بولی۔
”ہاں ہاں۔ پچانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم مکمل عشرت بن چکی ہو۔ اب اگر تم خود بھی
عشرت ہونے سے انکار کرو تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔“
”کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ کوئی یقین نہیں کرے گا۔“ عشرت نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”ہاں بالکل۔“ الطاف اس کے رویے پر اچھے کر رہ گیا۔
”دیکھیے الطاف صاحب! ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کیجئے گا۔“ عشرت آہستہ آہستہ
سے چلتی ہوئی الطاف سے کچھ دور ہو گئی۔ ”ہم دونوں کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، میری
بات توجہ سے سنئے۔“

الطاف ہونٹوں کی طرح اس کی صورت تک رہا تھا۔ عشرت نے کتنا شروع کیا۔

”میں آپ کی بڑی احسان مند ہوں۔ آپ نے مجھے فرش سے عرش تک پہنچایا، لیکن الطاف
صاحب آپ نے بھی بزنس کیا تھا۔ اب میں بزنس کر رہی ہوں آپ نے اپنا وقت اور پیسہ مجھ پر
ضائع کیا تو اس لالچ میں کہ آپ بطور منافع مجھے حاصل کر لیں گے۔ آپ یقین کریں مجھے آپ سے
بے پناہ محبت تھی لیکن کیا کروں کہ آج آپ نے مجھے جس طبقے کا ممبر بنا دیا ہے وہاں محبت کم اور
بزنس زیادہ کیا جاتا ہے بلکہ صرف بزنس ہی کیا جاتا ہے۔ اپنی اس طویل تربیت کے بعد میں نے
شعور بیدار ہونے پر بھی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص ہر معاملے میں بزنس کر رہا ہے۔
منافع کا سودا سب چاہتے ہیں، خسارہ کوئی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ میرا شمار بھی اب انہی لوگوں
میں ہونے لگا ہے۔“

”آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟“ الطاف بے چینی سے بولا۔

”میدھی سی بات ہے الطاف صاحب! میں نے اب دنیا دیکھی ہے میرے ذہن سے ڈگمگا رہا
ہے اب میں بھی بزنس کروں گی۔ جب کبچہ اور غلات میں لٹھرا ہوا ایک معمولی سا سنگرزہ تھی تو
آپ جیسے لکھ پتے نے میری طرف ہاتھ بڑھایا، اب تو میں جھلم کی دنیا میں سما ہوا ایک کار آمد ہوا
ہوں، یقیناً کوئی کر روٹتی اس ہیرے کو چننے لگا اور میں اس وقت کا انتظار کروں گی۔“

دو بادشاہوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور یہ جھگڑا بڑھتا ہی چلا گیا۔ پہلے بادشاہ نے اپنے وزیر کو طلب کیا اور حکم دیا کہ دوسرے بادشاہ کے پاس جائے اور اسے کہہ کر کہی بنا کر آئے۔ وزیر نے اس کام سے معذرت چاہی اور کہا۔ ”وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ بادشاہ نے اسے یقین دلایا۔ ”اگر اس نے تمہیں کوئی تکلیف پہنچائی تو میں اس کے تمام درباریوں کے سر قلم کر دوں گا۔“ وزیر نے دست بستہ عرض کیا۔ ”جہاں تباہ آپ جتنے بھی سرکاش ہیں ان میں سے کوئی میری گردن پر فٹ نہیں آئے گا۔“

ات چھا گئے۔ وہ پھر شلنے لگے۔ شلنے رہے۔ انھیں دیکھ کر بجزرے میں گھومتے ہوئے بھوکے شیر کی یاد آتی تھی۔ تو ڈی دیر کے بعد وہ پھر میز پر بچھنے، ان کا قلم اٹھانے بھرنے لگا۔ ”تمہاری وجہ سے کھانا چٹنا ہو گیا ہے (حالانکہ وہ دکان کھانے لگے تھے) راتوں کا سو نا خواب ہو گیا ہے (پھر وہ جھوٹا ڈوبے جو ان کو سوتے ہیں تو صبح ایا جان کے ڈانٹنے پھنکارنے پر ہی اٹھتے تھے) اور تم نے اگر میرے خط کا جھجیدگی سے جواب نہ دیا تو خود کشی کر لی جائے گی اگر گھر میں رسی نہ ملی تو بازار سے منگو کر، مگر پھانسی ضرور لگائی جائے گی۔“ وغیرہ وغیرہ۔

اس خط کی دھمکی کارگر ہوئی۔ دوسرے دن ہی رضیہ جواب لے آئی، لکھا تھا۔ ”آپ سے جو اتفاق کیا تھا اسے آپ معاف کر دیں۔ دراصل مجھے بھی آپ کا کچھ کچھ خیال ہو گیا ہے پتا نہیں کیوں (واہ یہی خوب رہی) لیکن یہ خط و کتابت ٹھیک نہیں۔ دنیا کیا کہے گی۔“ (صاف دعوت تھی کہ اور خط لکھ مجھے)

یہ پڑھتے ہی بھائی جان خوشی سے ناچ اٹھے۔ چلیا بیوں نے پل ہار کے موقع پر جو جو حرکتیں کی ہوں گی ان کی زبان سے بھی سرزد ہوئیں۔ بس چھت کو تھا ہے ہوئے ستوں کو گدگدی کرنا باقی رکھا اور اس شام ان کے لیے آفتاب امید، درپے محبوب سے بڑے شاندار انداز سے طلوع ہوا۔ صغیہ آیا نے بزم عنایت کے لیے آب و تاب کے ساتھ درشن دیے اور دیر تک یوں ہی وقت بیکار کر دیں۔ ان کا سانولا رنگ کچھ سنہرا نکھر آیا تھا۔ سیدھی سی مانگ کے دونوں طرف بالوں کے گھنگریالے جنگل تیل سے چمکے ہوئے تھے اور ان کی ہوی سیاہ آنکھیں کاجل بنا کجائی ہوئی تھیں۔ بھائی جان تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ آج انھیں اس سے کہ خود خال میں ایک نئے معنی نظر آ رہے تھے۔ ایسے معنی جو ان کے دماغ کی لغت میں ناپید تھے۔ دیر بعد انھیں ہوش آیا تو انھوں نے جبکہ کر سلام کیا۔ اور سرے مکرر کہ جواب مل ہی رہا تھا کہ گلی ایا جان آتے نظر آئے اور صغیہ غراب سے اندر اور بھائی جان گریبا کر غیر معمولی توجہ سے تاریخ کی

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آخر ان کے سراپا کی اتنی وسیع تصویر کھینچنے پر کیوں تلا ہوا ہوں۔ درحقیقت بڑے بھائی جان ہیں ہی گریٹ آدمی۔ اب یہی دیکھنا کہ، لیکن نہیں۔ میں پہلے آپ کو اس چٹنی کی وجہ بتا دوں۔ بات یہ تھی کہ بھائی جان نے بہت عرصے سے دیوان خانے کو اپنا ریڈنگ روم بنالیا تھا۔ میں ان کی کتابیں شیفت میں بڑے سلیقے سے جی رہتیں وہ ایک کتاب نکالنے، کچھ دیر تک اس کے ٹائٹل کو گھورنے پھر فرسٹ پر غور کرتے اور اچانک ان کی نظریں سامنے کے گھر کی کھڑکی پر جم جاتیں جہاں سے کبھی کبھی ایک سانولا سلوانا پر کشش کھڑا، شوخی سے چمکتی آنکھیں اور پھرتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر انھیں شرمٹ دیدار بڑے اہتمام سے پلاتا اور کسی نیدر سے بچنے کی طرح شرمٹ دیدار پڑتے پڑتے انھیں احساس ہوا کہ اب ”شرمت روح افزا“ کی بھی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کیونکہ ان کی راتوں کی نیند وہ مطلع صاف ہو تو تارے گنگنے اور اچنک کو تلاش کرنے میں اور مطلع ابراؤد ہونے کی صورت میں ان کی کڑیوں کا لگا تار شمار کرنے میں روفو پیکر ہو چکی تھی۔ انھیں اب جھرا نیے کے ہر نقشے سامنے کی ہر شکل، ریاضی کے ہر سوال اور انگریزی کے ہر سبق میں صغیہ آیا کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ آخر کار انھوں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ساج کے ٹھیکے داروں کی ایسی کی تھی۔ وہ ضرور بالضرور ایک اور محبت المعروف بہ قصہ ہجر و فراق و داستان رنج و محن اس قافلہ عالم بہ الفاظ دیگر، شعلہ جوالا کے حضور پہنچائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے انھوں نے ایک خط لکھ ہی دیا، ”مضمون وہی تھا جو عموماً ایسے پہلے ”روانی“ خطوط کا ہوتا آیا ہے۔ البتہ ایک جملہ مجھے یاد رہ گیا (اس لیے یاد رہ گیا تھا کہ انھوں نے یہ ایک ناول چرایا تھا) وہ یہ تھا۔ ”تم میرے جذبات و احساسات کی دنیا پر برسات کی تند و تیز گھٹاکی طرح چھائی ہو۔“ یہ خط انھوں نے ایا جان کے پیڑ سے ایک صفحہ پر اکر لکھا تھا اور جب انھوں نے اسے خوشبو دار بنا کر کی خوش کی (وہ عاشقانہ خط ہی کیا جو خوشبو دار نہ ہو) تو عطر غلغلی کی ساری شیشی الٹی ہوئی۔ ناچار وہ صفحہ پر اتار پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے نئے ارشد کو بلا کر (اگلی بات بہت پہلے کی تھی) اس کے ہاتھ میں تھمائی اور کہا۔ ”سامنے صغیہ آیا کا گھر ہے نا“ ان کو یہ خط دینا، سمجھے؟ اور ہاں کسی اور کو معلوم نہ ہو۔

خبردار! رشتہ نہ سہلایا۔ بھائی جان نے شلنے شلنے باہر نظر ڈالی اور ان کا چہرہ اچانک کھل اٹھا۔ ارشد آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ایسا پھر اس نے ایک پھنا ہوا جو آگے آگے کر دیا۔“ (یہ دیا ہے صغیہ آیا نے اور یہ بھی۔) اس نے ایک ہاتھ سے بھی دی۔ لکھا تھا۔ ”ایک بار آنا بھائیں شرط ہے، ہم اللہ رحمہ فرمائیے۔“ بھائی جان کے چہرے پر کئی رنگ

”ہوں تو برخودار پڑھائی ہو رہی ہے؟“

”جی ہاں۔“ ان کی آواز لرز رہی تھی۔ ”تاریخ پڑھ رہا تھا۔“

”کیا تم ہمیشہ تاریخ پڑھا کرتے ہو؟ دوسرے مضامین بھی تو دیکھا کرو تاریخ! اونٹ! یہ بھی کوئی مضامین ہے؟ قسم خدا کی جب ہم طالب علم تھے تو امتحان سے ہٹ کر سال بھر کبھی نہیں پڑھا اور پھر پاس ہو رہے اور تم ہو کہ بدھو کے بدھوی رہے۔“

”جی ہاں۔“ بھائی جان نے بڑی سعادت مندی سے کہا، پھر یہ سوچ کر کہ کیا بول گئے ہیں، گڑ بڑا رہ گئے۔ ابا گھورتے ہوئے اندر چلے گئے۔

دن گزرتے گئے۔ بہاروں کی سی رنگینی اور شادابی لیے ہوئے دن، ہنسنے، ناچنے اور گاتے دن اور بھائی جان اور صفیہ آپا کی خط و کتابت رنگین سے رنگین رہتی گئی۔ محبت جتانے کے ہزار طریقے ڈھونڈ لگے۔ قسمیں کھائی گئیں۔ بیان باندھے گئے۔ لٹکے راستوں پر غور کیا گیا۔ تدبیریں جوڑی گئیں۔ کار ایک ٹریک نکال لی گئی، شہر میں حال میں ”دیو داس“ ریلیز ہوئی تھی۔ بھائی جان نے دعوت دی جو قبول ہو گئی۔ بھائی جان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ فوراً اٹھے شیوا کی جسم پر پوڈر چھڑکا۔ ایک اکیس فیص اور چار ٹولن نکالی۔ پم کمر کیب اکڑا کر آئینے میں دیکھتے رہے۔

وہ شام ایک ایشی شام تھی جو بھائی جان کی زندگی میں اب تک نہیں آئی تھی۔ ان کے دو بیٹے میں بھائی دوڑ رہی تھی۔ ایک رکشا آپا کے گھر کے سامنے آکر گاڑا۔ وہ اس میں سوار ہو گئیں چونکہ بھائی سکی کے گھر جانے کا تھا لہذا گھر کی طرف سے شے کی کوئی تنہائی نہیں تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کھڑے ہوئے بھائی جان نے ایک اور رکشا آگے بچھڑا لی۔ ”پہنچے پہلے صفیہ آتش جیسمین ہوئی اتڑیں پھر بھائی جان رکشا سے برآمد ہوئے۔ نگاہیں چار ہوئیں پھر حرکت خریدے۔ اور دونوں اندر میرے ہال میں داخل ہوئے اور ایک دیر ان گوشے میں بیٹھ گئے۔ ایک موانہ ہاتھ آٹا میں پڑھا اور ایک نازک سی کلائی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ نہ جانے کچھ کیسی تھی لیکن جب شام ہوا تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ دل نہیں خواب جو ان دونوں بیٹوں کے گرد بن گیا تھا، ٹوٹ گیا ہے، غلام کبھی اتنی زیادہ محو تھک نہیں رہی تھی اور وہ زبان بھی ان کے لیے اجنبی تھی جو ان کے ہاتھوں نے کی اور ہاتھوں نے سنی تھی۔ دل کی دھڑکنیں ہونٹوں میں سمٹ آئی تھیں۔

جب وہ گھر پہنچے ہیں تو دونوں کے دل بڑی طرح دھڑک رہے تھے۔ بھائی جان نے گلی کے کنارے پر

رک گیا صفیہ آپا کو بڑی دودھ مندی سے خدا حافظ کہا۔ پھر رکشا سے اتر گئے وہ اتارے ہی تھے کہ اچانک کوئی لہجہ ہی سے نمودار ہوا۔ ان کا دل جلیوں اچھلنے لگا۔

”کون شاکر؟ تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟“ ابا جان کی آواز گونجی ”اور یہ رکشا۔؟“ رکشا میں کون ہے؟“

بھائی جان کانپنے لگے۔

”بولو کون ہے؟“ ابا جان کی قدر گرے اور پھر آگے بڑھ کر انھوں نے پردہ کھینچا۔ اندر صفیہ آپا گھری بنی بیٹھی تھیں۔ گھڑی کچھ اور سکڑ گئی۔

جب رکشا صفیہ آپا کے گھر پہنچا تو دوسری قیامت ٹوٹی۔ ان کے ابا نے ان کی سہیلی کے گھر قاصد بھائی تھا تاکہ انھیں جلد از جلد بلایا جاسکے کیونکہ دوسرے دن انھیں کسی عزمی کی شادی میں شرکت کرنا تھی اور سلائی کے ٹھکے کی انچارج کے بغیر نہ پکرنے سے سلی کتے تھے؟ لیکن وہ ایک سہیلی تو کیا ساری سہیلیوں کے گھر چھان مارنے کے باوجود ان کا پتا نہیں چلا سکتے تھے لہذا قہر و غضب فطری تھا۔ اس رات اور تک صفیہ آپا کی سسکیاں اور ان کے ابا کی دھاڑیں گونجتی رہیں۔ خود بھائی جان کو بھی بھر کر ابا نے انھیں بلانی تھیں۔ ”ابا“ وہی تو میں کہہ رہا تھا کہ آخر صاحبزادے کب سے ایسے پڑھا کو ہونے کے دیوانے مانے سے ہٹتے ہی نہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ عشق بازی کا چکر تھا خبردار جو آئندہ پھر ایسی حرکت کی! اگلی صبح اڑا دوں گا۔“ (حالانکہ کچھلی کی پشتوں سے کسی نے ہندو کی صورت تک نہیں دیکھی تھی) خدا خدا کر کے ابا جان ہٹ گئے اور بھائی جان کر سی پر انھیں بند کپڑے پڑے رہے اور پتا نہیں کب سو گئے۔

صبح بھائی جان پر وہی رات کی غصت طاری تھی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرے پر پھٹکار برسی ہوئی بات بات پر بھٹتی سانسیں بھرتا۔ ناشتے پر بلایا گیا تو انکار کر دیا۔ ابا جان نے کہا۔ ”مرنے وہ بد تیز کو مفت کا لکھا لکھا کر عشق بازی سوچتی ہے۔ پیٹ میں روٹی نہ پڑے تو عشق و شوق سب ہوا ہو جائے گا۔“

جب ابا جان ناشتا کر کے دفتر سدھارے تو ابی بھائی جان کے پاس ناشتا لے بیٹھیں۔

”اے شاکر! میرے لال، ناشتا کر تجھے میری قسم!“ بھائی جان نے نفی میں سر ہلایا لیکن ابی نے منہ میں ادا لے لیں ہی دیا اور انھیں مجبوراً کھانا ہی پڑا (اور کیا اگر ابی انھیں کھلائی نہیں تو وہ کھاتے ہی نہیں؟) ان پر چڑھنے لگا اور برآمدے میں ان کی مخصوص کرسی ان کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ بت بے بیٹھے رہے اور ان کی نگاہیں غلامیں بھٹک رہی تھیں۔ گل میں سناٹا تھا پھر اچانک کچھ شور سہا ہوا۔ کچھ لوگوں کے زور زور

ہاتھیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ اٹھا پٹک ہو رہی تھی۔ نٹھار شد باہر بھاگا اور جب واپس

دو نوں اپنے جھکے خوشیاں سمیٹ لی تھیں
مگر... انفع نقصان دونوں کو گاؤں سے اوجھل تھا

شکلیہ رفیق

ہلالِ عید



اُن دن وہ بے حد خوش تھی جیسے زمانے بھر کی خوشیاں اس کے ہی دامن میں سمٹ آئی ہوں۔ بچپن سے
اُن اُس سے سنا کرتی تھی کہ کسی کی مدد کر کے دل کو جو سرت ہوتی ہے وہ کسی اور کام سے نہیں ہوتی
وہ سرت کی اس منزل کو پا چکی تھی۔ یار پارا اس کا سینہ فخر سے پھولنے لگا تھا۔ پورا گڈی سو
گئے۔ وہ بستر لیٹ کر اس حقیقی سرت کا پورا لطف اٹھانے لگی۔

وہ جب سے پیدا ہوئی تھی اپنے گھر غریب ہی دیکھی تھی۔ اماں کبھی کبڈوں کا رونا دھونا نظر آتیں کبھی
اماں کا۔ ان حالات میں اس کی پرورش کیسے ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ بچپن سے
اُن کی حدود میں قدم رکھا تو رنگین پینے آکھوں میں در آئے مگر گھر کی مفلوک الحالی کو اس کے سپنے دور
اُس کر سکتے تھے وہ تو یونی برقرار تھی پھر اس کی سوچ کا رخ تبدیل ہو گیا۔ وہ اب اکثر سوچا کرتی کہ بس
اور ان اور یہاں گزارنے ہیں پھر اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ خوب میٹ کرے گی۔ گھر میں افراد کی

آیا تو پوری کچی بڑا ہوا تھا۔ ”صفیہ آپ گھر چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ ان کے ایک ایک بڑی سی لاری لائے ہیں
کا سامان لہ رہا ہے۔ بہت سے مزدور آئے ہیں۔“ بھائی جان میٹھے کے میٹھے ہی رہے۔ سارا سامان
اور پھر صفیہ آپ بھی رضیہ اُن کی امی اور اب سب ہی سدھارے اور ایک بڑا سا قفل صدر دروازہ
منہ چڑا رہ گیا۔ صفیہ آپ کے ابا کے دو اور مکان خالی تھے جن میں سے ایک میں خود ان کے بھائی
شادی ہوئے تھے والی تھی۔ ویسے بھی وہ سولت کی خاطر کچھ عرصے سے یہاں سے وہیں منتقل ہونے کی
رہے تھے۔ اب اس واقعے (حادثے) نے ان کی سوچ کو عملی شکل دے دی۔ بات بھی تو ایسی ہی تھی
صفیہ آپ کی پہلے سے منگی ہو چکی تھی بات پہنچتی تو۔۔۔؟

معاف کیجئے نیچے کچھ گڑبڑی ہو رہی ہے بچے چلا رہے ہیں گلا پھاڑ کر۔ ذرا انھیں ڈانٹ
ارے ایہ تو بڑے بھائی جان ہیں!! بڑی محبت سے ملے۔ گلے لگایا (میں ان کا رازدار جو تھا۔ پھر وہ مجھ
بے تکلف بھی تھے) کافی موٹے ہو گئے تھے۔ انھیں گوشت کے ڈھیر میں دبی ہوئی سی لگتی ہیں۔ بڑا
سوٹ زیب تن ہے۔ (کیوں نہ پہنتے انکم ٹیکس آفسر جو ہیں) چہرے کا رنگ بھی کچھ نکھر آیا ہے۔
جان بھی اپنے تین بچوں کو لیے ہوئے ساتھ ہیں جو بالکل بھائی جان کی کاربن کاپی معلوم ہوتی ہیں (اور
کچھ رنگ دم سب کا) بھائی جان بڑے چرب زبان ہو گئے ہیں۔ مسلسل باتیں کرتے چلے جا رہے
ہیں۔ سفر کے تجویز، ریلوے والوں کی بد انتظامی، مہنگی کا خراب موسم، جگہ کی قلت، بھائی کی بیماری
ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئے پھر اچانک ان کے موضوع نے پلٹا کھایا۔ ”اے رے معصوم اور
پرانے گھر کے سامنے جو لوگ تھے وہ تمہیں یاد ہیں اے رے بھئی! وہی حیدر آباد والے گھر کے سامنے
”ہاں ہاں!!“ مجھے یاد آیا اور میں نے ایک نظر بھائی جان پر ڈالی جو سامان کی جانچ پڑتال کر رہے
میری بیوی کے ساتھ معصوم تھیں۔

”وہ۔۔۔ وہ ملی تھیں۔“ وہ کسی قدر ہنسے۔ ”اے رے بھئی! وہی جن سے میرا عشق چلا تھا۔ میں
پہچان نہ سکا۔ اتنی بدل گئی ہیں۔ یہ مونا سا ڈیل ایک ایسے کالے سے صاحب کے ساتھ“ اپنے
بچوں کے چہچہے چلی آ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے شاید دیکھا ہی نہیں تھا یا شاید دیکھ کر پہچان نہ سکی
لیکن میں۔۔۔ ”وہ رکے۔“ مجھی بڑا تعجب ہوا کہ میرا taste پہلے کس قدر ونگر تھا۔ مجھی بے
سی عورت۔۔۔ مجھے پڑی ہنسی آئی اپنے اوپر۔

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار رہے تھے ”اور میں بیچارا کوشش کے باوجود نفس نہ سکا۔“



ریل چیل تھی۔ بہت سے بہن بھائی اب اور اماں کے علاوہ وادی ابھی ان کے ساتھ رہتی تھیں اور ان سب سے زیادہ قریب وہی تھیں۔ اسے اپنی وادی ابست اچھی لگتی تھیں۔ رات کو وہ انہی کے ساتھ سویا کرتی اور سونے سے پہلے اگر اسے ڈر لگتا تو وادی اماں آتے۔ انکری پڑھ کر اس پر دم کر دیتیں اور اس دم میں جانے کیساتھ ہوتا تھا کہ وہ دلہا اور مطمئن ہو کر بے خبر سو جاتی اکثر اپنے دل کی باتیں وہ وادی اماں سے کہہ دیا کرتی اور جب ایک روز اس نے اپنے خوابوں کا ذکر وادی اماں سے کیا تو وہ مسکرا کر چہرہ لگیں۔ ان کی مسکراہٹ نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا پھر وہ اکثر وادی اماں سے اپنے دل کی باتیں کہنے لگی۔ جب وادی اماں نے محسوس کیا کہ وہ خواب کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگی ہے تو ایک روز انھوں نے اسے اپنے سینے سے بچھ کر بڑی پیاری سی نصیحت کی۔ ”بھئی! دنیا کی ہر لڑکی اس عمر میں ایسے ہی خواب دیکھتی ہے۔ میں نے بھی دیکھے تھے۔ ایک بات تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ خواب سب ہی کے پورے نہیں ہوتے۔ کچھ کے ادھر سے رہ جاتے ہیں اور کچھ کے تو چٹکا چور بھی ہو جاتے ہیں۔ اپنے ذہن میں محبت کے ساتھ خفیہ پلو میں رکھا کر جویش کامیاب زندگی گزارو گی، اگر تم قناعت کا سبق ابھی سے سیکھ لو گی تو زندگی سکون سے گزرے گی۔ ہوس اور لالچ انسان کو بے سکون کر دیتی ہے تمہارے شوہر کے پاس بھلا اسی پر قناعت کرنا۔ خدا خود ہی تمہیں دے گا کیونکہ قناعت پسندوں کو بھی پسند کرتا ہے۔ ویسے میں نے یہ سنا ہے کہ خدا تمہیں خوب دے اور ہمیشہ خوش رہو۔ لیکن میں تمہیں یہ باتیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ زندگی کے ہر شے سے باخبر رہو۔ تمہاری ماں کا اکثر تمہارے باپ سے جھگڑا اسی لیے ہوتا رہتا ہے۔ تمہاری ماں کو قصور وار نہیں ٹھہراؤ گی۔ اس زمانے میں اس تنخواہ میں گزارا کرنا واقعی مشکل ہے۔ اگر ہم دوسروں کا مقابلہ چھوڑ دیں تو آدمی جو بیٹائیاں ختم ہو جائیں۔ تمہارے واداکہ تنخواہ اس چوٹائی بھی نہ تھی اور مددگنی تو ہر دور میں محسوس ہوتی ہے مگر میری کبھی ان سے بیڑوں کے پیچھے جھگڑا ہوا“ وجہ میری قناعت پسندی تھی۔ میں ہر حال میں خوش رہنا جانتی تھی۔ تمہیں بھی میری چھوٹی سی نصیحت ہے کہ قناعت پسند بن جاؤ تمام عمر مسکون و اطمینان سے گزارو گی۔ کسی کے پاس اس کی دولت ہو تم اس پر رشک نہ کرنا اپنی چھوٹی سی جنت میں مگن رہنا اور بس۔“

وادی اماں نے بات ختم کر کے اسے دیکھا تو وہ بے حد متاثر نظر آ رہی تھی اور اس رات سے اس خوابوں میں کچھ کی ہوئے لگی۔ وادی اماں نے جو باتیں بتائی تھیں۔ اس نے انھیں پلو میں باندھ لیا۔ جب اس کی شادی کا وقت آیا تو ایک شریف سے انسان کو تلاش کر کے اس کی شادی اس سے کر دی گئی۔ جس کا نام بھی شریف تھا اور جو صرف شریف ہی نہیں تھا غریب بھی تھا۔ بے حساب رہا۔

چوبیس سال تھی۔ اخراجات بڑھ رہے تھے اور آمدنی وہی کی وہی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ تعلیم حاصل کرے گی۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک کی تیاری اس نے شروع کر دی۔ آج اگر وادی امان کی فیصلہ اس کے پلوں میں نہ بندھی ہوتی تو وہ سرکڑ کر دیتی مگر اب وہ اپنے حالات سے سمجھتا چکی تھی۔ لڑکھن اور جوانی کے وہ رنگیں خواب ختم ہو کر تلخ حقائق کا روپ دھار چکے تھے۔ اب وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اس کے سامنے صرف اس کے بچے تھے اور ان کا مستقبل وہ انھیں کے لیے جی رہی تھی اور ان کی خاطر مرنے چاہتی تھی۔

مسلل مدت اور کام سے اس کی آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں اور کمر میں بھی مستقل درد رہنے لگا تھا مگر وہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اس کے پاس جوانی بھی تھی اور اچھی شغل بھی مگر اس نے دونوں کو تاریک گوشہ میں بند کر کے مشغول کر دیا تھا اور آئینہ دیکھتا ہی چھوڑ دیتا تھا اگر کبھی دونوں میں سے کوئی اسے ستانے کی کوشش کرتا تو وہ بچوں کو بلا کر ان سے باتیں شروع کر دیتی۔ پچھوڑائی سال کا ہو چکا تھا۔ اور گزری بھی اب ڈیڑھ سال کی ہو گئی تھی۔ کل وہ سولہ برس کا تھی تو سولہ کو دیوار کے ساتھ کھڑی کرتے ہوئے اچانک ہی اس کی کمر میں ٹیس سی اٹھی اور ہاتھ بے قابو ہو گیا اور ذہنی سل ایک دم اس کے پیروں پر آ گئی۔ اس کی فٹ پکچ لگ گئی۔ پڑوس سے قمرن باہی دوڑتی ہوئی آئیں اور اس کے پیروں پر گر کر گرم ہلدی اور چونا تھوپ دیا پھر اس کے بچوں کو تسلی دینے لگیں جو ان کی چیخ سے ہراساں ہو گئے تھے۔

اسے چوتھ سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ دو روز بعد اس کے نوں کے امتحان شروع ہو رہے تھے۔ پیر میں یونی ٹکلیف رہی تو وہ سر طرح جا گئی کہ قمرن باہی نے کمر دیا تھا کہ جب وہ پیچھے دینے جائے گی اس کے بچوں کو سنبھال لیں گی۔ وہ حقیقتاً بہت اچھی خاتون تھیں اکثر اس کے کام آچکیا کرتی تھیں۔ وہ سلائی کے کپڑے وغیرہ دینے جاتی تھی تب بھی بچوں کو انھی کے پاس چھوڑا کرتی تھی۔ یوں تو وہ ان بچوں کے پاس بھی بچوں کو چھوڑ سکتی تھی مگر وہ گھر سے خاصی دور رہتی تھیں، وہاں بچوں کو لے کر جانے اور آنے میں خرچ زیادہ ہو جاتا تھا اور وہ پیسہ پیسہ جو ڈاکر اپنی ضروریات پوری کر رہی تھی۔

آج کل رمضان بھی تھے اور وہ زیادہ تر اپنی پڑھائی ختم کر کے بعد قرآن وغیرہ پڑھ کر ہی شروع کر لیں تھی۔ صبح کا وقت وہ ہوتا تھا بچے بھی سو رہے ہوتے تھے اس طرح اس وقت پڑھائی اچھی ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ سلائی میں لگ جاتی تھی۔ آج کل وہ زیادہ سی کام کر رہی تھی کیونکہ عید کو بھی بچوں کے لیے پار کرنا تھا۔ پر اب تو اسے اپنے پیر کی فکر لگ گئی تھی اگر یہ ٹھیک نہ ہوا تو اسے امتحان دینے پر کشام ہا

تردید

سوئڈن کے ایک قصبے کی یہ نسل کو نسل کے اجلاس کے دوران میں ایک رکن نے ٹیبل میں آکر کہا۔ "میرے نصف ماضی الوکے بیٹے ہیں۔"

اس پر اجلاس میں زبردست ہنگامہ ہوا اور مطالبہ کیا گیا کہ وہ رکن معافی مانگے اور اپنے الفاظ واپس لے۔ جب بات عد سے بڑھ گئی تو اس رکن نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے گا۔ چند روز بعد اس نے شرکی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرانے جن میں لکھا تھا۔

"میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ نسل کے نصف ارکان الوکے بیٹے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ نسل کے نصف ارکان الوکے بیٹے نہیں ہیں۔"

شیخ مقصود احمد طاہر مسلم پارک۔ فیصل آباد

پاسے گا اس حالت میں نہ تو یہ پیدل چل سکتی تھی اور میں اس انتظار میں ہوتا تھا کہ میرے کچلے جانے کا امکان تھا۔ جو اس کے لیے مزید خرچہ اور پریشانی لا سکتا تھا۔ بہر حال بہت جوڑ توڑ کر اس نے چار دن کے رکشہ کارایہ الگ رکھ لیا تھا۔ یہ خرچہ تو بہر حال اسے کرنا تھا۔

جس روز اس کا آخری پرچہ تھا اس نے قمرن باہی کو بلا کر کہا کہ وہ آج ذرا میرے آگے کیونکہ بچے کے بعد بازار جا کر بچوں کے لیے عید کے کپڑے لینے ہیں۔ اتنے روزے رمضان اور امتحان کے بعد وہ بازار چاہی نہ سکی تھی۔ اب تو عید میں صرف ایک ہی روز رہ گیا تھا۔

گھر سے نکلے وقت اس نے اپنی تمام جمع شدہ پونجی ڈھائی سو روپے نکال کر پرس میں رکھ لیے بچوں کے ساتھ اس نے سوچا تھا کہ اپنے لیے بھی کوئی سستا جوڑا خرید لے گی۔ اس کے کپڑے تو عید کے عید ہی جا رہے تھے۔ بچوں کے جوئے، کپڑے ان ڈھائی سو میں آجھی جائیں گے یا نہیں، اسی فکر میں وہ ہاتھ میں پرس اور کتابیں تمام کر نکلتی ہوئی گھر سے باہر نکلی۔ صبح کا وقت تھا اسے زیادہ دیر کھڑا رہنا پڑا۔ جلد ہی رکشا مل گیا۔ رکشا والے نے اس کے اشارے پر رکشا روک لیا اور اسے تعجب ہوا کہ جہاں اس نے جانے کو کہا تھا وہ رضامند ہو گیا۔ اس نے زیادہ پیسے بھی نہ مانگے تھے بلکہ وہ تو خود کچھ پریشان سالگ رہا تھا۔ رکشا اشارت کرنے سے پہلے وہ مڑا اور اس سے بولا۔

"میں راستے میں مجھے ذرا دھنمف کے لیے ایک جگہ کام ہے میں رکوں گا۔" ویسے تو وہ بڑا درمند اور حساس دل رکھتی تھی۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا تھا مگر اس وقت چونکہ اسے امتحان دینے جانا تھا اس لیے وہ رکھائی سے بولی۔

”بھئی میں پرچہ دینے جا رہی ہوں مجھے دیر ہو جائے گی۔“

”اچھا جی۔۔۔ جیسی آپ کی مرضی۔“ رکشا والے نے انتہائی دکھ سے کہا اور سر جھکا کر رکشا اشارہ کرنے لگا۔

ایک جگہ جہاں ذرا رش کم تھا وہ پھر مڑا اور کہا۔

”ہن میری بیوی اسپتال میں داخل ہے۔ صرف دو منٹ اس کے پاس رکوں گا، آپ کی مہربانی ہو اگر۔۔۔“

اس کا دل پیچ گیا اور اس نے ڈرائیور کو روکنے کی اجازت دے دی۔ پھر اس نے پوچھا۔

”تمہاری بیوی کو کیا ہوا؟“

”جی پتا نہیں کیا ہوا۔ رات اچھی بھلی تھی۔ سحری کھائی وضو کرنے کے لئے لوٹا اٹھا رہی تھی کہ آگیا اور گر پڑی، لوٹا اس کے پیٹ میں چھ گیا جیسے تیسے اسپتال لایا پتا نہیں کیسی چوٹ لگی ہے اب ہوش میں نہیں آئی۔ اسپتال والے کہتے ہیں اسے خون کی ضرورت ہے اور میرے پاس پیسے نہیں رکشا ڈرائیور کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کا حس دل زخمی ہو کر خون خون ہو گیا۔“

”پھر؟“ وہ بڑے دکھ سے بولی۔

”پھر کیا جی۔۔۔ میرا یہاں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ سب حیدر آباد میں رہتے ہیں، انھیں اطلاع دی ہے شاید وہ لوگ بارہ ایک بجے تک پہنچیں گے پیسے بھی جیسی آئیں گے جب تک تو وہ مرجائے گی۔ کہتے ہیں ایک گھنٹے تک خون نہ ملا تو مرجائے گی۔ میرے چھوٹے چھوٹے چار بچے ہیں۔ ہن دعا کر رہی ان کی ماں کو بچالے۔“ ڈرائیور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو وہ دل ہی دل میں رو پڑی۔ ”اللہ رحم کرے گا بھائی۔“ اس نے کہا اور سوچنے لگی کتنا مجبور ہے یہ انسان وہ پھر بولا۔

”اس دنیا میں غریب کا کوئی نہیں ہے جی ابھی میرے پاس پیسا ہوتا تو سب کام یوں ہو جاتا۔“ اس نے چٹکی بجاتی۔ ”میری ماں دوپہر تک آجائے گی تو پیسے بھی لائے گی اور گھر بھی دیکھے گی مگر جب تک بیوی پتا نہیں بچے گی یا نہیں۔“ وہ خلا میں گھورنے لگا اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ خدا نے اسے دل بھی دیا دیا تھا جو کسی کی پریشانی نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ کشکش کے عالم میں اس کی بیوی کے لیے دل ہی دل میں دعا کرتی تھی۔

”جی اسپتال آگیا ہے میں روک لوں؟“ ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔

”ہاں ضرور ضرور۔“ وہ اپنی پرانی سی گھڑی پر نظر ڈال کر ہمدردی سے بولی اور اس کے جانے کے لیے

خیالوں میں کھو گئی۔ اس کے سامنے گڈی اور پچہ کے چرے گھوم گئے۔ باپ کے نہ ہونے سے ان کی زندگی کیسی خوار ہو رہی تھی اور اگر اس رکشا ڈرائیور کی بیوی مرگئی تو اس کے بچے بیچے... نہیں...!! ماں کی محبت کے بغیر تو وہ بچے زندہ درگور ہو جائیں گے۔ یہ مردے جانے کب ان پر سونے ماں لاکر بٹھا دے۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہونے لگی۔ اسے بالکل یوں محسوس ہوا کہ پچہ اور گڈی آخری سارا بھی چھین رہا ہے اور پھر اس نے رکشا ڈرائیور کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے دل کا بوجھ بڑھتا ہی چلا جاتا۔ اس عالم میں تو وہ پرچہ بھی نہ دے سکتی تھی۔ اس کا سارا دھیان رکشا ڈرائیور کی بیوی میں الجھا رہتا وہ پرچہ بھی نہ کر سکتی۔ اسے اپنا مزاج معلوم تھا کہ جب تک وہ اس کی مدد کرے گی سکون نہ حاصل کر سکے گی۔

تین چار منٹ بعد ہی وہ منہ لٹکائے گئی آنکھوں کی ساتھ آتا نظر آیا اور اس کی سوالیہ نظریں دیکھ کر بولا۔

”میں جی انھوں نے مجھے اندر بھی نہیں گھسنے دیا کہتے ہیں بار بار سناں کیا منہ لٹکائے آجاتے ہو۔ ان لے کر آؤ ورنہ اس کے مرنے کے ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔“

وہ سیٹ پر بیٹھ کر رکشا اشارت کرنے لگا پھر بولا۔ ”معاف کیجیے گا آپ کو دیر تو نہیں ہوئی؟“

”میں کوئی بات نہیں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔“ وہ فراخ دلی سے بولی۔ وہ الجھا ہوا سارا رکشا چلا رہا تھا کبھی دو گاڑیوں کے بیچ سے گزرنے لگتا۔ کبھی تیز چلانے لگتا کبھی ایک ہاتھ سے بار بار اپنا سر تھام لیتا۔ وہ اس کی حرکات دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی اور اس کا دل ڈب ڈب چلا رہا تھا۔

جب رکشا مطلوبہ اسکول کے سامنے رکا تو وہ نیچے اتار گئی اور ڈرائیور سے بولی۔

”تمہیں کتنے بیویوں کی ضرورت ہے؟“

”جی دے دو بیویاں ملنے لگتی ہیں۔“ وہ جواب دے کر بولی۔ ”میرے پاس تو صرف پانچ روپے ہیں۔ ابھی پچھلے ہی بیٹے رکشا کا ایک سیڈ نہ ہو گیا تھا اس کو بھولنے میں ڈھیر سارا پیسہ لگ گیا پھر میں نے سوچا کہ عید آ رہی ہے تو اس پر بیٹے وغیرہ بھی کرایا۔“ اس نے رکشا کی جانب اشارہ کر کے کہا پھر بولا۔ ”اب مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ناگمانی آفت مجھ پر آنے والی ہے۔“ وہ پھر روہنا سا ہونے لگا۔

اس نے پرس کھولا اور پورے ڈھائی سو نکال کر اس کی جانب بڑھا دیے۔

”یہ پیسے میں آج گھر سے لے کر چلی تھی کہ امتحان کے بعد یہاں جو گرے گی سے بچوں کے لیے کچھ سامان

لے لیں گی۔ میرے بچوں کا باپ نہیں ہے۔۔۔ اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ ماں باپ کے مرجانے سے بچوں کی زندگی کیسی دردخ ہو جاتی ہے۔۔۔ اس وقت میرے بچوں کی خوشیوں سے زیادہ تمہاری بیوی کی اندکی قیامت ہے اگر اس کی جان بچ گئی تو میں سمجھوں گی کہ مجھے عید کی بچی خوشی حاصل ہو گئی۔ میرے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں اور وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ انھیں عید پر نہ کپڑے پہننے چاہیے اور شکر ہے کہ میں نے بھی انھیں اب تک کچھ نہ بتایا تھا۔ تم یہ دیکھ لو۔۔۔ خدا تم پر رحم کرے اور تمہاری بیوی کو زندگی دے۔“ رکشا ڈرائیور نے نوٹ پیشانی سے لگائے اس کی آنکھیں تشکر کے احساس سے نم ہونے لگی تھیں۔

”میں آپ کا بہت شکریہ۔۔۔ آپ مجھے اپنا پتا دیں میں شام کو آکر آپ کے پیسے واپس کر جاؤں گا جب تک میری ماں بھی آجائے گی۔“ وہ آنسو بھری آنکھوں سے احسان مندی سے بولا۔

”نہیں نہیں! میں نے یہ واپس لینے کے لیے نہیں دیے۔“ وہ جلدی سے کٹھن گھسی سی آواز میں بولی۔

”میں خدا آپ کو اور آپ کے بچوں کو خوش رکھے۔“ وہ احسان مندی کے بوجھ تلے دب سا گیا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ ہاں تم ذرا رکشا احتیاط سے چلاؤ اس وقت تمہاری جان بھی قیمتی ہے۔ جاؤ جا کر اپنی بیوی کے لیے خون کا بندوبست کرو۔“ اس نے کہا اور اسکول کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ وہ بالکل ہلکی سی آواز میں بولی تھی۔ اس کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا اگر اس وقت وہ اس ڈرائیور کی مدد نہ کرتی تو کبھی بھی پرچہ نہ دے سکتی تھی۔

اس کا آج کا پرچہ پچھلے تمام پرچوں سے اچھا ہوا تھا اور وہ اسے اس ڈرائیور کی دعاؤں کا بدل سمجھ رہی تھی۔ وہ جلدی گھر آئی۔ تو قرن باتی کو تعجب سا ہوا مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پاؤں میں تکلیف بڑھ گئی تھی اور بازار میں زیادہ چل نہ سکتی تھی اس لیے اگر آج چاند نہ ہوا تو کل دیکھی جائے گی ورنہ پھر رات کو۔

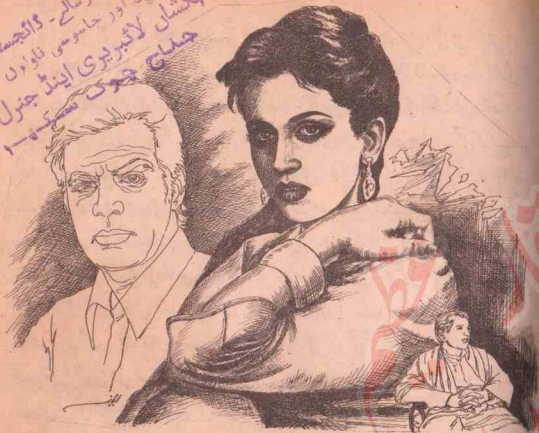
قرن باتی کے جانے کے بعد اس نے اپنے دونوں بچوں کو چٹا کر خوب پیار کیا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ اسے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے آگے خوشیوں کے انبار لگ گئے ہوں۔ آج اسے دادی اماں کی کسی بات یاد آ رہی تھی کہ کسی کی مدد کر کے جو خوشی انسان حاصل کرتا ہے اس کی بات سے نہیں ہوتی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ڈھیروں دولت مل گئی ہو۔

شام ڈھلے جب چاند بھی نکل آیا تو وہ ہاتھ اٹھا کر اس رکشا ڈرائیور کی بیوی کے لیے دعا گو ہو گئی۔

پھر اس نے پچہ اور گڈی کے پچھلے سال بقر عید والے کپڑے نکالے اور انھیں دھوئے بیٹھ گئی۔ دھو کر

استری کر دوں گی تو بالکل بنے کے بنے لگیں گے، وہ خوش ہو کر سوچ رہی تھی اس نے آج تک کسی عید ایسی خوشی، ایسا سکون اور ایسا ہلکا پھلکا پن محسوس نہ کیا تھا جیسا وہ اس سال محسوس کر رہی تھی جیسے اس عید کی جچی خوشی زندگی میں پہلے بار نصیب ہوئی ہو۔

رات کو بستر پر لیٹ کر آسمان کو دیکھتے دیکھتے بھی وہ رکشہ ڈرامیور کی بیوی اور اس کے بچوں کے دماغ میں اٹکتے اٹکتے سو گئی۔



”مجھے میرے نام سے پکارو“ عورت کی نفسیات کا ایک اہم باب
مُستفہد کے قلم سے نکلا ہوا ایک تیر جو قاری کے دل میں پیوست ہو جائے گا

جھیل اور پتہ

☆



گئے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔

وہ اپنی بی بی تقریر بجا کر وارڈ بوب کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ عورت اپنی انگلی میں پھنسی پیرے کی انگوٹھی دیکھتی رہ گئی جس کا رنگ اس کے شوہر کی بے رحم نگاہوں سے ملتا جلتا تھا۔ شوہر کے آخری فقرے نے اسے جھکا سا دیا اور وہ اپنے لرزے ہوئے وجود کو سمیٹتی ہوئی دوبارہ بیگ کی پینلنگ میں جت گئی۔

یہ بات درست نہ تھی کہ اسے کسی کام کا سلیقہ نہیں تھا، درحقیقت بات صرف یہ تھی کہ اسے دلہندہ خاوند کی بیوی بننے کا سلیقہ نہیں تھا۔ غمت سے امارت کا یہ سگرز کش پانچ برس میں ہی توٹے ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ کلرک کی بیوی تھی۔ چند برس پہلے کلرک صدر شاہ۔ زینت بی بی کا شوہر اور چار بچوں کا باپ تھا۔ اس کے چھوٹے سے گھر میں ہزاروں نام تمام خواہشوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ بچوں کی بڑھتی فیسوں کی بیلٹا۔ بڑی بیٹی کی شادی کی فکر ان کے سر پر سوار رہتی تھی، کبھی کوئی بھوکا ہوتا کوئی بیمار، کبھی اچانک خدا کو ان پر ترس آیا۔۔۔ افریقہ میں ان کے کوئی دو دربار کے ماموں رہتے تھے جنہوں نے اسے اچانک ویرا بھیج دیا تھا۔ وہاں سونے کی کانوں کا ذکر وہ سنتی تھی آئی مگر اس کے گھر تو واقعی سونا برستے گا تھا۔ شروع شروع میں جب ان کا گھر نئی چیزوں سے آشنا ہو رہا تھا تو وہ کتنی مسرور ہوتی تھی۔ سارے محلے میں ان کی شان ہی اور ہو گئی تھی۔ سارے خاندان کی عورتیں اس سے جلنے لگی تھیں۔ وہ ان کے حسد سے بے نیاز اپنی نئی ڈوبی خوشیوں میں مگن اپنے سوئے رب کا شکر ادا کرتے کرتے تھک سی جاتی تھی۔ ”کیا ہم بھی اس قابل تھے ان ساری چیزوں کے۔“ وہ ان چیزوں پر پیار سے ہاتھ پھیر پھیر کر سوہا کرتی۔

اور پھر نئی کوٹھی۔ نئے فرنیچر اور نئے قالینوں کے ساتھ جب ایک میم سی عورت گھر کی ڈیکوریشن کر کے آئی تو وہ حیران حیران اسے دیکھتی رہ گئی۔ ان عجیب و غریب مشین چیزوں کو سنبھالنے اور جانے کا سلیقہ بھلا اس میں کہاں تھا اور پھر تو گھر نو کروں سے بھرنا ہی چلا گیا۔ پہلے جہاں صدر شاہ اپنے کاموں کے لیے اسے پکارا کرتا تھا اب ملازموں کو پکارنے لگا اور شاید اتنے چہروں اور اتنے خادموں میں وہ اس کام بھی بھول گیا تھا۔ اب وہ زینو سے ”بے وقوف عورت“ بن گئی تھی کیونکہ اسے ٹیپ ریکارڈ سے لے کر ویکویم کلینر تک کے استعمال کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ جو بال کٹوا کر بھی Polished نظر نہیں آتی تھی۔ بنے کا ڈرا کر کرتے ہوئے خوف آتا تھا اور جو بت صبح اٹھ کر دوشو کا لٹکا کر لگتی تھی۔

وہ ہاتھ میں کپڑے لیے خود کو آئینے میں دیکھنے لگی، تو کیا وہ واقعی بے وقوف نظر آنے لگی ہے! وہ کبھی بدل گئی تھی اس کے بال چھوٹے چھوٹے پھسوں کی شکل میں گردن کے پاس پڑے تھے۔ اگرچہ وہ ایک

اپ کے فن میں اب اناڈی نہیں رہی تھی، مگر محکم نے اس کے چہرے پر ڈیرے ڈال رکھے تھے اور وہ ایک آپ کی شوخ توں میں بھی نہیں چھپ رہی تھی، یوں بھی وہ جوانی کی حدود چھانچ چکی تھی۔ وہ اب ۴۲ برس کی تھی۔ اب سے تیس برس پہلے صدر شاہ سے اس کی شادی ہوئی تھی، کلرک کی بیوی کی حیثیت سے پچیس برس گزارنے کے بعد شوہر کی اڑان کا ساتھ دینے کے لیے اس کے پاس بال و پر نہیں رہے تھے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ناقص زندگانی اس کے جسم کی ساری توانائیاں نچوڑی تھیں مگر صدر شاہ پچاس برس کا ہونے کے باوجود بہت توانا اور تندرست نظر آتا تھا، بڑی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ ہسٹونے دونوں لڑکے پائین بل اسکول مری میں داخل ہو گئے تھے۔ بڑا لڑکا یونیورسٹی کا امتحان پاس کر کے طالبہ چلا گیا تھا۔ فراغت ہی فراغت تھی۔ جہاز اڑان کے لیے پر تول رہا تھا۔ مٹی آواز میں اناڈ سنسٹ گون رہی تھی اور وہ اپنی ہیلٹ ہانڈ سے لگی، جسمی صدر شاہ نے گردن موڑ کر بہت بے زار لہجے میں کہا۔

”اب پچھلی پارکی طرح مجھ پر اٹھنی نہ کرنا“ لفافہ لے کر منہ پر سے کلو، میرا دل بڑا خراب ہوتا ہے۔“ اس نے چپ چاپ اس کے حکم کی قیبل کی۔

یہ وہی صدر شاہ تھا جو شادی کے بعد کہا کرتا تھا ”میں کتنا خوش نصیب ہوں، دنیا کا خوب صورت تختہ قدرت نے تمہاری شکل میں مجھے دے دیا ہے۔“ وہ وقت اسے ابھی بھولا نہیں تھا جب پہلی بار بس میں دو بار ہو کر وہ اپنے سرال آ رہی تھی تو اچانک اس کا جی تھلانے لگا، وہ لٹایاں کرنے لگی تو صدر اپنا سرخ ردیاں نکال کر اس کے ہاتھوں اور کپڑوں کو پونچھنے لگا۔ وہ کتنی شرمندہ ہو رہی تھی مگر وہ کتنی محبت سے اسے تسلی دے رہا تھا۔ ”کوئی بات نہیں... کوئی بات نہیں...“ اس بات کا اس کی سیلیوں نے کتنا مذاق اڑایا تھا۔

مگر اب ہر چیز بدل گئی تھی۔ صدر شاہ اور وہ خود بھی۔ پہلے وہ ذرا دیر سے گھر آتا تھا تو وہ کتنے رعب سے پوچھا کرتی تھی۔

”تم کہا تھے اب تک۔“ پھر وہ دودھ جایا کرتی تھی، مگر اب اگر کبھی راتیں بھی وہ نہ آتا تھا تو زینو پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی، وہ ایک ہی بات کہہ کر اس کا منہ بند کر دیتا۔ ”ضروری کام تھا“ میرے کاموں میں دخل مت دیا کرو۔ سمجھیں! مجھے بہت ضروری کام بھی کرنا ہوتے ہیں، پسنا بنا خالہ جی کا مکمل نہیں ہے۔“

پہلے وہ شوہروں کی طرح برتاؤ کرتا تھا مگر اب وہ آقاؤں کی طرح بولتا اور بات کرتا تھا۔ کتنا فرق ہو گیا تھا اس صدر میں اور اس صدر میں۔ دکھ اس کی پور پور شمرائت کرتا جا رہا تھا۔

اداسی اور تنہائی کا جھگڑا اس کے آس پاس پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگے تھے۔ جسم کے ہر ہر حصے سے اچانک درد کی لہریں اٹھ اٹھ کر سارے وجود کو گھیرے میں لینے لگیں۔ اس نے پہلے سانس اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ اس کا شور ہر ایڑ ہو سٹس کو بلا کر کہہ رہا تھا۔

”پلیز زرا انھیں سنبھالیں، انھیں شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہے“ اور پھر اسے سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ دو ہاتھوں نے اسے دوائی دی، جسے وہ تیزی سے نکل گئی اور سو گئی۔

اچانک ہی ایک تیز جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی اور سوچنے سمجھنے پوچھنے سے پہلے ہی ایک دھماکا ہوا اس نے خود کو ہوا میں اچھلتے ہوئے محسوس کیا اور پھر تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔



وہ شاید کسی کپڑے کے کانٹے سے بیدار ہوئی تھی، ایک موت کی سی غوغا آمیز نیند نے اس کے اعصاب جکڑ لیے تھے۔ وہ اپنے پیروں پر بشکل کھڑی ہو پائی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب ایک ناقابل برداشت منظر تھا۔ چاروں طرف جہاز کے پرزے بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی بچے نے کھلونے کو توڑ کر پھینک دیا ہو، زمین اتنے انسانوں کا رنگ چوس کر بھی زرد اور بھر بھری تھی۔ دور تک جلی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان پھنسے ہوئے انسانی اعضا جہاز کی بربادی کی داستان بنا رہے تھے۔ اب کیا بچا تھا؟ نہ کسی کا نشان نہ پہچان، وہ کانپی لرزی، اور دوبارہ مٹی پر گر گئی مگر بے ہوشی کا یہ وقفہ مختصر رہا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جسم دھوپ میں جھلنے لگا تھا۔ تب اس نے آنکھیں کھولیں، اپنے زندہ ہونے کو تسلیم کیا اور اپنے ذہن کو بیدار کیا، اسے پانی کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی چند قدم چلی، پانی اس سے زیادہ دور نہ تھا۔ سامنے ہی جھیل تھی، آبی پرندوں کی میٹھی آوازوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا، وہ ڈنگا گئی جھیل تک پہنچ گئی، پیاس بجھانے کے بعد دیر تک جھیل کے کنارے ہانپتی رہی پھر اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واپس میدان تک آگئی۔ اتنے بڑے میدان میں وہ واحد شخص تھی۔

یہ سوچتے ہوئے کہ اسے بھی موت آجاتی تو اچھا تھا اس کا دل بھر آیا۔

اس کا اپنا صفر شاہ اس کا ساگ کہاں تھا۔ وہ دیوانہ وار ڈھونڈنے لگی۔ اسے ایک پھٹا ہوا بیگ نظر آیا۔ پھٹے ہوئے بیگ کی دھجیاں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ جگہ جگہ انسانی اعضا بکھرے پڑے تھے، اس نے آنکھیں بند کرنا چاہیں، رونا چاہا مگر کچھ نہیں کر سکی۔ اس کے اعصاب جیسے منجمد ہو گئے تھے اور جمی گئی تھیں۔

جھاڑیوں کے اندر سے آتی ہوئی ایک کراہ نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ پاگلوں کی طرح جھاڑیوں میں کھس گیا۔ یہ آواز تو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ صفدر شاہ لولمان وجود لیے اور ہڑا ہٹا۔ وہ بے ساختہ اس پر بھٹکتی چلی گئی۔

"تم ٹھیک ہو؟؟ تم بول سکتے ہو۔۔؟ تم آنکھیں کھولو میں زندہ ہوں۔ میں تمہاری بیوی زینت ہوں، انھو دیکھو کتنی قیامت برپا ہوئی ہے۔" مگر وہ اس کی باتیں نہیں سن پایا۔ زینت نے اس کی پیشانی سے ہرہہ کر آنکھوں کے گرد جمع ہونے والے خون کو صاف کیا تو وہ اس قاتل ہوا کہ اپنی آنکھیں کھول سکے مگر ابھی اس کے حواس قابو میں نہیں تھے۔ وہ اسے ٹھیک کر درخت کے سائے میں لے آئی۔ پھر جمیل کی طرف دوڑی۔

پانی طلق میں اترتے ہی صفدر شاہ کے چہرے پر زندگی کی چمک لوٹ آئی۔

موت کے اس میدان سے انھیں تین زندہ افراد اور مل گئے۔ زینت نے بڑی مشکل سے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے بکسٹوں کے پیچھے کچھ پھٹک اور خشک دودھ کے دو تین ڈبے اکٹھے کیے۔ زینوں کو پانی دیا۔ پانی کے لیے اس نے ہماڑی کی ایک لائٹ کا کور ہیلے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سب کام تنہا کر رہی تھی۔ اس بولناک حادثے میں صفدر کی ناگہانی دشمنی ہو گئی تھیں مگر وہ غم خطر ناک نہیں تھے مگر مرہم پٹی کی ضرورت تو تھی، اس نے جنگلی جڑی بوٹیوں سے مرہم بنا کر سب زینوں کے لپ کیا۔ کپڑوں کی دھجیاں بیٹوں کے طور پر استعمال کیں مگر اس کے باوجود اگلے روز دو زخمی، جن میں ایک یارن مالہ لڑکا بھی شامل تھا زخموں کی تاب نہ لا کر چل بے، ایک انگریز لڑکا جس کی عراس کے پینے کے برابر زخمی کافی سستھل گیا تھا۔ وہ زینو کا ہاتھ بٹانے لگا۔ دونوں مل کر ہماڑی بکری اشیاء تلاش کیں، کچھ ضروری اشیاء کا ذخیرہ کر لیا۔ لائٹری کی مدد سے آگ جلانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زینو نے دونوں مردوں کے لیے کھانا تیار کیا، جیسے ہی بجتی ہوئی چھلی کی بوفضا میں پھیلی، ان تینوں کے چہرے زندگی کے بھرپور احساس سے دمک اٹھے، آگ سے اٹھنے والے دھوئیں کی تیز زندگی کا پیغام لے کر آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھی۔ وہ اس روز بہت خوش تھے۔ مرنے والوں کا غم مل سے دھل سا گیا تھا۔

یہاں کی دنیا میں یہ خبر بہت دھ سے سنی گئی تھی کہ سوئٹزر لینڈ جانے والی فلائٹ نمبر ۵۵۷ کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ بد نصیب طیارے کے مسافروں کی تصویریں دنیا بھر کے اخباروں میں دھڑا دھڑا چھپ رہی تھیں، یہ اخبارات مختلف حاشیہ آرائی سے خیریں پیش کر رہے تھے۔ ان میں کچھ افواہیں بھی شامل تھیں مثلاً جہاز فلاں فلاں جگہ دیکھا گیا، یا اسے کسی باغی تنظیم نے اغوا کر لیا ہے، آخری پیغام

خلیفہ ہارون الرشید اور حاضر جواب باغی

فلاط عباسیہ کے باغیوں میں سے ایک آدمی پکڑا گیا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے پوچھا۔

"تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

اس پر باغی نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے جیسا آپ چاہتے ہیں کہ یوم قیامت آپ کے رب کی طرف سے آپ کے ساتھ کیا جائے اور اس وقت آپ کے سامنے میرا وجود دنیا کی حقیر ترین چیز ہے۔" اس طرح اس نے خلیفہ کو باور کرایا کہ یوم قیامت دارِ جحش کے سامنے خلیفہ کا جحش کے ایک حقیر جی ہو گا۔

اس پر ہارون الرشید نے اسے چھوڑ دیا اور کہا۔ "جہاں جانا چاہتے ہو پلے جاؤ۔"

اس خلیفہ پر ہارون الرشید کے بعض صحابوں نے اسے اس باغی کی ہلاکی کی صورت میں پیش آنے والے فخرات سے ارایا۔ خلیفہ نے اسے واپس بلانے کا حکم دیا۔ جب وہ باغی آیا تو اس نے خلیفہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے قاتلِ صد احزام خلیفہ! میرے معاملے میں ہے صاحبزادے کی اطاعت نہ کرنی اور ان کی بات نہ مانیں۔ اگر یوم قیامت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملے میں اپنی فطرت کی بات مان لی تو آپ کو دوسروں پر کوئی برتری حاصل نہ رہے گی۔"

اس باغی کی یہ بات خلیفہ کے دل کو لگی اور اس نے اسے پھر چھوڑ دیا۔

اور آخر پڑنے موصول کیا تھا اس کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی۔ ان ساری باتوں کی ساتھ ساتھ ہماڑی تلاش میں مختلف ممالک کی زمینیں روانہ ہو چکی تھیں۔

یہ

زینو اپنے شوہر کی تیار داری بڑی تندہی سے کر رہی تھی گواس کے زخم خاصی حد تک مندمل ہو چکے تھے مگر ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا، وہ اس کے کپڑوں کو دھوئی، بڑے پیار سے اس کا منہ دھاتی۔ اس کے لیے جمیل سے تازہ چھلی پکڑ کرائی۔ اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلاتی۔ زخموں کی دیکھ مال بڑی توجہ سے کرتی مگر ان تمام باتوں کے دوران وہ خاموش رہتی۔ اگر کبھی صفدر بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ہوں ہاں میں جواب دے کر پھر چپ ہو جاتی، انگریز لڑکا سارا وقت شکار کے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی بنائے میں مصروف تھا، یوں بھی وہ اردو بول نہیں پاتا تھا، تینوں ایک ہوتے، وہ بھی جدا جدا اگلتے تھے، اور صفدر کو اس خاموشی سے دشت ہونے لگتی تھی، اس کا دل چاہتا تھا زینو اس کے پاس بیٹھے، چاہے ایک وقت کا کھانا نہ دے مگر کوئی بات کرے اس حادثے کے متعلق، ابدہ اندہ کی بارے میں، جیتے ہوئے دنوں کے قصے، کچھ بولے، مگر وہ خاموش تھی، فالٹو وقت وہ ڈیوڈ کے ساتھ چھوٹی سی بنائے میں مصروف رہتی۔

اس روز زینت جمیل سے چھٹی پکڑ لائی تھی ڈیوڈ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ صفدر کو بھوک لگ رہی تھی، وہ چھٹی آگ پر بھون کر چٹوں پر رکھ کر لائی تو صفدر نے اسے روک لیا۔
”زینت۔۔۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“

زینت۔۔۔؟ اس نام پر چونک کر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو کیا اسے میرا نام یاد آیا ہے، کیونکہ یہاں نوکروں کی بیٹھ نہیں ہے، یہ اس کے مصائب کا دور ہے۔ جیسی میرا نام اس کی زبان پر گیا۔ آلو اس کی آنکھوں کی حد تو ذکر بہرہ جانے کو بے تاب ہو گئے تھے۔ برسوں سے کھوئی ہوئی یہ اپناتیت دوبارہ کردہ پوکھلا سی مگر صفدر کے سامنے وہ اپنی اس کمزوری کا اعتراف نہیں کرنا چاہ رہی تھی،
”یہ آج تمہیں میرا نام کیسے یاد آیا، تم تو مجھے چند برسوں سے بے وقوف عورت کے نام سے پکارا لگے تھے۔ زینت تو میں صرف اس وقت تک تھی، جب میں تمہاری غزبت کی ساقی، تمہاری گندی بنائیں اور براہیں دھویا کرتی تھی، تمہاری نسل کی افزائش کے قابل تھی۔ تمہارے بھونے سے گھر صاف کرتی تھی، اب تمہیں ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ نوکر لگنے ہیں، راتیں بسر کرنے کے لیے خوب صورت عورتیں ملنے لگی ہیں، اب میری حیثیت ہی کا ہے، ایک بے وقوف عورت بے وقعت اور بے قیمت عورت ہوں، یہ تم سے جو کبھی کہا کرتے تھے، کھاش زینت میرے پاس اتنا پیسا ہو کہ میں تمہارے قدموں پر بٹھاد کر دوں۔ اب پیسا آیا ہے تو مجھے معلوم ہوا ہے دولت نے تمہاری نظر میں ہر شے کی قیمت مقرر کر دی ہے، اسی لیے میری قیمت ایک پرانے فریج سے بھی کم ہو گئی ہے۔ میں اب تمہارے لیے صرف ایک بے وقوف عورت کی شیت رکھتی ہوں، پھر یہ آج تم نے مجھے زینت، کہہ کر کیوں پکار لیا۔“

وہ یہ سب باتیں کہنا چاہتی تھی مگر زبان سے چپ کا تالا نہ ٹوٹا۔
”تم کیا سوچنے لگیں۔؟“

اس نے اپنی اٹھارہ نظریں اٹھا کر صفدر کو دیکھا۔ ناگوں کی تکلیف نے اسے کتنا کمزور اور زرد کر دیا تھا۔ کیا لگہ کرنے کا یہی وقت ہے بھلا؟ اچھا ہو، یہ الفاظ آواز میں بنے۔ کیا خدا کا شرا دار کرنے کو یہ کم ہے کہ یہ زندہ ہے، جو بیت گیا سو بیت کیا، اگر شام کو صبح کا بھولا لگہ آجائے تو اسے بھولا نہیں کہا کرتے، اب وہ کتنے پیار سے اسے پاس بیٹھا تھا، کتنے ممنون لہجے میں کہتا تھا۔
”تم تو میری سیما ہو، اور آج اس نے مجھے میرے نام سے پکارا ہے۔ خطائیں معاف کرنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اس کے دل میں پیار کے جھرے پھر سے پھونکنے کو بے تاب ہو گئے۔“

ایک سزاوارٹ ایکٹرس سے پوچھا گیا۔ ”عورت اپنے آپ کو ہر ضابطہ محسوس کرتی ہے۔“
ایکٹرس نے کہا جانے والی نظروں سے سوال کرنے والے کو کھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کیا معلوم؟ ابھی میں عمر کی اس حد میں کب پہنچی ہوں؟“
کراچی سے محمد قیصر خان لودھی کی جنجور۔

”مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔ میں شرمندہ ہوں زینت کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ مجھے قدرت نے اس غفلت کی سزا دی ہے، جو پچھلے پانچ برس میں تم سے کرتا رہا ہوں، اب میں کہتا ہوں کہ جب واپس جاؤں گا تو تمہارے نام پر ایک ہسپتال بنواؤں گا۔ یہ تمہاری اس محبت کا صلہ دے گا جو تم مجھ سے کرتی ہو۔ ان دنوں کی یاد گار وہ ہسپتال پورے ملک میں تمہارے نام سے مشہور ہو جائے گا۔ میکرو لوگ میری زینت کو دعائیں دیا کریں گے۔“
دل کی بجز زمین بیکھت لہذا انجی۔ سنگا ج چٹانوں سے محبت کے سوتے پھوٹ نکلے۔ زینت کی آنکھوں سے بھر بھر آنسو بہنے لگے، صفدر نے زینت کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔
ایک ماہ گزر گیا، ڈیوڈ کے بازو پر چاقو کے گرے نشان زخم کی صورت اختیار کر گئے تھے یہ زخم اسے مار کے دوران آئے تھے اور اب زخم خامے خراب ہو گئے تھے۔ وہ شکار کرنے سے معذور ہو گیا تھا، اب سارا کام زینت کے حصے میں آیا تھا۔ ڈیوڈ سارا دن درخت کی چھاؤں میں بیٹھا لکڑیاں اور پتے الاؤں پھینکتا رہتا۔ اس کی نظریں آسمان پر پھنکی رہتیں کہ شاید کوئی طیارہ یا بمبلی کا پھران کی تلاش میں ادھر اٹکے، مگر بروقت اس کا علاج نہ ہو سکا تو وہ سسک سسک کر مرجاتا۔ وہ دھکے سے سوچتا رہتا، یہ عورت اپنی شوہر کی بیمار داری میں کتنی مگن و مسرور ہے، دونوں کھٹوں جانے کہاں کہاں کے قہے سناتے رہتے ہیں کھاش مجھے ان کی زبان آتی۔ یا یہ عورت میری اپنی قوم کی ہوتی تو میری تمہاری اتنی بھیابک نہ ہوتی۔۔۔!

اور صفدر شاہ زینت کے کانڈھے پہ ہاتھ رکھ کر بڑی مسرت سے کہتا۔ ”چتا نہیں ہم واپس بھی جا سکیں گے یا نہیں مگر مجھے اب اس کی پروا نہیں ہے تم جو میرے ساتھ ہو۔ یہاں تو موت بھی آسمان ہو جائے گی۔ شرنے مجھے تم سے دور کر دیا تھا اگر اس جنگل میں تم نہ ہو تو میں کب کا مرجچکا ہوتا، تم ہی دل میں مل سکتی ہو گی کہ میں کتنا خود غرض ہوں۔“

”آپ ایسی باتیں نہ کیا کیجیے۔“ زینت اس کے منہ پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔
”اب مجھے اپنے مرنے کا اتنا غم نہیں ہو گا دیکھ صرف یہ ہے کہ میں تمہیں کوئی سکھ نہ دے سکے، میری

دولت نے تمہیں غم غمی غم دیے شاید مجھے اب ظانی کا قدرت کوئی موقع نہ دے۔“

”صفر تم اتنے پاپس کیوں ہوتے ہو؟“

”زینت تم، میری نظروں کے سامنے رہا کرو، ہر وقت باتیں کرتی رہا کرو۔“ صفر اسے اپنے اور قہار

لیتا۔

دہاں جنگل تھا، اداسی تھی تھمائی تھی، کسپیری تھی مگر زینت کے چہرے سے اداسی کی دھول ہوا
پہلی تھی۔ وہ ہردم ترو تازہ اور چاق و چوبند رہتی تھی۔ صبح سے شام تک وہ دونوں مریضوں کا کام کرتے
تھکن نے کبھی اسے مدح حال نہ کیا۔ اس کے لیوں پر مسکراہٹوں نے بے برا کر لیا تھا۔ کئی ماہ پہلے ڈاکٹروں
اس کے شوہر سے کہا کہ تمہاری بیوی کو دل کا مرض ہو گیا ہے مگر اب اس کے دل نے جھٹکے کہاں
دیے تھے تھکن بھی جانتی تھی سبک رفتاری آگئی تھی اس کی زندگی میں۔

اور پھر وہ بعد ایک پہلی کا پڑنے اس بڑے پے پھر لگایا، ڈیوڈ نے شور مچا دیا اور پھر اس کی
گزارش میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ڈیوڈ کی چلائی ہوئی آگ کا دھواں رہبر بن گیا۔

”پہلی کا پڑ۔۔۔ پہلی کا پڑ۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ اس طرف۔“ صفر پاپوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

دیکھ لیا گیا ہے ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ وہ خوشی سے دیوانوں کی طرح زمین پر گھٹ رہا تھا اور اس
رہا تھا جہاں گرد و غبار نے گھیر ڈالا تھا۔ ڈیوڈ یو کھلا کر اٹھا، اس کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئی تھیں

زینت جمیل پر اپنے کپڑے دھو رہی تھی، وہ بہتہ حال میں تھی اس لیے اب الفور سامنے نہیں
تھی، جلدی جلدی گیلے کپڑے نچوڑ کر پہننے لگی۔ اب گرد و صاف ہو چکی تھی۔ پہلی کا پڑ کا دروازہ کھل
تھا۔ زندگی کی نوید لیے دو مسکراتے چہرے انھیں موت کی وادی سے نکالنے آ پہنچے تھے۔ صفر اور ا

دہاں پہنچ چکے تھے۔ زینت بھی بھاگی دوڑتی ان تک پہنچ گئی۔ صفر اسے دیکھتے ہی چلا یا۔

”اوپے وقف عورت تم جمیل پر اتنی دیر سے کیا کر رہی تھیں کیا تمہارے کان بہرے ہو گئے۔“

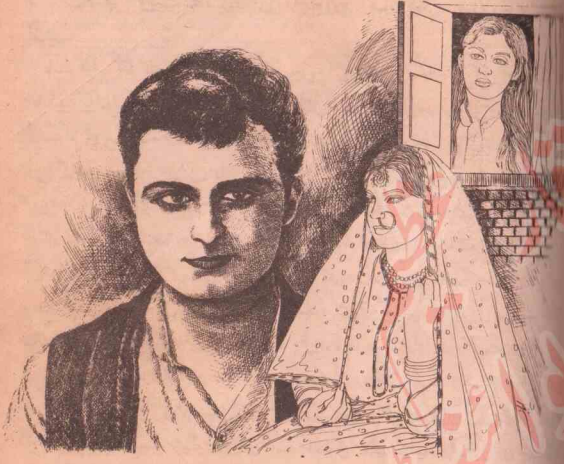
اب جلدی کرو، تمہیں آوازیں دے دے کر میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔ کیا آج ہی دھول

کپڑے۔“

اور زینت کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گیلے کپڑوں سے پانی نہیں دل صد چاک کا لہو
بوند ٹپک رہا ہے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ چند قدم پہلی اور دو ہاتھوں نے اسے کرنے سے پہلے
لیا۔ پہلی کا پڑ کی گھر گھر میں اسے آواز آئی۔

”زیادہ خوشی بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے!!“

خطہ جہ زندگ کسی کسی لمحہ کسی کسی لمحہ پیش آ سکتا ہے
کیا آپ بھی کسی خطہ کے اپنے تعاقب میں محسوس کرتے ہیں؟



خطہ

آسیہ سلیم قریشی

آج میں بے حد مفہوم ہوں۔ اف معاف کیجیے گا۔ میری بیوی صائمہ مجھ پر بہت شک کرتی ہے۔ دیے
نہ میری دوسری بیویاں بھی میرے معاملے میں بے حد شک ہیں۔ یہاں تک کہ وہ میگزین جن میں خواتین کی
تصاویر ہوتی ہیں، وہ بھی میری نگاہوں سے چھپا چھپا کر کشتی تھیں، حتی الامکان کوشش کرتی تھیں کہ میں
کسی لڑکی سے نہ مل سکوں پھر بھی میں انھیں چکر دیے میں کیا یا ہو جاتا تھا اور ادھر ادھر منہ مار لیتا تھا
لہذا یہ میری موجودہ بیوی تو میری جان کا عذاب بن گئی ہے۔

وہ۔۔۔ وہ خالہ ہے، مجھے میری اور اپنی کزنز سے نہیں ملنے دیتی۔ ہاے ہائے کیسی دلکش اسارت، تیز

طرار لڑائیاں ہیں جو مجھے خاصی لگتی ہیں۔ لیکن ان کو میرے قریب دیکھنے کی میری زوجہ محترمہ برساتی وقت کی طرح میرے سر پر دھرتا مار کر بیٹھ جاتی ہیں اور وہ اچھی پہلی کزنز جو چند سیکنڈ اکھیلیاں کر کے ہوسے نہایت بے تکلفی سے مجھے رخصتی پکار رہی ہوتی ہیں ایک دم محتاط رویہ اپنا کر رضا بھائی پر اڑ آتی ہیں۔

ہائے گھونرے لگتا ہے اس وقت میرے نازک دل پر، یہی نہیں وہ بھاگوان مجھے اپنی سیلیوں سے متعارف تو کیا کروائے گی ان کا لطیف سادہ بھی مجھ پر نہیں پڑنے دیتی۔ اول تو وہ خود اپنی سیلیوں سے ملے ان کے گھر پہلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب سیلیوں سے ملے جاتی ہوگی تو وہ یقیناً یہی چاہتی ہوگی کہ بدلے میں وہ بھی صائمہ کے گھر کا کریں اور اس صائمہ نے انھیں گھر آنے سے روکنے کے لیے میری عیاشیوں اور بد معاشریوں کے سختی سے قصے بڑھا چڑھا کر بتائے ہوں گے کہ وہ ڈر کے مارے میرے گھر کا رخ نہیں کرتیں، مجھے تو یہ سب سوچ سوچ کر بے حد اذیت ہوتی ہے کہ ان لڑکیوں کے سامنے میری بیوی، میری شریک حیات نے میرا بیچ کر طس کر دینا کیا ہوگا۔ ”میں ہوں واضحاً نہ لاہور کا بہت بڑا بزنس مین جو دولت سے کھیلتا ہے۔ میں اپنے خوبصورت ماڈل کے گھر میں تن تنہا اپنے ملازموں کی فوج کے ساتھ رہتا ہوں اور لڑکیوں پر بے تحاشا رویا خرچ کر کے خوش ہوتا ہوں۔ صاحبو! اگر کوئی مجھ سے میری تمام ضروریات اور خوبصورت گھر چھین لے تو مجھے اس قدر دکھ نہیں ہوگا جتنا کہ مجھے صنف نازک کی حسین نگاہوں میں اپنے لیے لاشعقی اور بے اعتمادی دیکھ کر ہوتا ہے۔ دراصل تصور تو ان بھولی بھالی خواتین کا بھی نہیں ہے جب ان کے سامنے میری بیوی ٹوٹے بھانے لگی، میرے خلاف زہر اگلے گی تو وہ سب مجھے بواؤس سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ ذرا دیکھیے تو یہ میری بیوی صائمہ جس کی خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ دنیا بھر کی عتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ قیمتی سے قیمتی تحائف دیے۔ اس کی جائز ناہاجت خواہش پوری کیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کی خاطر میں نے اپنی تیری بیوی، میرے سر فریدہ کو طلاق دے دی تھی۔

ہائے فریدہ کے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں وہ کتنی بھرپور عورت تھی۔ کیسی سوزن سے زیادہ سبکی تھی۔ جذبات کا آتش فشاں چھپا ہوا تھا اس میں۔ اس کا اثر فریدہ کی زبان پر بھی ہوا تھا، زبان جو ہر وقت لاوا لگتی رہتی تھی۔ یا درودہ کیا غضب کی وکیل تھی بلکہ ابھی ہے۔ وہ مجھے اپنے دو تین مقدموں کی کارروائی دکھانے کے لیے پھر بھی لے گئی تھی اور میں حیران پریشان، منہ کھولے آنکھیں چھاڑے مقدمے کی کارروائی دیکھتا رہا۔ ایمان لگتی کھوں؟ پہلے تو میں اسے کوئی خاص قابل نہیں سمجھتا تھا لیکن

ہائے گھونرے لگتا ہے اس وقت میرے نازک دل پر، یہی نہیں وہ بھاگوان مجھے اپنی سیلیوں سے متعارف تو کیا کروائے گی ان کا لطیف سادہ بھی مجھ پر نہیں پڑنے دیتی۔ اول تو وہ خود اپنی سیلیوں سے ملے ان کے گھر پہلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب سیلیوں سے ملے جاتی ہوگی تو وہ یقیناً یہی چاہتی ہوگی کہ بدلے میں وہ بھی صائمہ کے گھر کا کریں اور اس صائمہ نے انھیں گھر آنے سے روکنے کے لیے میری عیاشیوں اور بد معاشریوں کے سختی سے قصے بڑھا چڑھا کر بتائے ہوں گے کہ وہ ڈر کے مارے میرے گھر کا رخ نہیں کرتیں، مجھے تو یہ سب سوچ سوچ کر بے حد اذیت ہوتی ہے کہ ان لڑکیوں کے سامنے میری بیوی، میری شریک حیات نے میرا بیچ کر طس کر دینا کیا ہوگا۔ ”میں ہوں واضحاً نہ لاہور کا بہت بڑا بزنس مین جو دولت سے کھیلتا ہے۔ میں اپنے خوبصورت ماڈل کے گھر میں تن تنہا اپنے ملازموں کی فوج کے ساتھ رہتا ہوں اور لڑکیوں پر بے تحاشا رویا خرچ کر کے خوش ہوتا ہوں۔ صاحبو! اگر کوئی مجھ سے میری تمام ضروریات اور خوبصورت گھر چھین لے تو مجھے اس قدر دکھ نہیں ہوگا جتنا کہ مجھے صنف نازک کی حسین نگاہوں میں اپنے لیے لاشعقی اور بے اعتمادی دیکھ کر ہوتا ہے۔ دراصل تصور تو ان بھولی بھالی خواتین کا بھی نہیں ہے جب ان کے سامنے میری بیوی ٹوٹے بھانے لگی، میرے خلاف زہر اگلے گی تو وہ سب مجھے بواؤس سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ ذرا دیکھیے تو یہ میری بیوی صائمہ جس کی خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ دنیا بھر کی عتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ قیمتی سے قیمتی تحائف دیے۔ اس کی جائز ناہاجت خواہش پوری کیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کی خاطر میں نے اپنی تیری بیوی، میرے سر فریدہ کو طلاق دے دی تھی۔

ہائے فریدہ کے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں وہ کتنی بھرپور عورت تھی۔ کیسی سوزن سے زیادہ سبکی تھی۔ جذبات کا آتش فشاں چھپا ہوا تھا اس میں۔ اس کا اثر فریدہ کی زبان پر بھی ہوا تھا، زبان جو ہر وقت لاوا لگتی رہتی تھی۔ یا درودہ کیا غضب کی وکیل تھی بلکہ ابھی ہے۔ وہ مجھے اپنے دو تین مقدموں کی کارروائی دکھانے کے لیے پھر بھی لے گئی تھی اور میں حیران پریشان، منہ کھولے آنکھیں چھاڑے مقدمے کی کارروائی دیکھتا رہا۔ ایمان لگتی کھوں؟ پہلے تو میں اسے کوئی خاص قابل نہیں سمجھتا تھا لیکن

ہائے گھونرے لگتا ہے اس وقت میرے نازک دل پر، یہی نہیں وہ بھاگوان مجھے اپنی سیلیوں سے متعارف تو کیا کروائے گی ان کا لطیف سادہ بھی مجھ پر نہیں پڑنے دیتی۔ اول تو وہ خود اپنی سیلیوں سے ملے ان کے گھر پہلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب سیلیوں سے ملے جاتی ہوگی تو وہ یقیناً یہی چاہتی ہوگی کہ بدلے میں وہ بھی صائمہ کے گھر کا کریں اور اس صائمہ نے انھیں گھر آنے سے روکنے کے لیے میری عیاشیوں اور بد معاشریوں کے سختی سے قصے بڑھا چڑھا کر بتائے ہوں گے کہ وہ ڈر کے مارے میرے گھر کا رخ نہیں کرتیں، مجھے تو یہ سب سوچ سوچ کر بے حد اذیت ہوتی ہے کہ ان لڑکیوں کے سامنے میری بیوی، میری شریک حیات نے میرا بیچ کر طس کر دینا کیا ہوگا۔ ”میں ہوں واضحاً نہ لاہور کا بہت بڑا بزنس مین جو دولت سے کھیلتا ہے۔ میں اپنے خوبصورت ماڈل کے گھر میں تن تنہا اپنے ملازموں کی فوج کے ساتھ رہتا ہوں اور لڑکیوں پر بے تحاشا رویا خرچ کر کے خوش ہوتا ہوں۔ صاحبو! اگر کوئی مجھ سے میری تمام ضروریات اور خوبصورت گھر چھین لے تو مجھے اس قدر دکھ نہیں ہوگا جتنا کہ مجھے صنف نازک کی حسین نگاہوں میں اپنے لیے لاشعقی اور بے اعتمادی دیکھ کر ہوتا ہے۔ دراصل تصور تو ان بھولی بھالی خواتین کا بھی نہیں ہے جب ان کے سامنے میری بیوی ٹوٹے بھانے لگی، میرے خلاف زہر اگلے گی تو وہ سب مجھے بواؤس سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ ذرا دیکھیے تو یہ میری بیوی صائمہ جس کی خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ دنیا بھر کی عتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ قیمتی سے قیمتی تحائف دیے۔ اس کی جائز ناہاجت خواہش پوری کیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کی خاطر میں نے اپنی تیری بیوی، میرے سر فریدہ کو طلاق دے دی تھی۔

صائمہ تو حد سے زیادہ گزرتی جا رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں میرے بارے میں میری بیویوں کا بھی یہی خیال تھا کہ میں عیاش.... بدعاش اور بے وفا ہوں۔ درحقیقت یہ سارا پروپیگنڈہ میرے دوستوں نے کیا ہے۔ ان کی کسر میری بیگمات نے پوری کر دی۔ وہ عورتوں اور لڑکیوں کو میرے گرد منڈلاتا دیکھ کر جل مرتے ہیں۔ ان بخت جل نکلے کہیں کسے..... او نہ خود میرے دوستوں کو تیز نہیں ہے کہ اس حسین مخلوق سے کہا سلوک کرنا چاہیے؟ ان کا دل جیتنے کے کر گیا ہیں؟ یہ نرم و نازک حسین کا بچہ کی لڑکی جیسی مخلوق اس کے ساتھ تو چھوٹی موٹی کے پھولوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ صنف نازک کو بھرپور پیار اور توجہ دو، ان کی فضول سی بات غور سے سنو۔ ان کی خوش کو اپنی خوشی اور ان کے دکھ کو بس اپنے پیٹے سے لگا لو اگر ان کے ساتھ ساتھ دو تین آنسو بھی بادلوں کے تو سمجھو میدان مار لیا پھر ان میں خوب گھماؤ پھراؤ، حنائی کی بارش کرو، تعریف و توصیف کرو۔ ان کے سراپے کی، ان کے لباس کی، ان کے کھیل کو اور بدن کو سناں مرم کا ترشا ہو جمنا۔ دلوں کو کالی کھٹا اور ہونٹوں کو لکاپ کی پتیوں سے نشیب دو۔ صاحبزادی کچھ تو میں کرتا ہوں، پھر آپ ہی بتائیں میری گرل فرینڈ کیسے مجھ سے خوش نہیں ہوں گی؟ ”ان کا بس چلے دو۔ میری راہوں میں اپنا دل، اپنی تلکیں بچھا دیں اور میری انہی خوبیوں کی بدولت یہ معزز خواتین مجھے دل میں دوز، موست فوسنی کیڑیڈ اور خیر بشل میں سمجھتی ہیں، آج صبح ایسی ہی بات پر میری صائمہ سے شدہ جھڑپ ہوئی۔ دیکھیے نا کتنی جمالت اور بد تیزی کی بات ہے۔ کچھ عرصے پہلے میری اسی بد اخلاق بیوی کا ایک میٹڈٹ ہو گیا تھا اور جس لیڈی ڈانسر نے اس کی جان بچائی اس کو اپنا خون بھی دینا پڑا۔ جی ہاں اپنا خون، آپ ہی بتائیں جس فرشتہ صفت عورت نے مجھ پر بلکہ صائمہ پر احسان عظیم کیا ہو؟ اسے دوسری زندگی بخشی ہو کیا میں اس کا شکر یہ ادا کرنے بھی نہ جاؤں؟ اوں ہوں یہ ناممکن ہے۔ میں اپنے اخلاق پر کیوں دھما گئے ہوں۔ وہ لیڈی ڈانسر کیا سوچے گی کہ میں کس قدر بد اخلاق، بد تمیز اور جاہل ہوں تو یہ توہین میری یہ اپیلیں صائمہ تکم کو متاثر نہ کر سکیں وہ فرمائے گئیں۔

”مشر رضا حسن میں ان جھانسون میں آنے والی نہیں ہوں۔ تم پہلے بھی اپنی خوش اخلاقی کی بدولت تین بیویاں پانچ لکے ہو، بس اب تم جاہل، بد اخلاق ہی آجھے۔“

”لیکن.... لیکن یہ میرے اصول مذہب کے خلاف ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہمارا مذہب تو ہمیں خوش اخلاقی کی تعلیم دیتا ہے نا۔“ تو پھر میں نے صاف صاف صائمہ سے کہہ دیا ہے کہ میں ڈانسر نا کرنا کا شکر یہ ادا کرنے ضرور جاؤں گا۔ اوہو بھی میں خود بھی کتنی زور پر ہوں اور اپنے ساتھ آپ کو بھی پور کر رہا ہوں میرا خیال ہے کہ آپ تفصیل سے میری دردناک کہانی سن ہی لیں۔ سچ ہے دنیا سے انصاف اٹھ چکا ہے۔

دل نفسا نفسی کا عالم ہے۔ قارئین مجھے امید ہے کہ میری کہانی پڑھنے کے بعد آپ بھی میری طرف دل ضرور کریں گے۔

قام لڑ پڑ گھٹا اسی دن شروع ہوا جس دن میری پہلی بیوی شاہدہ اپنے بیداروں میں ایک خط پڑھتے اور وہ قطار روٹی پائی گئی۔ میں دروازے پر ٹھک گیا اور مجھے دیکھتے ہی شاہدہ نے وہ خط کھینچے کے نیچے ڈال دیا۔ دیکھ کر میرے اندر شکی مردانہ گزائیاں لیتا بیدار ہو گیا۔ آخر یہ شاہدہ کس کا خط پڑھ کر رو رہی ہیں اس کا میکہ تو اسی شہر میں ہے بھلا انھیں خط کھینچنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ لوگ روزانہ آتے رہتے تھے اور اگر کسی سبیلی کا خط ہے تو بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے؟

”مرد ضرور“ کسی نے پاپا نے پاپا نے فریڈ کا خط ہو گا؟ یہ سوچتے ہی غصے سے میری کپٹیاں جھنچنے میں نے شاہدہ کی نرم آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے دل کش سراپا کا ایک سر رے کیا۔ وہ قیامت خیز کی مالکہ مجھ سے تقریباً پندرہ سال چھوٹی تھی۔ نازک اور کاسنی سی گزیا جسے سارا دن بچے سنورنے میں اس بدلنے سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ گھر واری کی طرف توجہ دے سکے۔ دیسے سچ تو یہ ہے ہر اسامات دل کش رہنے کا حکم انو صاف کچھ کا میری مجال کہ میں ملکہ حسن کے حضور دم تیا میں تو اس کو کرنا تھا، ہاں تو میں غصے سے جھٹاتا ہوا بڑھا۔

”کس کا خط پڑھ کر آنسو بہائے جا رہے ہیں؟“

”میں کر جا تو خلاف توقع شاہدہ نے ایک دم میرے گلے میں بائیں وال دیں اور سینے سے لپٹ کر بے لگا ہونے لگی۔ میں پوچھا کر رہا کہ اس کا اور سارا غصہ جھگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”ارے میری جان کیا ہوا؟“

”اے رضی میں آپ کو کیا بتاؤں؟“ وہ سسکتی رہی

”اوہو خدا ار شاہدہ کچھ تو بتاؤ مجھے اختلاف ہونے لگا ہے۔“

”رضی میری سبیلی نرسن کا خط آیا ہے۔ وہ بے چاری ہے حد تک کی اور پریشان ہے۔ اس کا شوہر اس پر ظلم ڈھاتا ہے، مارا پیٹتا ہے رضی میں تمہیں کیا بتاؤں نرسن کتنی اچھی اور کتنی خوبصورت لڑکی ہے اس کے ادب اش شوہر نے اس کی قدر نہیں کی اور وہ ایک طوائف کو گھر لے آیا ہے اور ملازمہ کی طرح نرسن سے اس طوائف کی خدمت کروانا ہے، رضی! بے چاری نرسن بھری دنیا میں تھا ہے، اس کا دل سارا نہیں ہے، وہ تو خود کشی کرنا چاہتی ہے۔ رضی میں نے اسے تاروے دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ وہ اپنے لیے اس کیسے انسان کو چھو کر ہمارے پاس آجائے۔ کیوں اچھا کیا ہے نا میں نے؟“ وہ اپنی

مصل جیسی بیگنی بیگنی آنکھیں اٹھا کر بولی۔

”ہاں... ہاں جان من بہت اچھا کیا ہے تم نے، مجھی بہت ہی ذلیل آدمی ہے وہ تمہاری شکل شوہر۔“ مجھے اس احمق جاہل انسان پر غصہ آنے لگا۔

”تو... تو رضی وہ کل ملتان سے بذریعہ ٹرین لاہور پہنچ رہی ہے۔ آپ اسٹیشن چلیں گے نا...؟“

سے بولی۔

”آف کورس ڈارلنگ یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“ میں نے شاہدہ کو پیار کرتے ہوئے کہا کہ بے تحاشا خوش ہو گئی اور اسی وقت ملازموں کو بلوا کر نرسن کے لیے کرا ٹھیک کروانے لگی۔ ہم رات کو سونے کے لیے لیٹے تو وہ میرے پهلوس کئی مستقبل کے پلان بناتی رہی۔

”رضی بے چاری نرسن نے بہت دکھ سہے ہیں، ہم اس کو بہت خوش رکھیں گے۔ خوب تمہاریں چلک متائیں گے۔ پکچر دیکھیں گے، وہ ناراضی...؟ وہ خوشی سے تمہاری تھی۔

قارئین ایمان سے میری تمام گمل فریڈ اور بیگمات میں سے یہ سماء شاہدہ بہت ہی سیدھی سادہ اور بھولی بھالی عورت تھی، بانی تو سب کی سب اعلیٰ قسم کی خرافات اور پالاجا حسینائیں تھیں۔

سو جناب ہم دوسرے دن اسٹیشن گئے۔ نرسن آگئی۔ اچھی خاص خوش شکل چھپیں سالہانہ تھی۔ شاہدہ نے میرا تعارف کروایا تو وہ بڑی اپنائیت سے لی۔ سار بار شکر یہ ادا کیا کہ میں نے اسے اپنے رہنے کی اجازت دی ہے۔ کہ پچھنچ کر چلے پڑتے ہوئے اس نے اپنی خانگی زندگی کے چھپے رازوں سے اجاڑ دیا۔ وہ ڈارو قطار روٹی رہی۔ شاہدہ بھی اس کا ساتھ دیتی رہی۔ کہانی ختم ہوئی تو میری تمام تر تندرستی نرسن کے ساتھ تھیں پھر دوسرے دن، ہم نے کار میں لاہور کا کوئٹہ چھاننا شروع کر دیا۔ لاہور کے تاریخی مقامات دیکھ کر اردو انگریزی یہاں تک کے پنجابی فلمیں بھی دیکھ والیں۔ سب ہوٹلوں کا کا

ٹھیٹ کیا۔ آہستہ آہستہ نرسن مجھ سے کھلتی گئی۔ بے تکلف ہوئی گئی تھی۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ نرسن کی سیاسی میں لپٹا جو دور حقیقت بہت ہی باغ و بہار اور زندہ دل ہے۔ وہ تو سرایا خوبی تھی۔ اتنی متاد

شخصیت کہ کوئی بھی اس کی رفاقت میں بورت محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

دو ہفتے پلک جھپکتے گزرے تو نرسن نے تھک کر اعلان کیا کہ بہت آوارہ گردی کر لی ہے اب گھر آئے گے۔ دوسرے دن سے میں نے آفس جانا شروع کر دیا۔ میری غیر موجودگی میں کافی کام اکٹھا ہو گیا تھا۔

کو واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی تھک کر رہ گیا۔ برآمدہ دیکری شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ سال پھولوں کے گلے قطاروں میں لگے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کرسیاں لگی تھیں۔ ڈارلنگ روم میں داخل

ہو کر دیکھا کہ ڈارلنگ روم کے فرنیچر کی ترتیب بدل کرنے سے سجایا گیا تھا۔

”ہاں جناب کیا خیال ہے؟“ شاہدہ کی کھٹکتی ہوئی آواز آئی۔ میں مڑا تو بی بی حسین گڑیا کود پڑے کربے

دارلنگ کیا۔

”دارلنگ کیا یہ سب کچھ تم نے کیا ہے؟ ایمان سے میں تو سمجھا تھا کہ میں کسی اور کے گھر میں گھس

اگرے... رے رضی... حضور محنت کسی نے کی اور کریڈٹ آپ کی دوسرے کو دے رہے ہیں۔“

”خوش آواز ابھری تو میں نے دیکھا تلکے سے پیاز کرنا شلوار میں پلوس گردوغبار میں اٹی نرسن ہاتھ

”اب... خوب تو یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے...؟“ پیاز کرتے کے گربان کے دو بٹن کھلے تھے۔

”میں حضور! وہ ہاتھ باندھ کر جھکی تو میرا دل ڈوبنے ابھرے لگا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ شادی کو پانچ سال گزر گئے ہیں اور ایک دن بھی ہماری شاہدہ جان نے

”اے لو آپ خود ہی تو مجھے کام کو ہاتھ لگانے سے منع کرتے تھے بس یہی چاہتے تھے کہ میں اسامٹ بن

”اب کے سامنے بیٹھی رہوں؟“ شاہدہ نے نکلی سے کہا۔

”میں بہت خوش نصیب ہو شاہدہ کہ تمہیں ایسا قدردان شوہر ملا ہے ایک جاوید تھا کہ میں نے اس کی

”اپنی سوکن“ اس طوائف کی بھی خدمت کی“ اس کے ظلم سے پھر بھی وہ مجھ سے خوش نہ ہوا کہ

”سے شاباش نہ دی۔“ نرسن دکھ سے بولی۔

”اے مجھی نرسن گزری باتوں کو بھول جاؤ وہ جاوید ہوا ہی بد بخت تھا کہ تمہاری قدر نہ کر سکا میں تو

”اگر اس کو دیا دیکھ کر یران ہوں۔ تم نے تو گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے، بولو کیا انعام لوگی؟“ میں نے

”لوش کرنے کے لیے کہا

”اسی رضی صاحب پہلے چائے پی لیجیے“ میری نرسن نے اپنے ہاتھوں سے ایسی ایسی لذیذ چیزیں بنائی

”آپ یقیناً اوور ڈا شنگ کر جائیں گے۔“ شاہدہ نے سبکی کی تفریف کرتے ہوئے کہا۔

”لی لباس بدلے چلا گیا۔ شاہدہ بھی پلک جھپکتے میں نما کر تیار ہو گئی۔

”اس نے واقعی چائے کا خاص اہتمام کیا ہوا تھا۔ ایک سموے کباب، پکوڑے، نہایت لذیذ تھے۔۔۔

شاہدہ مجھے اصرار کر کے کھاتی رہی اور میں ہلنے کے ساتھ تعریفوں کے پل باندھتا رہا۔

”ہائے دلہا بھائی آپ کتنے اچھے ہیں ایک جاہد تھے کہ میں جب ان کے لیے کچھ پکاتی تھی تو وہ ہزار نقص نکالتے تھے۔ بارہا تو انھوں نے پٹیشن اٹھا کر باہر بھیج دی تھیں۔ میرے تو کان تعریف کے سننے کے لیے ترستے تھے اور ایک آپ ہیں! شاہدہ بتا رہی تھی کہ آپ نے کبھی اسے کام کو ہاتھ لگانے دیا نہ تو اس نے کبھی باور پتی خانے میں جھانکا نہ کبھی فرنگی کی بیشک بدلی پھر کبھی آپ اسے چاہتے ہیں۔ جاہد تو کبھی میز پر گرد دیکھتا تھا تو مجھے کوٹا جھانکنا تھا۔ ہائے کیا ہٹاؤں کہ کس قدر دل ہٹاؤں کہ میں گھر چھاؤں، سنے سرے سے ڈیکورٹ کروں لیکن میرا شوہر نامراد مجھے کچھ کرنے بھی نہیں دیتا تھا۔ دلہا بھائی آپ کا گھر آج میں نے اپنی خواہش کے مطابق سجایا ہے۔ اللہ مجھے اتنی خوشی دے۔“ وہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔

”اے نرسن جان یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے جس طرح دل چاہے سجاؤ اور پلیر اس الو کے پٹے کی بات میں کیا کرو۔“ نرم دل شاہدہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

میں جب آفس سے لوٹا تو گھر صاف ستھرا اور نکھر اٹھا لگتا۔ کھانا بھی بے حد لذیذ اور خوش بو تھا۔ شاہدہ بڑے فخر سے مجھے بتاتی تھی کہ یہ سب کیا دھارا نرسن کا ہے اور میں نرسن کے کتنے مقصد پادینا تو وہ اس طرح کمال اٹھتی جس طرح اسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔۔۔ اور پھر نہ ہونے بھی میں شاہدہ اور نرسن کا موازنہ کرنے لگا اور بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ شاہدہ حیثیت میری زندگی میں محض ایک ڈیکوریشن ہیں کی سی ہے۔ حسین گڑیا جو سارا دن پٹنگ پر ملازموں پر حکم چلاتے ہوئے فیشن میگزین پر چھتی رہتی ہے اور اس کے مقابلے میں نرسن، جس نے ہی ہر چیز کی کیا پلٹ دی تھی۔ پہلے تو گھر کا نقشہ بدلنا کھانے کا انتظام ہاتھ میں لیا، مالی کے ساتھ مل کر جرتے جن کو باغ و بہار کر دیا بھی نہیں بلکہ میری زندگی میں بھی رنگیں بکھیر دی تھی۔ میرے بے کپڑے اب ترتیب سے رکھے ملتے۔ سب قیصوں میں شے نئے رنگ لگ گئے۔ شیشے پر شاہدہ کا حسین دھندلانا لگا اور ایک نئی صورت ابھرنے لگی۔

ایک دن میں آفس سے جلدی اٹھ آیا میں نے دیکھا ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی شاہدہ اپنا دل بکس کھولے بناؤ گھسکار میں مصروف ہے اور نرسن پینڈول تک شلوار اوپر کے زین پر گھنٹوں کے بیٹھی زور و شور سے ٹاٹ پھیر رہی ہے۔ میں صوفے پر بیٹھی دلن بینی ناؤ کی شاہدہ اور زین پر پھیرتی گدرائے گدرائے، کسے کسائے بدن والی نرسن کا موازنہ کرتا رہا پھر مجھے شاہدہ پر بے تحاشا

”شاہدہ!“ میں پھر کر چیخا۔ شاہدہ اچھل کر رہ گئی۔ شیشہ اس کے ہاتھ سے دور جاگرا اور کچی کچی ہوئی۔ خود نرسن بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”آہ۔۔۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟“ شاہدہ دنگ تھی اس نے تو کبھی مجھے اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا۔

”شاہدہ! ہمیں شرم نہیں آتی خود تو چوبیس گھنٹے بیکار بیٹھی رہتی ہو اور یہ بے چاری نرسن جو بد قسمتی ہماری سہیلی ہے نوکرائیوں کی طرح کام کرتی ہے۔“ میں گرجا۔

”میں نے۔۔۔ میں نے کب نرسن سے کام کرنے کے لیے کہا ہے۔۔۔ یہ تو خود ہی ضد کرتی ہے۔“ وہ

”اس گھر کی مالکہ ہو گئی دیکھ بھال، کام کاج ہمیں خود کرنا چاہئے۔“ میں سختی سے بولا۔

”دلہا بھائی میں بھی شاہدہ کو یہی سمجھا رہی تھی کہ وہ گھر کی طرف توجہ دے۔ سب انتظام ملازموں کے ہاتھ میں چھوڑا ہوا ہے۔۔۔۔۔ وہ تو آدھوں آدھ آپ کا پیسا کھا رہے ہیں۔۔۔۔۔ کام بھی ڈھنگ کا نہیں کرتے۔ سارا گھراٹ پلٹ پڑا رہتا ہے، اتنا خوبصورت گھر ہے اور فرنیچر اور ڈیکوریشن ہیں کتنے نایاب! اچھا ان سے اگر یہ میرا گھر بناتا تو میں اسے جنت بنا دیتی۔۔۔۔۔“ نرسن نے کہا تو میرے دل سے شاہدہ کی بات بائبل مٹ کر رہ گئی۔ مجھے ہر چیز میں نرسن کا جلوہ نظر آنے لگا۔

”بہن! نرسن آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں اسے بھی سچائیں سنواریں۔۔۔ میں نے تو اس گھر میں اسے جہاں کی چیز اس کی کر رکھی ہیں جو یہاں پڑی پڑی اپنی قسمت کو رو رہی ہیں اور ہماری بیگم کو اپنے گھسکار سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ بھلا گھر کیا سچائیں گی، میرے کپڑوں تک کی تو دیکھ بھال میں کر سکتیں بنی ٹوٹے ہوئے ہیں، کار پچھے ہوتے ہیں۔“ میں اس طرح پھٹ پڑا کہ اپنے جذبات پر خود کی حیرت ہونے لگی۔

”خلیہ دلہا بھائی اب تو آپ کے کپڑے ٹھیک ٹھاک ہو گئے ہیں ناب تو شکایت نہ کریں؟“ وہ مجھے

”نرسن! یہ سب تمہاری نظر کرم ہے ورنہ ہماری بیگم صاحبہ تو ایک بنی ٹاکنٹا اپنی شان کے خلاف کرتی ہیں۔“ اور پھر میں نے دیکھا کہ میری پیاری حسین بیوی کے چہرے پر ایک تاریک سایہ پھیل گیا ہے۔

غیر محسوس طریقے سے چلاک فرین شاہدہ کا کتا مٹی۔ پہلے پہل تو اس نے شاہدہ کے چھوڑنے
گھر سے لاقطقی کا مجھے احساس دلایا پھر وہ اٹھنے بیٹھنے میرے سامنے شاہدہ کے لباس اور خود خال میں
لٹا لے گئی۔

”ارے شاہدہ یہ تم نے براؤن رنگ کیوں پہن لیا۔۔۔ اس میں تمہارا گندمی رنگ اور ماند لگنے والا
ڈیزیزر لکھنے کے لئے رنگ پتہ کون۔۔۔؟“

اچانک مجھے پہلا بار پتہ چلا کہ فرین کا رنگ سرخ و سفید ہے اور اس کے مقابلے میں میری بیگم
ساقوں لگتی تھی۔ میں نے بھی بحث کیا۔

”ہاں شاہدہ جاؤ یہ سوٹ اتار پھینکو ایسے واپیات رنگ مت پتہ کرو۔“

”اور شاہدہ جانی یہ تم جہت پاجامہ کیوں پہنتی ہو دیکھو جانا غم کرنا پاجامہ بھرے بھرے جسم اور سلا
پنڈیوں پر چڑھتا ہے۔ تم جیسی نازک اندام پر تو ران میں جگ رہا۔“ فرین نے یہ اعتراض کیا تو میں نے شاہدہ
کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا پھر فرین کے گرد رائے کے سلاؤں بدن پر نظر ڈالی تب مجھے پتہ چلا
شاہدہ تو موسمی لباس ہے اور فرین کی سلاؤں پنڈیوں میں وہ سرخ پاجامہ نکتا پھنسا لگ رہا تھا۔

”اوہ شاہدہ۔۔۔! یہ تم نے لباس پر کپڑا منڈھ دیا ہے۔ خبردار آئندہ پاجامہ مت پہننا اگر پہننے کا اتنا
شوق ہے تو پہلے اپنے اس لاغر جسم پر ذرا گوشت چڑھاؤ۔“ میں نے کدھر ہو کر کہا اور جھل سی شاہدہ مجھے
آلود نظروں سے دیکھتی، تنمیا چہرے بالے ہر نکل گئی۔

”پھر بہت جلد مجھے اپنی بیانی اور عقل پر شبہ ہونے لگا، مجھی یہ شاہدہ تو بالکل معمولی عقل و صورت
عورت ہے اور میں اسے حسن کی دیوی، ملکہ حسن کا ایک کچھ مستحباب۔ اس طرح دل میں جو روی
چاہت تھی وہ ابھاپ بن کر اڑ گئی۔ ایک دن تو صبر کا یانہ لبریز ہو گیا۔

ہم لوگ رات کو کافی پیٹے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ بہت خوبصورت بچے کا اشتہار آیا۔

”ہائے کتنا پیارا بچہ ہے؟“ شاہدہ نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”اگر بچے اتنے اچھے لگتے ہیں تو پھر پیدیا کیوں نہیں کیے۔ میرے حساب سے تو اب تک جیس کم
تین یا چار بچوں کی ماں ہونا چاہیے تھا۔ میرا مشورہ تو یہ ہے شاہدہ کہ تم کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کراؤ۔

فرین نے ہنس کر کہا تو شاہدہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”تمہاری شادی کو کبھی تو پانچ سال ہو گئے تھے۔ تم نے بچوں کیوں نہیں پیدا کیے؟“ شاہدہ نے تنک
جواب دیا۔

میں تو ماں بننے کی خواہشمند تھی شاہدہ لیکن جاوید باپ نہیں بننا چاہتے تھے۔ خیر میری بات تو اورتھی
تم اب دلہا بھائی کی جائیداد کا وارث پیدا کر ڈالو دیکھو گناہ کتنا سونا سا لگتا ہے؟“

میری جائیداد کا وارث؟ ہائے آج سے پہلے کبھی مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ واقعی بچے
کے گھر گھر سونا ہے میں نے سوچا۔

”کیاں دلہا بھائی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔۔۔؟“ فرین نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

اور بے ساختہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں فرین کے وہ خوش پہاڑ رکھ دوں اور کولوں۔۔۔
وہ مجھے دلہا کے لیکن ساتھ بھائی کا مکروہ لفظ نہ لگائے۔ میری نگاہوں کی حدت فرین نے محسوس کرنی
اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ شاہدہ کی تیوری چڑھ گئی۔

”میں رضی ساڑھے دس بج گئے ہیں اب مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”نہیں نیند آ رہی ہے تو جاؤ سو جاؤ مجھے زبردستی کیوں سلاتا چاہتی ہو؟“ میں نے ناگوار انداز میں کہا تو
سرخ ہو گئی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے کسی کو زبردستی سلاتے کی۔ آپ ہی مجھے تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ میرے اٹھنے
اور بھی اٹھ جاتے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ کے خیالات میں تبدیلی آگئی ہے۔“ وہ راتے میں پڑی
لو کر لگاتی مڑ گئی۔

”میں دلہا بھائی! بڑا حوصلہ ہے آپ کا جو آپ شاہدہ سے اتنی باتیں نہ لیتے ہیں، ایک وہ جاوید تھے کہ
فرین مسکراتی ہوئی اٹھی اور میرے ہاتھ سے کافی کی خالی پیالی لینے کے لیے جھکی۔ میں نے بے اختیار
لاگور اور گورا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر کھینچا تو وہ میدھی میرے سینے سے آکر اڑی۔ میں نے
انہوں میں جکڑ لیا۔ اس کی گرم سانسیں میرے چہرے کو جھلسائے لگیں تو میں بے قابو ہو کر جھکا۔

”نہیں نہیں دلہا۔۔۔“ اس سے پہلے کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی میں نے سختی سے اس کا منہ بند کر دیا۔ لمبے
کھینچے ہوئے لگے، وہ میری گرفت میں موم کی طرح پھسلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ جذبات کا طوفان ہمیں
اندہ پوری طرح جذب کرنا بیدروم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فرین نے ایک جھٹکے سے خود کو
لا اور لڑتے ہاتھوں سے رُے اٹھا کر باہر بھاگی میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا تو
وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی، میں بھی آخر میدان عشق کا تجربے کا رکھلا ڈھکی تھا، کیسے اپنے چہرے سے
ظاہر ہونے دیتا۔ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیوں جان من میرے بغیر نیند نہیں آئی؟“

وہ سرے دن میں آفس سے جلدی آٹھ آیا۔ کچھ سوچوں اور دوسو سالوں کے دماغ کو پگھلا کر آیا ہوا تھا۔

”میں نے اسے گلے لگایا۔

”اے رضی... میں اب کیا کروں گی کہاں جاؤں گی؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”اے نرن فرین ڈارنگ! تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو! اب تم ہمارے پاس رہنا۔“ میں نے اس کی بات کو بچے بچہ سمجھ کر دھک دیا اور اس کی جھیل جھیلی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں رضی... یہ ناممکن ہے۔ کچھ دنوں سے شاہدہ کا رویہ مجھ سے بہت سرد ہو گیا ہے وہ ہمیں شک کی دیکھتی ہے۔“

”اس کی پروا مت کرو، شاہدہ کو میں ٹھیک کر لوں گا۔“ میں اس کے آنسو پونچھنے کی لیے جھکا ایک شریر آنسو آنکھ سے ٹپک کر ٹپکے ہوٹ پر ٹپک گیا۔ میں نے بے خیالی میں اس آنسو کو اپنے سے چٹا چاہا... اور پھر ہوٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ تن سے تن کا ٹکراؤ ہوا تو ان ہونٹوں نے گھٹنے اور پھر گھٹنے اور جسموں کو بھسم کرنے لگیں۔ خدا جانے سب کچھ کیسے گڈھ ہو گیا اس وقت آیا جب دروازہ کھلا اور میری بد نصیب بیوی شاہدہ اپنی بھالی اور بھائی سمیت ہنسی اڑا کر چلی آئی اور صوفے پر دو دو حشی جسموں کو دیکھ کر سسکتا ہو گئی۔ وہ پچھنی پچھنی نظروں سے ہم کو دیکھتی رہی۔ اس کی بھالی اور بھائی بد خواص ہو گئے اور ہم دونوں پر لپکا پیک جیسے کسی نے منوں لپکا دی۔ بے اختیار نرن فرین کی چیخ نکلی گئی اور وہ اپنے بے ترتیب کپڑے سنبھالنے لگی۔

”اے شاہدہ! جیتی اور لپک کر اس نے گہرائی سمی ہوئی نرن فرین کو دبوچ لیا اور دونوں ہاتھوں سے لپکے لگی۔“ ”حرام زادی، کتیا، بدعاش... یہ صلد دیا ہے تو نے مجھے دوستی کا۔“ وہ اسے جھجھوڑ کر لڑتے ہوئی بولی۔

”ناموشی سے بچ رہی تھی، بے چاری کی پوزیشن بڑی نازک تھی۔ شاہدہ کی زبان اور ہاتھ ساتھ لپک رہے تھے۔

”میں سنبھل کر اٹھا اور نرن فرین کو چھڑانے کی کوشش کی تو نازک اندام شاہدہ نے دو چار زور وار اس کے منہ پر بڑھ دیے۔ ایمان سے میرے سر میں سولر سسٹم (solar system) گھونٹنے لگا۔ کتنے ہاتھوں کی طرح نازک تھی لیکن کم بخت کا ہاتھ عموماً علی باکسر سے زیادہ بھاری تھا۔ میرا جڑا سن لپک لپک کر اس کے سانس سے چھٹ لپک لپک رہا تھا۔ میرا منہ بھائی نے پوری کر دی۔ مجھے گردن سے پکڑا اور اٹھا لیا۔ بار بار اور میرا پانچ گھٹ آٹھ اٹھا لیا اور وہ جھانک رہا تھا۔

”اے پھر تھوکر کر اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی ایک ہفتے کے بعد میں نے شاہدہ کو طلاق دے کر

میرا دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ دروازہ مسکراتی ہوئی نرن فرین نے کھولا۔ آج تو اس نے خوب ہانا ہوا تھا۔ سرخ اور گولڈن پھولوں والی فرنج شیڈن کی ساری پسینے بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی۔ سے بلاؤ کا گلا بھی بے حد لوز تھا اور اس میں سے اس کا صاف و شفاف بدن نکلا کر مار رہا تھا۔ وہ ہوا جھکی اور ہاتھ بڑھا کر اس نے برف کیس تمام لیا، انگلیوں کا ٹکراؤ انگلیوں سے ہوا تو وہ دھس دھس کر دوڑ گیا۔

”آج جلدی آگے آپ؟“ وہ خوشی سے مسکرائی۔

”اور اسی لمحے میرا پیچھا کر کے اسے اپنے خیمہ میں سے بھینچ بھینچ لوں گی۔“ خیال سے مجھے ہلکا سا ڈانٹ تھا۔ کاش شاہدہ بھی روزانہ میرا اسی والمانہ انداز سے استقبال کرتی۔ میں نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے سوچا۔

”ہاں... آج کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی...“ میں تھوکر لگ کر بولا اور ٹائی ڈھیلی کرتا اندر آ گیا۔ ”ہائے کیس بخار تو نہیں ہو گیا۔“ اس نے گہرا کر میری پیشانی کو چھوا جس پر پسینے کے قطرے پڑ رہے تھے۔

”صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے...“ میں اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دیا کہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”لایے ہیں میں بادوں؟“ وہ جھکی نوکر بیان اور زیادہ کھل گیا۔ میرے خون میں ہال اٹھنے لگا۔ ”شام... شاہدہ کہاں ہے؟“ میری آواز بوجھل ہونے لگی۔

”اے اس کی بھالی اپنے ساتھ لے گئی ہیں، کہہ رہی تھیں میڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروا دیا۔ شاہدہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔“ وہ آہستہ آہستہ میری پیشانی سے ہلاتے ہوئے معصومیت سے بولی۔

”تم نے بہانہ کر دیا...“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”دراصل... میں... میں... آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔“ وہ ایک دم اندر آ کر آٹھیں بھر آئیں۔ میں نے تڑپ کر اسے ہاتھوں میں لے لیا۔ ”کیا بات ہے نرن فرین؟“ میرے لیے اسے تشویش تھی۔

”رضی... جاوید نے جاوید نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ آج۔ آج مجھے کانڈا تہذیب زدہ لگ رہا ہے۔“ وہ رونے لگی۔ پہلے پہل میں سن ہو گیا پھر میرے سر تہذیب زدہ لگ رہا میرے وجود میں پھیلنے لگی۔ ”اے بھئی اس میں رونے کی کوئی بات ہے، شکر کرو کہ اس موڈی سے تمہاری جان بچ گئی۔“

اسے سمجھا بھگا آفس جانے لگا تو ہر پانچ منٹ کے بعد اس کا فون آجاتا۔

رضی۔ اور ضی ڈارلنگ میں تیس برس مت کر رہی ہوں..... پلیز گھر آجاؤ.....؟“ وقتے وقتے سے اداگ کو گنتے شروع شروع میں اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا دل وروح تک شاد ہو جاتی، پھر جوں جوں ان گزرنے لگے مجھے ٹیلیفون کی کھنٹی سے بھی الٹی ہونے لگی، آخر میں نے فریڈہ کو منع کر دیا کہ وہ بار بار دُشرب نہ کیا کرے اور پھر میرے ایک گرسے دوست نامرے جو ہماری شادی میں شریک نہیں تھا، امریکہ سے واپس آتے ہی میرے اور فریڈہ کے اعزاز میں شرکے سب سے منگے اور مشہور ہو گئے، میں ڈنڈیا، معزین شرمہ وغتے۔ میرے قریبی دوست جو میری خوب پسندی سے واقف تھے،

کر رہے تھے یہاں تک کہ نامرے بھی میرے کان میں سرگوشی کی۔
ار رضا معاف کر دے کہ میں تیری اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا۔ خیر میری اگلی شادی کا تو گواہ میں ہوں گا۔“ وہ فحش دیا اور میں فریڈہ کے پلو میں بیٹھا زیر لب مسکراتا رہا۔ اچانک میری نظر سامنے بڑے بیٹھی ایک لڑکی پر جم گئی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے میرے دوست کی بیوی یعنی بھالی بھالانہ میں کر رہی تھی، مجھے متوجہ پا کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔ میں نے گڑبڑ کر نظریں پھیر لیں۔ مجھے اس لڑکی کی جانی پہچانی ہی لگی پھر مجھے یاد آیا کہ وہ کئی اشتہاری جیلیں فلوں میں ماؤنگ کر چکی ہے۔ بڑی فحش لڑکی تھی۔ میں نے پہچانتے ہی اس کی طرف دوبارہ دیکھا وہ پھر مسکرا دی اور میری سانسیں

لو لیں.....

اگلے دن کے دوران میں سلطانہ بھالی کے پاس پہنچ گیا اور چپکے سے پوچھا کہ وہ ماڈل گرل میرے

میں کیا کہہ رہی تھی؟

ہا وہ صائمہ.....“ وہ مسکرا کر بولیں۔“ وہ بھی پوچھ رہی تھی کہ گیسٹ آف آنر کون سے ہیں، میں اس کے چرچے تو بہت سنے ہیں لیکن ابھی تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تب میں نے تمہاری طرف اس کے بتایا تو وہ تمہیں دیکھ کر بہت مایوس ہوئی گئی کہے لگے اونہ یہ تو معمولی شکل و صورت کے مرد ہیں تو ان کے قصے سن کر یہ سمجھتی تھی کہ بڑی ڈ۔ شنگ، اسٹرلنگ پرستائی کے مالک ہوں گے، میں کا خیالی ہے جو لڑکیاں ان سے متاثر ہو جاتی ہیں، مجھے تو ذرا بھی اہل نہیں کر رہے اب میں اس سے کہہ کر رضی واقعی بے حد معمولی انسان ہے کوئی عقلمند عورت اس سے تعلقات بڑھانا پسند نہ کی۔ یہ تو سب دولت کا کامل ہے کہ احمق عورتیں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں۔“ سلطانہ بھالی نے

ا۔

رہ گیا..... بے چاری فریڈہ منہ دیکھتی رہ گئی اور عابد کی بے وفائی نے اسے مردوں سے متفرق کر دیا۔ اس عہد کیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور اس طرح یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ دل و جان سے تعلیم حاصل کر لگی۔ خود کو کتابوں کے انبار میں دفن کر دیا۔ وہ مجھے یہ سب کچھ بتاتے روتے لگی اور یہ راہ ہر روز اس کے لیے کڑھ کر رہ گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھوں کو جھکوا تو وہ میرے سینے سے لگی..... اور..... پھر مجبوراً جی ہاں مجبوراً مجھے اس دکھیا کو سہارا دینا پڑا۔

نرسن سے میری رفاقت بہت مختصر ثابت ہوئی۔ شادی کے دو مہینے کے بعد..... جیسی ہو گئی لیکن نیک نیتی دیکھنے میں نے بے تحاشہ رویا خرچ کیا اور نرسن مقدمہ جیت گئی اور جاوید کو کمٹ کی کماں میں نہیں بلکہ فریڈہ نے مقدمہ لڑ کر نرسن کو اس کا مہر، اس کا جائز اور زیورات وغیرہ جو طلاق کے بعد جاوید کے قبضے میں تھے واپس دلا دیے۔ ویسے بھی نرسن پر چڑھا ہوا صلہ بہت جلد اتر گیا تھا۔ اب وہ شادی کی طرح بیٹنے سنورنے میں مست رہتی تھی اور مگر کا انتظام ایک بار پھر تو کروں گے کا توں لیا گیا تھا۔ نرسن نے صرف مجھے متوجہ کرنے کے لیے یہ سارے ڈھونگ رچائے تھے اور مجھے ایسے لوگ سخت ناپسند ہیں۔

ویسے اگر آپ انصاف سے کام لیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ عورتیں ہی ہیں جو مردوں کو اپنے جال میں پھنسا کر انھیں برائی اور بے راہ روی کی ترغیب دیتی ہیں اور بدنامی خواہ مخواہ مردوں کے ہے اگر نرسن بار بار میرے سامنے شادی کی برائیاں کر کے مجھے اس سے بدخلن نہ کرتی، اس کی کی نشاندہی نہ کرتی تو میں کب اس کی کوتاہیوں پر غور کرنے لگتا تھا؟ جس طرح پانچ سال گزر گئے عمر بھی گزر جاتی۔ تو یہ کیسی بار بار تھی یہ نرسن! بے چاری سادہ لوح شادی کو کیسا دھوکا دیا۔ وہ فریڈہ سے نکاح کر لیا اور ہم تین مہینے کے لئے ابراڈ (abroad) چلے گئے سارا یورپ گھوم لیا عیش کیے اور تین مہینے تین ہل میں گزر گئے۔ بھی کیا بات تھی فریڈہ کی؟ اتنی بھر پور پر جوش و خروش کبھی میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک الگ تھی جو میری نس نس میں انگارے ساکاراں جذبات کا بھرا ہوا طوفان تھی، وہ قبریں کر مجھ پر چھا جاتی انکڑا ایسا ہوتا کہ میں اس کے شور و غل ساٹھ دینے سے قاصر ہو جاتا شاید اتنا عرصہ شادی نہ کرنے کی وجہ سے اسے ری ایکشن ہو گیا عرصے تک وہ اپنے فطری جذبات کو دبا کر چٹان کی طرح جمی رہی، کوئی لطیف جذبہ اس کے دل میں نہیں دے سکتا تھا اب جو اچانک اسے میری رفاقت و محبت ملی تو وہ طوفانی لہروں کی طرح اٹھ اٹھا ساتھ سمیٹ لے گئی۔ اسے تو مجھے دہم ہو گیا تھا وہ لمبے بھر کے لیے بھی مجھے تنہا نہیں پہچان

اس نئے کورے سچ کو کس کر مجھے سلطانہ سے شدید نفرت سی ہونے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں شر پر دھا کہ میں اب تک اتنی منہ چھٹ صاف گو بیوی سے بچا رہا ہوں مجھے ایسی عورتوں سے ملنا آتا ہے جو بغیر سوچے سمجھے کسی کے جذبات کا پاس کیے بغیر سچ بول دے مارے۔

رات کو بستر پر لیٹا تو فریدہ کی قربت کے باوجود صائمہ کا ٹوٹی (twiggly) جسم کا چرو میرے دل پر دے پر سرسرا نے لگا۔ کتنی نازک کر تھی اس کی، چلنے میں لاکھ لاکھ بل پڑتے تھے اور میں دل میں قدرت کی اس کار نیگری پر حیران تھا جادو نے اپنا ہوجہ کیسے اٹھائے تھی اس کے مقابلے میں کمر پورے دو یا تیرے پچھلی ہوتی تھی، میں نے ہاتھ سامنے کیے اور انگوٹھے سے انگوٹھا ہلا کر انگوٹھ کو ملیں اور وہ ناپ دیکھتے ہی میرا منہ بن گیا۔ ہوں۔ ہوں بس اتنی ہوگی۔ میں بے خیالی میں سے بولا۔ میرے پہلو میں لیٹی اور میری خوبصورتی کو میرانی سے بکتی فریدہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیوں جی بے کیا ہو رہا ہے۔ اور آپ بے کیا بیڑا رہے ہیں کہ ہاں۔ ہاں اتنی ہوگی؟“ وہ منگھو کر سے بولی۔

”کک۔ کچھ نہیں ڈارلنگ“ پھر فریدہ کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑے۔ کئی دن تک میں صائمہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا رہا۔ وہ میگزین اور کیلنڈر خرید لایا اور میں صائمہ کی تصاویر تھیں۔ اب فریدہ کی آتش محبت مجھے بھی زہر لگنے لگی تھی دیکھیں تاہم وہ اس سے بہت جلدی اکتا جاتا ہے جو اسے اپنی جاگیر سمجھنے لگے۔ اسے ڈامینٹ (dominate) اور فریدہ اف اگر اس کا پس چلا تو وہ مجھے ایک ہی کمرے میں چوبیس گھنٹے بند رکھتی۔

میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر لگن کچھ ہو تو خدا کی کوئی نہ کوئی موقع ضرور فراہم کر دیتا ہے۔ ایک بازار سے آ رہا تھا کہ میں نے سڑک کے کنارے ایک سرخ خوش ونگین کڑی دیکھی۔ قریب اسٹارٹ لڑکی جس نے سیاہ ٹراؤزر اور بند گالے والی سرخ جرسی پہنی ہوئی تھی پریشانی کے عالم میں تھی۔ میرا دل اس تیزی سے اچھلا کہ اسٹیپنگ پر ہاتھ ہنک سے گئے۔ میں نے ایک دم بیک لگا کر سے پہلے کہ کار سے باہر نکلا وہ خود لپٹی ہوئی میرے قریب آئی۔

”مسٹر رضا۔ شکر ہے آپ مل گئے پلیز مجھے جلد از جلد اپنی وی اسٹیشن لے چلے، پروگرام شروع میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔“ وہ میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ہوا کے دوش پر ہم اپنی وی اسٹیشن پہنچے۔ مسٹر رضا آپ چلے مت جائیے گا میں اپنی پر بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ صرف ایک پروگرام ہے۔“ وہ بے تکلفی سے بولی اور پھر اندر بھاگ گئی۔ اس نے مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت

بادشاہت کی قیمت

”ابن مغفرہ ابن ہاک (علیہ الرحمۃ) بادن الرشید کے دربار میں گئے اور پانی طلب کیا۔ ان کے لیے پانی کا پیالہ لایا۔ انھوں نے پیالہ ہاتھ میں پکڑا اور کہا۔ ”اے امیر المؤمنین! اگر پانی ناپ ہو جائے تو آپ بے پالہ کہتے ہیں یا نہیں؟“

”ہاں ہاک۔“ ”آج ہی بادشاہت کے عوض۔“

”ابن ہاک علیہ الرحمۃ نے کہا۔ ”اے پی جاے۔“ ”بادن الرشید نے پانی پی لیا۔

”بادن الرشید نے پانی پی لیا تو حضرت نے استخار فرمایا۔ ”اے امیر المؤمنین! آپ کے بدن سے اگر اس پانی نکلے تو اسے پانی ہو جائے تو اس کے اخراج کے لیے آپ کیا قیمت ادا کریں گے؟“

”ابن مغفرہ نے فرمایا۔ ”آپ کے نام و تخت اور پوری بادشاہت کی قیمت پانی کا ایک پیالہ پینے کے لیے حاصل کرنا اس سے بیشی والے بیضاب کا اخراج ہے تو بہتر ہے کہ اس حیرت کاسودائی نہ کیا جائے اور اس کے حصول کے لیے روٹی نہ کی جائے۔“

”ابن ہاک بادن الرشید شہت کے ساتھ روچا۔

”ابن ہاک بادن الرشید شہت کے حصول کی بجائے آخرت کی بھڑکی کے لیے کوٹاں ہوتا جاہیے۔

مراد ابن مغفرہ نقاشی۔ سعودی عرب

اور انہی چاہتا ہوں یا نہیں؟ اور مجھے اس کی بھی خود اعتمادی بہت پسند آئی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے رال ہوئی واپس آئی۔ پرس سیٹ پر پھینک کر مسکراتی ہوئی میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔

”ابن۔ تو سنائیے رضائے ہیں آپ؟“ وہ نگاہوں میں ستارے لا کر فریادی۔

”ابن۔ آپ کو ہمارا حال پوچھنے کی فرصت تو ملی؟“ میں ڈیڑھ کرتے ہوئے بولا۔ ”بھئی بڑی عجیب اور دوسری لڑکی ہوئی تو اب تک پچاس بار مجھ سے معذرت کرتی؟“

”ابن صاحب معذرت چاہتی ہوں کہ اتنا انتظار کرنا پڑا اور لفٹ دینے کا بھدہ شکر ہے۔“

”ابن رضاب ہمیں فرصت ہی فرصت ہے۔ آپ بتائیے آپ کی تیسری یا چوتھی بیوی کا کیا حال ہے؟“

”ابن میرے چہرے پر سرخی بکھرتی دیکھ کر قہقہہ لگا کر بولی۔

”ابن میرے چہرے پر سرخی بکھرتی دیکھ کر قہقہہ لگا کر بولی۔

”ابن میرے چہرے پر سرخی بکھرتی دیکھ کر قہقہہ لگا کر بولی۔

ان تہاؤں اور آرزوؤں کی قائل نظر آتی۔

مگر وہ مجھے اپنی تہاؤں اور آرزوؤں کی قائل سمجھتی تھی۔

در اصل صائمہ کو کسی نے میرے اور ڈاکٹر ناز کے بارے میں بتادیا تھا وہ بالکل میرا سایا بن گئی۔ اکثر فراموش کر کے آفس سے میرے بارے میں پوچھتی رہتی۔ چپکے سے آفس بھی بتاتی جاتی تھی اور مجھے دفتر میں نہ پاتی تو ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ پھرنگ آکر اس نے مجھے دھمکی دی کہ اب اگر اس نے میرے اور ڈاکٹر ناز کے بارے میں کچھ سنایا دیکھا تو وہ میرا بیعتا حرام کر دے گی مجھے جیل بھجوا دے گی۔

بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے کے لیے ہم ملنا ملا نہ کریں، طبعی بھی تو ملتا ہو کر لیکن ایک دن دل بے قابو ہو گیا اور میں ڈاکٹر ناز سے ملنے جا پہنچا پھر ہم دونوں لاٹک ڈانٹ کر کے لے نکل کھڑے ہوئے۔ جانے کیسے صائمہ کو خبر ہو گئی۔ میں اس وقت چونکا جب میں نے صائمہ کی مٹی اسپرڈس ماڈل، اپنی کار کے تعاقب میں دیکھی، میں تو تھرا کر رہ گیا۔ ہماری کایں آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ صائمہ کو دھوکا دے کر نکل جاؤں لیکن وہ بہت سخت اتنی باہر ڈانیاں

ثابت ہوئی کہ گلیوں میں بھی اس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں نے بھی رفتار بہت تیز کر دی اور کار کو اسے قابو میں رکھتے ہوئے ایک دم دائیں جانب مڑ گیا صائمہ میرے ارادوں سے بے خبر تھی غلط میں ہوا کانتے ہوئے مقابل کے ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرائی۔ صائمہ کی کار بالکل برباد ہو گئی اور وہ خود شدید زخمی ہو گئی۔ اسے اٹھا کر ہم ہسپتال لے گئے۔ اس کی نازک حالت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ناز نے اپنا خون

اور جب ہوش آیا تو وہ احسان فراموش صائمہ کی اور ہسپتال میں منتقل ہونے کی ضد کرنے لگی۔ میں سختی سے انکار کر دیا لیکن شام کو جب میرے سرسٹری کی عیادت کرنے لیے آئے تو انھوں نے بیٹی کی فرمائش پر سی ایم ایچ سے ایمری لینس منگوائی اور صائمہ کو ملٹری ہسپتال میں داخل کر دیا وہ مجھ سے مل جانا پڑا رہ رہ کر صائمہ پر غصہ آ رہا تھا۔ ڈاکٹر ناز کے احاسات مجروح ہونے کا مجھے شدید رنج تھا۔ صائمہ

ایک مہینہ ہسپتال میں رہی اور مجھے اپنے قریب سے اٹھنے نہیں دیا اور صحت یاب ہو کر جب وہ گھر والیں آئی تو میں نے اسے بتایا کہ ہمیں سب سے پہلے جا کر ڈاکٹر ناز کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ اس نے ہمارے دے کر تمہاری جان بچائی ہے۔ یہ سنتے ہی صائمہ لال چلی ہو گئی اس نے ڈاکٹر ناز کو کافی گایاں دیں اور میرے بھی خوب لے لے لیکن آج میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے صائمہ جانے نہ جائے میں ڈاکٹر ناز کا شکریہ ادا کر کے ضرور جاؤں گا کیوں کہ کاکون سی طاقت مجھے روکتی ہے۔ حد ہو گئی جہالت کی

ہمیں کتابدہ تہذیب اور احسان فراموش سمجھے گی۔ میں نے ناسوٹ پسنے ہوئے سوچا۔ پھر شیشے کے سا

لڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھا۔ پر فیوم اٹھا کر بڑی فراخ دلی سے لگایا اور ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتا اور اڑا تو پتنگ پر لپٹی صائمہ مجھے تھرا آؤں نظروں سے گھور رہی تھی۔ لمبے بھر کے لیے میرا ہاتھ رکا پھر میں نے کندھے اچکائے۔ اوندہ دیکھتی ہے تو دیکھتی رہے مجھ جیسا مردے خواتین ڈینٹ، جنٹلمین اور سوشل پتنگ سمجھتی ہیں وہ بھلا صائمہ کی خاطر اپنا ایجنج کیوں برباد کرے۔ میں لا پرواہی سے باہر نکلا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ابھی گاڑی اشارت کرنے میں بھی نہیں پایا تھا کہ ایک تو عمر کوڑا ہوا میرے قریب آیا اور بڑے

ادب انداز سے بولا۔

”میرے انکل آپ سے ملنا چاہتے ہیں، اگر آپ کو غلط نہ ہو تو چند لمبے انتظار کیجئے“

”کہاں رہتے ہیں آپ کے انکل؟“ میں نے سوال کیا

”پلو! میں وہیں چل کر مل لیتا ہوں“ میں نے کار اشارت کی۔

لڑکے کے بتائے ہوئے مکان پر ایک انتہائی آسارٹ اور خوبصورت جوان نے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے

کہا۔

”ناطق زحمت کی رضا صاحب آپ نے آپ کی بیگم صاحبہ کے حادثے کی خبر سن کر میں خود حاضر ہونا چاہتا تھا“ انھوں اس بات کا بے کس میں شرمے باہر تھا رات ہی گھر پہنچا ہوں۔ ورنہ میں ہسپتال میں ہی رات کے لیے حاضر ہو جاتا۔“

”آپ میری بیگم کے رشتے دار ہیں کیا؟“ میں نے اس خوبصورت جوان کو تار تے ہوئے سختی سے پوچھا۔

”ارے جناب!“ اس نے انتہائی بے تکلفی سے جواب دیا ”ہم عمو اور ہم چیشہ لوگوں سے بھی رشتہ رکھتا جاتا ہے؟ شاید آپ کو علم نہیں کہ میں بھی ماؤنگ کرتا ہوں۔ ویسے بھی آپ کا ہم حملہ ہوں، محلے کے لاکھی کچھ حق ہوتا ہے۔“

”آپ زحمت نہ کریں۔“ میں نے رکھائی سے جواب دیا ”ابھی صائمہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی ہے“ اور میں ڈاکٹر ناز کے کلینک جانے کے بجائے سیدھا گھر واپس آ گیا۔

صائمہ نے بستر پر لیٹے لیٹے مجھ سے پوچھا۔ ”اتنی جلدی واپس آگئے آپ ڈاکٹر ناز کا شکریہ ادا کرنے کے لیے؟“

”نہیں۔“ میں نے گرج کر جواب دیا۔ اس کو کیسے سمجھا تا کہ میں کیوں نہیں گیا اور اب کبھی جانے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔





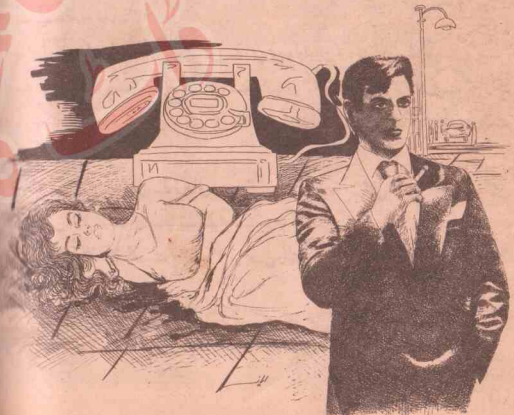
ایک آبلہ پاکٹر پہلے شرافت
جس کے لیے وہ رشتہ کا مددگار رہا تھا

سیمانگل



وہ اپنی شناخت ڈھونڈنے لگی اور مذاہن کی بھول بھلیوں میں کھو گئی
قصر خرامش پر کسٹڈا لے کر انی معصوم لڑکی کی پھر پیچ رہا۔ اسٹان مسلسل

میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو تین ہمنوں اور ایک بھائی کے درمیان پایا۔ جوان ہو کر پتا چلا کہ جنہیں میں ماں
سمجھتی رہی تھی وہ میرے ماں باپ نہیں ہیں بلکہ تیسیم ہندوپاک کے فسادات میں سکھوں نے انہیں اغوا کر لیا تھا





اس نے جو تک کر گئے دیکھا۔ وہ جوڑی دیر تک خلاص
میں گھورتا رہا پھر اس نے دیر سے دیر سے گھبرا کر شروع کیا۔
”زادہ پاگل ہے“ اس کی کیفیت خفوں سے کچھ زیادہ نہیں
جو تھوڑے سے پیسے کے لیے بغیر سوچے کچھ بھی کرے
میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ”زادہ“ اشراف علی خان کے تریف
سیاہ سلطان کے کہنے میں اگر کچھ بچا اور اس نے مجھ
سے وہ لاکٹ حاصل کر لیا جو اب نے مجھے گتے کے طور پر دیا
تھا۔ اس وقت میں اس لاکٹ کی اہمیت سے ناواقف تھا۔
اس کے کم ہو جانے پر بھی میں اتار پڑا نہیں ہوا تھا کہ

جب ابو کو چلا تو وہ سر ہاتھ کر رہے تھے۔ انھوں
اس لاکٹ میں ایسے راز پوشیدہ ہیں جو اگر دشمن
گتے کے توہ میں جنم رید کر سکتا ہے۔ میں یہاں
یہ اتفاق ہی تھا کہ زادہ میرے ہاتھ لگ گیا اور اس
لاکٹ اس کے پاس دیکھ لیا۔ وہ شاید ابھی تک اس
کے خوالے نہیں کر سکا تھا۔ اس کا معاملہ یہاں
تھا ”اسے لاکٹ کی اہمیت سے معلوم نہ تھی مگر وہ
والی اڑی سے کام لے رہا تھا۔ بہر حال ہاتھ آئے
اس نے میرے دھمکے پر سب کچھ بتا دیا اور

میرے خوالے کر دیا۔ اس لاکٹ کا میں نے اسے اتاری
اور وہ دیکھتا تھا۔ سلطان نے طے ہوا تھا کہ راز دار وہ
لاکٹ میرے پاس سے پھر کہیں غائب ہو گیا۔ اسے حاصل
کر لیا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ میں نے پھر زادہ کو پھڑا
اور اس پر تشدد بھی کیا مگر وہ مجھے اس لاکٹ کے بارے میں
کوئی نہیں بتا سکا۔ اب ابو کا لینی اشراف علی خان کا کچھ پر
دوڑا دیا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ شاید وہ لاکٹ میں ہے یا نہ
ہو۔ ”میرا زادہ ہے اور ان سے اس سلسلے میں بحث ہوئی کہ
اور اس سلسلے سلطان کے آدمی بھی میرے پیچھے پڑے
ہیں۔ میں نے لاکٹ کو ہر ممکن جگہ تلاش کیا مگر میں
نہیں لے سکا۔ اس نے لاکٹ میں اپنی راز داروں کو بھیجے
لیے۔ اب ہم نے اگر اس لاکٹ میں اپنی راز پوشیدہ ہیں جن
اس غلط کاروبار کو جنم رید کیا جاسکتا ہے تو راز دار
انہوں نے سب کچھ نام آگے لگے۔“
”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ لاکٹ میرے پاس ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”میرا زادہ میرا پھیل کر کھڑا ہو گیا۔“
”تمہارے پاس؟ کیسے۔۔۔ کہاں سے ملا وہ تمہیں؟“
”میرا زادہ مجھے تمہارے کمرے سے ملتا تھا۔“
”وہ دراصل میں صفائی کرنے کے لیے چادر بدل رہی
تھی کہ میری اس لاکٹ پر نظر پڑی جو چادر کے نیچے رکھا تھا۔
وہ ان کو تھا اور تمہیں یاد ہو گا کہ ان دونوں زادہ بھائی
کے نائب تھے۔ میں یہ لاکٹ ان کے گتے میں دیکھ چکی
تھی۔ اس لیے اسے تمہارے کمرے میں دیکھ کر میں پریشان
ہو گئی۔“ میں نے پھر کہیں غائب کیا تھا کہ زادہ بھائی اس کو بھی میں
”میرا زادہ نے بتایا کہ وہ گھر پہنچے ہیں اور کچھ خفوں نے
میں کو ماریا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ ان کے ساتھ کیا ہوا
ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کے خوالے میں کیا ہیں
اور وہ زادہ بھائی کے پاس آکر اسے بتا دیا۔ اس روز
میں ان کے گتے میں دیکھنے والے تھے اس روز بھی میں نے
میرے کمرے میں زادہ بھائی کو دیکھا اور تمہیں۔“
”ٹھیک ہے۔ تارا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اس
لاکٹ کی وجہ سے بہت پریشان تھا اور اس کے بارے میں
ابو کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے اس پر
ان کا راز کر دیا ہو گیا تھا۔ وہ لاکٹ کہاں ہے؟“

میں اٹھی اور بیٹہ روم سے لاکٹ نکال لائی۔ طاہر نے
بہت کچھ سے لاکٹ لے لیا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا
اطمینان تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے لاکٹ اس کی زندگی کی نویہ
ہو۔
”اب میں بہت طور پر کوئی بلا ٹانگ کر سکتا ہوں۔ میں
اپنے سلسلے میں کچھ احتیاط سے کام لیتا۔ تمہیں بہر حال میں
خود کو بچانا ہے۔ جو کوشش کرو کہ آؤں سے کونیک ہی سفر
کر۔ میں جلد کوئی پروگرام بنانوں گا اور تم کو کوشش کر کے
ان لوگوں کے زہن سے نکل جائیں گے۔ بس تم غلط رہو۔“
میں اس کے لیے کئی بجلی۔ طاہر نے لاکٹ کو کوٹ کی
اندرونی جیب میں رکھ لیا اور صوفے پر ہم راز ہو گیا۔ میں
نے بدھ کر دیا وہ لاکٹ آسان سے زینت کھڑی تھی۔
”سوی مس تارا مجھے بہت یاد ہو گئی۔“
اس کے معذرت کرنے پر میری نگاہ کھڑی پر پڑی اور
میں حیران رہ گیا۔ رات کا وہ ایک بچہ رہا تھا۔ وقت کے
گزرنے کا خود بھی احساس نہ ہو سکا تھا۔
”وہ مسٹر طاہر ایسے ہیں آپ؟ مس تارا آپ کے لیے
بہت پریشان تھیں۔“
”پریشان ہونا ان کی بلی ہے زینت۔ کچھ دیر پہلے یہ
تمہارے لیے بھی پریشان تھیں۔ تم سناؤ کہی ہو؟ حالات
کیا ہیں۔“
”میں ٹھیک ہوں مسٹر طاہر۔۔۔ اور حالات آپ کو مس
تارے بتا دیے ہوں گے۔“ اس نے میری خیر انداز سے
مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک۔“ اچھا تارا میں چلا ہوں۔ اس کا اللہ انھیں
میں ملاقات ہو گی۔“
”طاہر اتنی رات گئے تھے کہاں جاؤ گے؟“
”اب ٹھیک نہیں ہیں مسٹر طاہر۔“ آپ صبح جائے گا۔
وہیں بھی میں آئے ہوں کچھ مشکوک لوگوں کو دیکھ چکی
ہوں۔“
”مشکوک لوگ؟“ طاہر نے انھیں بیکور کر زینت کو
دیکھا۔
”جی ہاں۔ میں نے ایک گاڑی درختوں کے جھنڈ میں
کھڑی دیکھی ہے۔ جس میں تین افراد موجود تھے۔ اگر ان

میں سے کسی نے سرگرم نہ چلایا وہ تو شاید مجھے ان کی
 مودودی کا پتا نہ چل۔ میں عمارت کی پشت سے ہو کر یہاں
 آئی ہوں ورنہ ممکن ہے وہ مجھے بھی لے لیتے۔
 ”ہنس اپنی رات کے نکلے باہر نہیں رہتا چاہے۔ وہ
 جس کو دیکھ بھی سکتے تھے۔ ”ظاہر ہے تھکانا انداز میں کہا۔
 ”میں معذرت کر چکی ہوں۔ میری والدہ کی طبیعت
 ٹھیک نہیں تھی اور میں اس کی بے حد کوشش کر رہی تھی کہ
 وہ اپنی آنکھیں روئے میں نہ آتی۔“
 ”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ آرام کرو۔“
 زینت شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور
 ظاہر وہیں ذرا ٹینک روم میں بیٹھے رہے۔ نیم دو گھنٹوں
 خاموشی سے گھر بھر جی مجھے ہلک رہتا تھا میرے اندر
 بلا کا شور ہو۔ میں خوف زدہ تھی۔ میں ان لوگوں کے
 درمیان سے فوراً نکلتا جانا چاہتی تھی مگر پھر جی جاتی تھی کہ
 ایسا سوچنا آسان اور عمل کرنا ناممکن مشکل ہے۔ ظاہر مروت
 کر بھی ان لوگوں کے درمیان سے نہیں نکل پاتا تھا تو بھلا
 میں کمزوری لڑکی کس طرح اتنا بد قدم اٹھا سکتی تھی۔
 میں ابھی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک زینت کے
 کمرے کا دروازہ کھلا میں نے اور ظاہر نے چونک کر دیکھا۔
 ”مس آمار آپ نے دو گنا کھائی؟“
 میرے بدن میں شش دو گنا آگیا۔ ”نہیں۔ کون سی دوا؟“
 میں نے دوسرے ہوئے لیجے میں کہا۔
 ”یہ گولیاں وہی تھیں وہ انفرڈا کرنے۔“
 اس نے دو گولیاں میری جانب بڑھا دیں مجھے ظاہر نے
 ہاتھ بڑھا کر لیا۔ ”جاؤ تم یہاں لاؤ۔“ اس نے زینت سے
 کہا۔
 زینت کے جانے کے بعد ظاہر نے مجھے اشارہ کیا کہ میں
 خالی مٹی بند کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا جبکہ وہ دونوں
 گولیاں ظاہر نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ کچھ دیر بعد
 زینت پانی کا کلاس لے کر آئی اور میں نے بند مٹی میں سے
 کھول لی پانی پیا۔ میں ایسا پیچھے میں نے دونوں گولیاں پانی
 کے ساتھ نگلیں لیں۔
 زینت پانی کا کلاس لے کر آئی۔ میں اور ظاہر سرت
 بیٹھے رہ گئے۔ میرے وہم و گم و گم میں بھی نہیں تھا کہ دو گنا

کے لیے کہا جائے گا جب کہ میں بالکل ٹھیک خاک تھی
 ”ظاہر یہ گولیاں۔“
 ”شش۔“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے ظاہر
 رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آئیں بند
 لیت گیا۔ خوف سے میرے سینے پھٹ رہے تھے۔
 گام آتی سے فون نہ کر رہا ہو تو آج میری زندگی
 آخری رات کا چاہتا تھا۔ میں نے کب میری آنکھ لگا
 مجھے ظاہر نے اٹھایا تو میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے
 کانڈ میری جانب بڑھایا۔ کانڈ پر ظاہر کی تحریر تھی
 نے لکھا تھا کہ میں اس کے جانے کے بعد بالکل نہ مرن
 اور وہ طبل کے پاس ہو گا۔ مجھے اس کے جانے کے بعد
 یونی پڑے رہتا تھا میری کیمپ ٹینڈ میں ہوں۔
 ظاہر نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ وہ مجھ سے
 ہو گا۔
 اس نے مجھ لیت جانے کا اشارہ کیا اور خود درواز
 کی طرف بڑھ گیا۔
 میں دھڑکنے والے ساتھ دوبارہ کالین پر لپٹ
 ظاہر کے جانے کے تقریباً آٹھ من بعد زینت کے کمرے
 دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کمرے
 کی مودودی کا احساں ہوا۔ ”مس آمار۔“
 ”آمار۔“ زینت نے مجھے آواز دی۔
 میں نے یونی ٹبل کے پاس لیٹی رہی۔ زینت نے
 کر دیکھا۔ پھر چند من بعد فون کا ڈائل کھولنے کی
 آئی۔
 ”ہیلو۔“ میں زینت بات کر رہی ہوں۔ ہاں ظاہر
 دوسری جانب کی بات سننے کے بعد زینت کا
 ”مجھے اسے بات کرنا ہے یا پھر سینیٹر صاحب
 کراؤ۔“ چند لمبے خاموشی طاری رہی۔ شاید دوسری
 سے ہو کر لپٹا گیا تھا۔
 چند لمحوں بعد زینت کی آواز آئی۔ ”سر میں
 کر رہی ہوں۔ جی سر وہ بے ہوش ہے مگر میرا خیال
 یہ سب بیکار ہے۔ میں ہر طرح اپنا اطمینان قائم
 لائٹ نہیں بھیجیں ظاہر اور میں آمار کی سرگرمی

لڑکی نہیں ہیں۔ جی سر۔ آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔
 ہاں آج ظاہر صاحب آئے تھے۔ جی نہیں رات تو میں
 مگر اس وقت وہ یہاں نہیں ہیں۔ جی سر میرے لیے کیا
 کر رہے۔“
 زینت خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سننے لگی۔
 میں سرگرم میرا یہاں رہنا مت مشکل ہے۔ میں نہیں
 لپٹ گیا۔ کچھ دیر بعد کیا ہو گا۔ سر آپ فون کو سمجھ دیں۔
 میں یہاں سے جلدی نکل پانا چاہیے اور سر ایک اور
 ہے۔ جی سر میرے ذمے وہ کام تھا وہ نے لیا ہے۔
 میں سرگرمی میں سکون چاہتی ہوں۔ مجھ پر رحم کریں سر۔
 ”ماں اور میری بہن۔“
 اس کے ساتھ ہی زینت کی آواز بھرا لگی۔ شاید وہ رو
 جی۔ میں مضطرب ہوئی مگر مجھے ظاہر کی بات پر سختی
 کل رہا تھا اس لیے اس کی طرف خاموشی لپٹ رہی۔
 ”ٹینک بے سر۔“ تھینک بے سر۔ مجھے وعدہ کیا تھا کہ میں سر
 اور لپٹ بھی نہیں پڑنے والی ہوں۔ یہ اگر گرت سر۔“
 پھر رسیور رکھنے کی آواز آئی اور میں نے زینت کو اپنے
 کمرے میں کھنکھارے۔ میرا دل طلق میں دھڑکتا محسوس ہو رہا
 جانے لگا تھا۔ میں نے وہاں تھا مگر مجھے ظاہر کی وجہ سے
 احساس تھا۔ ظاہر بچے طبل کے ٹینک میں موجود تھا
 کہ تھینک تھا کہ اس نے زینت کی تمام نگینوں میں بی ہوگی۔
 میرا یقین صحیح تھا چند ہی لمحوں بعد آہستہ سے دروازہ
 کی آواز آئی۔ زینت شاید اپنے کمرے میں تھی۔ اس
 کی بات سے اندازہ ہو تا تھا کہ وہ جانے کے لیے تیار ہے۔
 آنکھ کی بھری سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ظاہر
 تھا۔ اس کے ہاتھ میں پتھل تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے
 میں کھول دیں۔
 ”شش۔“ اس نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے
 رہنے کا اشارہ کیا اور بعد میں قدم میرے بند دوم
 لپٹ گیا۔ اندر جا کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھول لیا
 جی دم ساتھ پڑی تھی۔ زینت ابھی تک اپنے
 کمرے میں تھی۔ میں نے جیب سے سناٹا پھاڑا تھا۔ صرف
 لاک کی تک گونج رہی تھی یا میری اندر دل کے

دھڑکنے سے ایک بھونچا سا لپٹا ہوا تھا۔ میں آنکھوں کی
 بھری سے زینت کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 اچانک زینت اپنے کمرے سے نکلی اور میرے بند دوم
 کی طرف بڑھ گئی۔ میرا دل اچھل کر قتل میں آیا۔ اس
 سے پہلے کہ میں آنے والے لپٹوں کا احاطہ کرتی وہ دروازہ
 کھول چکی تھی پھر اچھل کر بیٹھ جانا میرا اچھل کر
 بیٹھ جانے کی وجہ زینت کی دلی دلچسپی تھی۔ اس کے سامنے
 ظاہر ہاتھ میں پتھل کے کڑا تھا۔ زینت کا رنگ پیلا پڑ چکا
 تھا۔ اس کی ٹانگوں میں شاید کھڑے رہنے کی سکت نہیں
 تھی۔ وہ وہیں دروازے کی چوٹ پر بیٹھ گئی۔
 ”کڑی ہو چکا زینت۔“ ظاہر نے ٹھہرے ہوئے سا فک
 لیے میں اسے مخاطب کیا۔
 اس نے بے بسی سے ظاہر کی جانب دیکھا۔
 میں اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مجھے اپنے قریب پا کر
 زینت نے جرت اور خوف سے مجھے دیکھا اور پھر اس کی
 آنکھوں سے آنسو بہنے لگی۔
 میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”زینت تم۔۔۔“
 ”مجھے معاف کریں مس آمار۔ مگر میں مجبور تھی۔ اگر
 میں ایسا نہ کرتی تو وہ۔ میری ماں اور میری معذور بہن کو مار
 دیتے۔“ آمار کہہ کر زینت نے بیٹھ چوٹ کر رونا شروع
 کر دیا۔
 میں نے اٹھ کر فریج سے پانی نکالا اور گلاس زینت کی
 طرف بڑھا دیا جس نے زینت نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے لے
 لیا اور پوں ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا پیچھے وہ صدیوں
 سے پانی ہو۔
 اس دوران ظاہر میرے بند پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے پتھل
 کا رخ اب بھی زینت کی طرف تھا اور ٹانگوں اس کے
 چہرے پر ہوتی تھیں۔
 پانی پینے کے بعد زینت کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ وہ
 دروازے کی چوٹ پکڑ کر کھڑی ہوئی تو ظاہر نے مجھے کرسی
 اٹھا کر لے گا اشارہ کیا۔ میں لاؤنج سے کرسی اٹھا کر لائی۔
 ”بیٹھو۔“ ظاہر نے زینت سے کہا۔
 وہ کرسی پر کھنکھائی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگوں کھڑکی کی
 جانب آئیں اور چہرے پر خوف کھیل گیا۔

”فلز نہ کرو۔ میں نے غلیل سے کمر دیا ہے وہ کسی کو بھی
 یرام تک نہیں پہنچنے دے گا۔ تم شروع ہو جاؤ۔ میں شروع
 سے ساری بات سننا چاہتا ہوں۔ یاد رکھو جو بحث سے مجھے
 نفرت ہے۔ کسی بھی قسم کی چلائی گئی کوئی چال ہے پر مجبور
 کر سکتی ہے۔“ طاہر کے انداز اور لہجے میں ہلا کی صفائی تھی۔
 میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لرزہ دوڑ گئی۔ میں طاہر کا یہ
 روپ شاید دوسری مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے
 اسے زائد بھائی پر خیر نکالے دیکھا تھا تو یران ہوئی تھی۔
 مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ طاہر مجھے معصوم اور مہذب
 سامنے آئی تھی اس قدر صفائی دیکھ کر ہو سکتی ہے۔
 ”میں مجبور تھی مگر سطرابہ یقین کیجئے۔“
 ”خاموش۔۔۔“ وہ بیچ اٹھا۔ مجھے بھی قسم کی صفائی
 نہیں چاہی ساری رام اٹھائی تھا تب سے کہ تم کوں ہو یرام
 تک کیوں نہیں اور آتا رہا ہے ہم سے کیا جانتی تھیں
 میں یہ بھی سننا پسند کروں گا کہ یہ سب تم کس کے حکم پر
 کر رہی ہو؟“

”جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں حالات کی وجہ سے
 غوغا ایسے ہی کام سے لیتی ہوں جس میں کسی قسم کی جاسوسی
 کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ جس کا کام کا معاوضہ کافی مل جاتا
 ہے۔ آپ سے بات ہونے سے پہلے مجھے ملک فواز سے ایک
 شخص نے کھڑی نوکری پیشیت سے رکھا تھا۔ وہ اپنی
 بیوی کی حرکت کی مفصل رپورٹ دیتا چلتا تھا۔ میں اس کی
 مرضی کے مطابق تمام کام کرتی تھی۔ اس کی بیوی کی
 سرگرمیاں منگوا کر تھیں وہ اکثر ملک فواز کی غیر موجودگی
 میں رات رات بھر گھر سے غائب رہتی تھی۔ میرے بیچ
 جانے کے بعد اس نے مجھے انکشاف میں لینے کی کوشش کی اور
 پھر میں پروگرام کے مطابق اس کی رازدار بن گئی۔ یہ میرے
 رازدار بننے کے بعد اکثر ملک صاحب کی غیر موجودگی میں
 ایک شخص بنیم ملک کے پاس آئے گا جس کا نام سیٹھ
 سلطان تھا۔ یہ بہت مالدار آدمی تھا رازدار ہونے کے سوا
 اس نے اکثر و بیشتر مجھے تحائف سے نوازنا شروع کر دیا۔
 میرے ذمے چھوٹے موٹے کچھ کام کیے جنہیں میں زیادہ
 معاوضے کے لالچ میں کرتی رہی تھان پھوٹے موٹے
 کاموں کی اہمیت سے ناواقف رہی۔ اس کے باوجود میں نے

کافی زہانت سے وہ کام انجام دیے۔“

”اس طرح ایک طرف تو مجھے ملک فواز سے تنخواہ
 پر ہماری رقم مل جاتی تھی اور دوسری طرف بنیم ملک
 سیٹھ سلطان بھی مجھے کافی رقم دے دیتے تھے۔ میں
 عرصے تک اس شلٹ کو قائم رکھا مگر بنیم ملک کی
 سرگرمیاں ملک فواز سے سمجھی نہ رہ سکیں۔ اس لیے
 طاہر دے دی اور میں میری بھی چھٹی ہو گئی۔
 میں ان دنوں کام کی تلاش میں تھی کہ اچانک ایک
 بنیم ملک جو اب صرف سارہ خانہ رہ گئی تھیں
 آجائیں۔ انھیں دیکھ کر میں بہت حیران ہوئی کیوں
 انھیں اپنے گھر کا انوکھ نہیں بتایا تھا۔ اس
 مجھے بتایا کہ سیٹھ سلطان مجھ سے کام لینا چاہتا ہے۔
 ”میں جانتی تھی کہ سیٹھ سلطان کام کا اچھا مواد
 ہے۔ میں خود آتی رہی ہوگی۔ سیٹھ سلطان نے
 مجھے پرکشش تنخواہ پر ملازم رکھا اور حسب سالی
 کام لینا ہوا مگر میں مجھے بہت جلد علم ہو گیا کہ
 سرگرمیوں میں ملوث ہے جو ملک و قوم کے مفاد میں
 وہ ہیں۔ مجھے چھپوں کا لالچ ضرور تھا کہ میں اس کی
 میں ملوث رہا تو میں جانتی تھی جس سے نیرا فائدہ
 جانے میں میرا ان کو کھرا کھرا اختیار کیا جاتا ہے۔
 کہ اب اپنے معاملے میں خود مختار نہیں رہی ملک
 چاہوں بھی تو ان کے گردوے بھاگ کر کہیں نہیں
 سیٹھ سلطان نے بتایا تھا اگر میں نے ایسی کوشش
 میری ماں اور میری بہن کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“
 ”میں بہن کا تعلق سے معذور ہے اور ماں کو بوسا
 اپنا بچ کر دیا ہے۔ ان دونوں کی واحد تکلیف میں ان
 بھر میں میرا ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔
 سلطان کے اشاروں پر تپانے کو تیار ہو گئی۔
 روئے دھوئے کا اٹھ اٹھ ہوا کہ سیٹھ سلطان نے
 کام میرے ذمے نہیں کیا جو خیر خراب ہوا یا نہیں
 پکڑے جانے کا خضر ہو جبکہ سارہ خانہ کو وہ ملک
 بھیجا ہوا وہ ”مال“ کے لڑکائی بار غیر ممالک
 بھی اس سے اس کا ہی کام بتا کر دے گی کوشش کی
 صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ مجھے اس کام پر

دلہ ورنہ میں انجام کی پرواہ کیے بغیر پولس کے پاس
 اس کی۔ شاید کسی وجہ سے اس نے دوبارہ کوشش نہیں
 کر سکی۔ پچھلے دنوں اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ آپ کو کھر
 لے لے ملازم کی ضرورت ہے۔ اس نے مجھے یہاں کام
 لے اور یہاں کی تمام باتوں کی رپورٹ دینے کو کہا۔ اس
 کو سونے کے لاکٹ کی تلاش ہے جو اس کی معلومات کے
 مطابق آپ کے پاس تار کے پاس ہے۔ میں نے اسے ہر
 بات جاننے کی کوشش کی کہ کس تار کا ایسے کیسے مجھے
 کوئی تعلق نہیں مگر وہ ماں کو تیار نہیں ہوا۔ میں یہاں
 کی کوشش کے سلسلے میں آئی تھی۔ یہاں ملازمت
 میں کرنے کے سلسلے میں مجھے بہت دشواریاں پیش
 میں نے آپ سے ملنے کے لیے اور اپنی دھاک
 لگائی۔ اور آپ کا احاطہ حاصل کرنے کے لیے کافی محنت کی۔
 میں نے کئی سے راہوں سے پیہل کی اور اس طرح یہاں کام
 میں کرنے میں کامیاب ہوئی۔“
 زہانت غرض حال ہو کر خاموش ہو گئی۔ اس کی نگاہیں پھر
 طاہر پر جم گئیں۔ طاہر ہزاروں سال خاموشی سے اس کی
 ہلاکت دیکھ رہے تھے۔
 ”آج کل پروگرام تھا؟“ طاہر نے کچھ نرم لہجے میں پوچھا۔
 ”آج میں یہاں سے جانے والی تھی۔ کچھ دن دیر بعد
 سلطان کے آدمی یہاں آئیں گے۔ وہ میں تار کو بھی
 جانیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ پروگرام میں تھا۔“
 ”ملا گئی۔“
 ”کس تار کا کیوں؟“
 ”میں تار کا کیوں کہتا ہے کہ وہ لاکٹ میں تار کے
 ہے۔ وہ اپنے طریقے سے اسے نکالنا چاہتا ہے اور پھر
 اس طرح آپ بھی پوری طرح اس کے قابو میں آجاتے اور
 میں تار کی قیمت میں آپ سے لاکٹ کا سودا کر لیتا۔“
 ”کیسے بات اور؟“ جنہیں یہ دو۔“ میرا مطلب ہے
 لاپاپاں ایک سے دینے کے تار کو کھلا دو۔“
 ”طریقہ یہ ہے۔ وہ سیٹھ سلطان کا خاص آدمی ہے۔
 لڑاؤ کر کے ساتھ وہ بھی یہاں آتا تھا۔“
 ”ڈاکٹر زاکر سے اس کا تعلق ہے؟“ طاہر نے پھر
 ڈال لیا۔

”میں نہیں جانتی میں اس سے پہلے ڈاکٹر زاکر کو
 نہیں دیکھا اور جہاں تک مجھے یاد رہتا ہے اس کا نام کا کوئی
 شخص سیٹھ سلطان کے گردوے میں نہیں ہے۔ میں خود بھی
 اسے اس طرح ڈاکٹر کے ساتھ کھڑی نہیں دیکھتا ہوں۔
 حیران ہو گئی تھی ورنہ تو یہ تھا کہ وہ دن کسی بھی
 وقت سامنے آتا لیکن میں مجھے ملے گا اور میں اس سے
 وہاں یہ گولیاں حاصل کر لوں گی۔“
 ”بول۔ اب۔۔۔ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے؟“
 ”پہلے مجھ پر دم کریں میری ماں اور بہن۔“ وہ پھر
 روئے لگی۔
 ”یہ وہاں نہ کرو۔“ طاہر اچانک اٹھ اٹھا۔ ”جس یاد
 ہے کہ جب تم میرے پاس نوکری کے لیے آئی تھی تب
 بھی تم نے اپنی بڑی چالوں اور حضور بہن کا زندہ دیکھا تھا۔“
 ”جی سہوہہ بات بھی سچ تھی اور یہ بات بھی سچ ہے۔
 میری ماں اور بہن کی زندگی اس وقت سے اب تک خضرے
 میں ہے۔ اگر مجھے جھوٹ پوانا ہو تو میں دوسری باتوں میں
 بھی آپ سے جھوٹ پوئی مگر خضرہ ادا ہے کہ میں نے آپ
 کو سچ بیچ چاہا ہے۔“
 ”ہوں سنو۔ تم کچھ دیر بعد باہر جاؤ گے۔ طاہر ہے
 تمہارے آدمی غلیل کو چوس کر یہاں تک آنے کی
 بہت قوتیں کریں گے مگر وہ ابھی بخیر نہیں
 ہوں گے۔ تم ان سے جا کر کوئی کار میں یہاں موجود ہوں
 اس لیے میں تار کو یہاں سے لے جاتا ہوں نہیں۔“
 ”مگر سطرابہ میں انھیں پتا چلی ہوں کہ آپ یہاں
 نہیں ہیں۔“
 ”میں جانتا ہوں مگر اب تم ان کو بتاؤ گی کہ میں بیڈ روم
 میں سو رہا ہوں۔ تم اس وقت میں جانتی تھیں اس لیے تم
 نے انھیں غلط اطلاع دی تھی اچانک تم کس تار کے بیڈ
 روم میں داخل ہوئیں تو تم نے مجھے سو ناہو پایا۔ پھر میں
 تمہاری اہمیت سے اٹھ گیا اور میری موجودگی میں کس
 تار کو یہاں سے لے جانا ناممکن ہے اتنا تو سیٹھ سلطان بھی
 سمجھتا ہو گا کہ میری ماں نہ جی رہی ہو؟“
 ”کیسے۔۔۔ درج رہی بول۔“ اس کے چہرے پر اچانک
 اطمینان سا چل گیا۔ ”میں اس کی بے بسی پر تڑپا۔“
 ”ارباب۔ تو کام تمہارا انجام دے رہی تھیں یہی تم
 انجام دو گی وہاں کی تمام پولس مجھے بتیادگی اس کے لیے

ماہنامہ دوشنبہ یزدا کراچی 207

ہوئی جس کی اس نے ہنسنے پر سوئی۔ میں نے اس کی بھی ہنسی
تھی کہ شام سے پہلے میری آنکھ نہ کھلی۔ شام کو اچھی تو خیال
آیا کہ ڈاکٹر ڈاکو آج آج آپ شام میں اٹھ کر تیار ہو گئی۔ وہ کسی
بھی وقت آسکتے تھے۔

چند ہی منٹ بعد کل بجی اٹھی اور موقع کے عین مطابق
ڈاکٹر ڈاکو آگئے۔

”بھولکسی ہیں آپ؟“

”بالکل ٹھیک آپ کی سنا ہے؟“

”بس ٹھیک ہی ہوں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر ڈاکو اندر آگئے۔
میں نے پہلی مرتبہ انھیں غور سے دیکھا تھا وہ اچھے خاصے
خوبصورت اور امارت آوی تھے، ان کی شخصیت میں وقار
تھا جو آدمی کو پہلی ملاقات میں متاثر کر دیتا تھا۔ آج ڈاکٹر
ڈاکو کچھ زیادہ ہی اہتمام کر کے آئے تھے۔ ان کے جسم سے
خوشبوؤں کی لٹیں اٹھ رہی تھیں۔

”جیسے میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

”کیوں کیا میں باہر نہیں جا رہا ہے؟“

”کیوں نہیں۔ ہم دُزخ باز کیرس گھر چائے تو یہاں بی

تکتے ہیں نا؟“

”جیسی آپ کی مرضی! انھوں نے مکرار کیا اور میں
بکس میں بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھے زینت کی بڑی سی محسوس
ہو رہی تھی۔ میں جیسے بھوکھی تھی، اگر کچھ دیر پہلے
جاتی تو کچھ نہ کچھ سہارا کتنی گراں ڈاکٹر ڈاکو کے آتے
کے بعد یہ ممکن رہا تھا۔ میں چائے بھگت اور کچھ
نمکین چیزیں بھی لے آئی۔

”مس ڈاکو! اگر کھلف کیا تو ڈر کیا ہو گا؟“

”سورہ ڈاکٹر ڈاکو اس میں مجھ سے بھوکھی ہوں۔ رات بھر
جاتی رہی اور جی سولی کی اس لیے آپ کے کتے آئے
تو خودی دیر پہلے ہی سو گرا تھی۔“
”ہاں مجھے احساس ہے کچھ بھی کیفیت میری بھی تھی۔
میں رات بھر نہیں سویا۔“

میں نے ڈاکٹر ڈاکو کی آنکھوں میں جھانکا جس میں سچائی
بھری ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے چائے کپ میں انڈلی اور
کپ کی جانب بڑھایا۔

”ڈاکٹر ڈاکو! کیا آپ میرے چند سوالوں کا جواب دیتا

پندرہ کریں گے؟“

”جی فرمائیے! اگر ان سوالوں کا جواب میرے پاس ہو گا

تو میں ضرور دوں گا۔“

”مجھے جو درد کھانے سے آپ نے روکا تھا؟ وہ کیا

کس نے دی تھی؟“

”میں اس کے لیے مجھے تفصیل میں پانچا

گی۔“

”میں تفصیل سننا پسند کروں گی۔“

”جس وقت آپ کا آدمی مجھے لینے پہنچا تھا اسی

دوڑ سے پہلے جی نہیں دیکھا تھا کہ انھوں نے خود

دوست ظاہر کیا۔ دراصل انھوں نے میرے ایک

پرانے دوست کا ڈاکو دیا تھا اور مجھے پیغام پہنچایا تھا کہ

دوڑ میرے پرانے دوست نے مجھے کھانے پر بلایا۔

پیغام کے مطابق مجھے سڑطراق کے ساتھ ہی ان

جاتا تھا کہ ان کے ہونے سمیت میرے عرصہ

تھا اور ان کا ٹائیڈ ریس نہیں جانتا تھا اس لیے میں

طریق کے ساتھ چائے پر مشامیر ہو گیا۔ میں آخری

دیکھ رہا تھا کہ آپ کا آدمی پہنچ گیا۔“

”مجھے سڑطراق سے معذرت کی کہ وہ میرا

کیرس گھر میرے ساتھ ہی چلے آئے۔ ان کا مقصد

کہ ہم یہاں سے سیدھے اسی دوست کے گھر چلیں

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میرے لیے اس سے

بھی نہیں پڑتا تھا۔ یہاں آخر میں سے محسوس کیا کہ

ملازمہ دو سڑطراق کی پہلے سے جان پہچان ہے۔

اگر کوئی دوا نہیں دی تھی تو میں نے سڑطراق

گولیاں آپ کی ملازمہ کو دے دیکھی تھیں۔ اس وقت

میں نے مجھے خطرے کا احساس دلایا، اس

اس وقت نوعیت پہنچی جب یہاں سے جانے کے بعد

طریق نہ کر کے گھر چلے آئے۔ میرے دل میں

کرنے کا باوجود دلچسپی نہ آئی۔ ان کی اس حرکت

میرے دل میں ٹھوک بھر دی۔ میں نے گھر جانے

ڈاکٹر کی میں اپنے پرانے دوست جیمز تک کا ٹائیڈ ریس

فون گھر کا رخ کیا تو مجھے کوشش کے بعد دل کیا۔

فون کرنے پر معلوم ہوا کہ سڑطراق کو قلعہ میں

اور وہی انھوں نے ان کے درمیان کوئی پیغام بھیجا تھا۔

طریق نے مجھے کوئی تصدیق نہیں پہنچائی تھا اس لیے

صاف ہو گئی کہ انھوں نے مجھے آپ تک پہنچنے کا ذریعہ

پہ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ آپ خطرے میں
ہیں۔ جو گولیاں سڑطراق نے آپ کی ملازمہ کو دی تھیں
”جیمز“ آپ ہی کے ہونے لگی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے
آپ کو فون کر دیا۔“

”آپ کو میرا فون کبہرے ملا۔“

”آپ ڈاکٹر کی سے۔ میں آپ کا ٹائیڈ ریس جانتا ہوں کیوں

کہ میرا ٹھکانہ اسی علاقے میں ہے۔ وہاں سے میں نے فون

کے لیے آپ کی کاپی نہیں دیکھا تھا۔ آپ اب بتائیے کہ

بہرے لے آیا اور آپ کو خبردار کر دیا۔ آپ اب بتائیے کہ

آپ کے ساتھ کیا ہوا اور کیوں۔ آپ کی ان گولوں سے

کا درشتی ہے؟“

میں نے ڈاکٹر ڈاکو کو بتایا کہ انھوں نے مجھے گولیاں دیں

میں کمرے میں کھائیں۔ دوپہر کی بات میں کول

کرائی اور انھیں میں بتایا کہ شاید ان لوگوں کا پروگرام

پوری یا آدھے ہو گا۔ میں نے ڈاکٹر ڈاکو کو بتایا کہ میں نے

آج صبح اپنی اس ملازمہ کو نکال دیا ہے۔

”آپ نے بہت اچھا کیا یہاں کسی پر بھروسہ کرنا

بھلا ہے۔ یہ دلی آچھی خاصی بڑھی ہوئی لگتی تھی“

”اذا زود لگتی ہی نہیں تھی۔ میں تو پہلی نظر میں اسے آپ کی

ان میں ہی سمجھا تھا کہ میری گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ آپ کی

ملازمہ ہے۔“

”جی! ڈاکٹر ڈاکو نے آپ کی شکر گزار ہوں۔“

”مجھ کو سب سے ان باتوں کو میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا

چاہیے۔“ ڈاکٹر ڈاکو نے کوئی دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ضرور۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم گھر سے نکل کر بے مقصد سڑطراق پر گھومتے رہے۔

ڈاکٹر ڈاکو نے بیٹھائی ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ

ان کے ماں باپ بگڑ دیش میں ہیں اور وہ یہاں اپنے

ہوئے بھائی کے ساتھ رہتے ہیں اور یہاں ان کے دوہے آج

پہلی بار اس طرح گھومنے لگے۔ وہ دن ان کی زندگی کسی

بدولم کی طرح ہو گیا۔ ایک خاص سرگرمی میں خوش رہتے

ہوئے۔ وہ آج اپنے آپ کو صرف ہلکا سا بگڑا۔ یہ حد

خوش محسوس کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہماری دوستی

کافی زیادہ رہی ہوگی۔

میں ان کی باتوں پر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی، مجھے

معلوم تھا کہ شاید آج کے بعد میں ان سے کبھی نہ مل سکوں

مجھے جو تھا کہ وہ معلوم نہ تھا کہ کیا تھا؟ اور انھوں نے جو

کہہ دیا تھا اس پر بھی یقین نہیں کیا تھا۔

ہم نے دو گھنٹوں میں کھانا کھا لیا۔ ایک کھانا کی کافی اور ڈاکٹر

ڈاکر نے مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ بھی کیا جو میں نے یہ کہہ

کر دیا تھا کہ دوبارہ ملنے کے وقت کا یقین ابھی مشکل

ہے۔ انھوں نے ”تقریباً“ سوا ایکارہ بجے گھر پر ڈراپ

کر دیا۔ میں حافظہ کے کمرڈنگ کی میزبونی تک پہنچی

تھی کہ خیال کی ڈاکٹر ڈاکو نے داخل ہوتے ہی بتائیے کہ

آج کل میری ہی عمر کی گراہا۔

”کھیتنے کے بعد میں بھی کھلی ہی ہنسنے لگی۔“

”وہ صرف اعلیٰ تاؤ تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں خلاؤں

میں چلتی ہوں۔“

حالات بدن دین بگڑتے جا رہے تھے۔ میری خاطر کا وجود

میرے لیے نیست تھا۔ میں کپڑے بدل کر ہنسنے لگی تھی

کہ طائر کا فون آگیا۔ میں نے شروع سے ترنک ساری

کھانا سے بتادی، ”میری طرح اسے بھی اس ساری کھانا کی

چٹائی پر ٹھک جائے۔“

”آپ دوبارہ اس سے ملنے کو خوش نہ کرنا؟ اگر وہ کبھی

ملنے کو کئے تو ہمانہ کرنا۔ میں نے اپنے کوئی کواہیت

کر دی ہے۔ وہ مدت جلد ڈاکٹر ڈاکر کے تمام حالات معلوم

کے ساتھ ساتھ ہی ہو گئی۔ میں کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔“

”تمہیں کتنی ہی ضرورت نہیں ظاہر ہو گئی کوئی بچی

نہیں ہوں۔“

”وہ تو آپ اب بڑی ہو گئی ہیں؟“ اس نے شرف لے

میں کہا۔

”جی ہاں۔“ میں نے جمل کر جواب دیا۔

وہ جس پڑا ”اس نے کوئی اور الٹی سیدھی بات تو نہیں

کی نا؟“

”اگر کبھی ہو تو تمہیں کیا؟“ میں نے اسی لیے میں کہا۔

”دیکھو! رات آج مجھ سے کبھی کوئی خاتون نہیں دو گئی۔“

اس نے مجھے مہمانی میں آپ اب اگر تھوڑی سی ہو تو

متانے کا طریقہ بھی بتا دو۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں ان میں

جدت پیدا کروں گا۔“

میں نے مجھ میں رہنمائی کر لیں۔ پڑنا اور بچہ دہر میں

وہیں جیسی طائر کی باتوں پر کتنی ہی بے پرواہی میں چلی

آئی۔ رات بھر جاتے رہے۔ میں دو دو بارہا تھیں نے

درد کی گولی کھائی اور سونے کے لیے لیٹی۔“

خیر آگھوں سے دور تھی۔ اچانک مجھے ایسا یاد آیا کہ گھس پھر کر کالک ایک ایک فرد ایک ایک بے اختیار آگھوں سے آنسو بنے گئے۔ وہ لوگ اپنے نہ ہونے ہوئے بھی میرا بچہ تھے مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ جس وجہ سے میں نے ان کو چھوڑا تھا وہ کام بھی نہ ہوا اور میں ایک تنہی چھائیوں سے گھریا کھڑا وہ چھپ میں نکل تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ظاہر کو کہ بیڑوں کی وہ سب کی خیریت لے آتا تھا تو مجھے کچھ سکون ہوجاتا تھا پھر پیچھے بچے ہوئے بھی مدت ہو گئے تھے جانے اب ان کی طبیعت کیسی ہوئی۔ ایسی باتیں سوچتے سوچتے خند آئی۔

میں انکی طبیعت دوسرے بہتر تھی۔ میں نے چاہے بتائی اور بالکل کاروراء کھول کر اظہار اظہار اخبار دیا جانے کا لپے میں بیڑوں میں آئی تھیں اب اخبار پڑھنے کے سوا میرے پاس کوئی کام بھی نہ تھا۔

میں نے پیچھے ہی اخبار کو کھولا خوف سے میری جھج جھج گئی۔ مجھے پھر بھی زندگی کی تصویر اور پیچھے لگے تھا۔ ”جوان اور خمور لڑکی کا ہونا کھل“ میں اس سے آگے کچھ بھی نہ پڑھ سکی اور فون کی طرف پھینچ۔ میرے ہاتھ بری طرح کاپ رہے تھے میں نے بے مشکل ہیرا دل دے دے دسری طرف تھیل بھی دی۔ ”مجھ کے قریب“ سات پیچھے تھے۔ میں تھاکہ کہ ظاہر ابھی کچھ سہا ہوا تھا۔ یعنی ریسیور تھاسے بھی رہی میری آگھوں سے آنسو بہ رہے تھے زندگی کی سختی سزا کی شدید میری آگھوں میں گھوم رہی تھی۔ کاش میں نے اسے نہ جانے دیا ہوتا تو شاید۔

ابھی میں نے ریسیور نہ رکھا تھا کہ اچانک کال بیل بج اٹھی میری نگاہ بے اختیار گھڑکی کی جانب اٹھی سات کے بارہ منٹ ہوئے تھے۔ اتنی بیل کون ہو سکتا ہے؟ میں نے ریسیور کر لیں پڑا لے ہوئے سوچا اور اٹھ کر دروازے پر آئی۔

”کون؟“

”کھولو تارا۔“

ظاہر کی آواز سننے کی تھی۔ بیچٹ کر دروازہ کھول دیا اور ظاہر کے اندر آئے میں بے اختیار اس سے پرت گئی۔

”ظاہر یہ زینت۔ زینت مرمتی ہے ظاہر۔ اسے کسی

”میری آواز زندہ ہوئی اور میں آگے کچھ نہ کر سکی۔ میں جانتا ہوں میں نے پیچھے ہی اخبار دیکھا تھا۔ میرا چلا آیا میں جانتا تھا کہ تم۔“ وہ میری تحریر تھی۔

”بولو۔“

میں جھوٹ جھوٹ کر رو رہی تھی قہقہہ لگتا تھا پیچھے ہٹ سندر سامنے ہوں۔ آنسو کی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے ظاہر میراں سے کیس لکھی تھیں۔ میراں دم کھٹا ہے ظاہر وہ لوگ ہمیں بھی مارا کرتے تھے۔

”تارا اپنے آپ کو سنبھالو بغیر بلا تک کے ہم کو بھی نہیں کر سکتے تھی۔ کوئی بچہ تک میں زندہ ہوں گا۔“

”جی نہیں اسے آؤں گا۔ تم بیٹھو میں تمھارے لیے کھانا بنا تا ہوں۔ میں سکون سے پوری خبر پڑھتا ہوں اس تک میں نے صرف خبری کر ہی پڑھی ہے۔“

”وہ مجھے سونے پر بٹھا کر کھان کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی کوشش کے نہ آئی تھ۔ میری آگھوں میں جان ہی نہ رہی تھی۔ میں گرسے ہوئے گئے کو یوں دیکھ رہی تھی مجھے دیکھ رہی ہوں۔“

”میں اپنی اعصاب کی مالک ہوں بی بی! پیڑا ہوئی ہی ہے بے حس تھی مجھے ایسے چھوئے چھوئے اور اس سے زور سے کہیں لگت۔“ زینت کا جمل میرے پرے دور گونج رہا تھا۔ وہ آہی اعصاب کی مالک نہیں لڑکی اس چھوئے سے زارے نے موت کی بے جا ک اور وادی میں آنا رہا تھا اور وہ میرے سامنے اخبار کے پرکھن گھری پڑی تھی وہ آہی اعصاب کی نہیں کے وجود کی مالک ہو جو ذرا سی ٹھیس لگے سے پچانا پڑا ہو۔

”چائے!“

”غریب ظاہر۔“

”تمھارے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ اس نے مسکرا کر کہا پھر چائے کا کپ میرے سامنے ہی بیٹھا گیا۔ ”دیکھو تارا۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ تم حرکت ہو۔“

”جیس بیڈی ظاہر ناک ہوتا چاہیے۔“

”اعصاب سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسا ہوتا ہے۔“

”اگرچہ آپ کو ناک میں جھینس ملا تا کاؤٹ مارا لگتا ہے میں اور خود میں قوت اور خود اعتمادی پیدا نہیں کیا۔ یاد رکھو یہ دنیا ہے۔ اگر تم میں دوسروں کو دھکا دے کر اپنے بڑے کی صلاحیت ہے تو ضرور آگے بڑھو اور اس انتظار میں ماری جاؤ کہ لوگ ہمیں خاتون قرار دیتے۔“

”اگرچہ تمھارے آگے بڑھنے کا راستہ دین کے ہیں۔“

”میں ایک ایک جھل میں بیٹے کے قدم پر قدم پر خود خوردہ دے ہماری کھات میں ہیں۔“

”اے میں موت کے کھاتے نہ آتا تو ہم خود ان کی نشان دہی نہ جاتیں گے۔“

”جنگل درندوں کا بے اور اس کے نزدیک مرد عورت کی کوئی چیز نہیں۔ اس کو روت کو بھی اتنا ہی طاقت ور نہ چاہیے جتنا کسی مرد

”میں سہا سہا میں کیوں کر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں تمھاری آگھوں میں آئندہ آنسو دیکھنا چاہتا تھا۔“

”تمھارے ہاتھ بیڑوں میں لڑنے دیکھا۔“

”میں کیوں نہیں میں جس میں مضبوط اعصاب کا مالک ہونا چاہتا ہوں۔ موت سب کو آتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ موت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور میں کو نہیں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

”جس میں اس کا نتیجہ پڑے کہ تم آئیے عمل کرنا۔“

”ظاہر تم بہت خوف کا نہیں لگتے ہو۔“

”خوف کا ہاتھیں ہی نہیں خوف کا حالت سے سننے کا

”میں اس صورت میں موت آتی ہے جس شکل میں میں نہ ہوں۔“

”میں اور خود اپنے بڑے ہیں۔ اگر تم اس کی موت میں نہیں چاہتے تو اپنے لیے کسی سکون موت کو بھی نہیں سکتی۔“

گاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں خود پہ کاپوئے کی گام کو شش کر رہی تھی۔

"گاہر میں میاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں میاں اکیلی ایک پل میں بھی نہ سکتی تھ۔ تم مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔ میں وہاں رہ لوں گی مگر۔"

"بے وقت ہو تو تم۔" اس نے میری بات کاٹ دی "جن لوگوں نے زینت کو میاں بھی بھیجا تھا وہ تم سے بھی خوب واقع ہیں اور میرے خیال میں تم پر نگاہ بھی رکھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے نزدیک اس پائی کا انتم مہو ہو اور ان کا خیال ہے کہ لاکٹ جیسی انمول چیز تمھارے پاس ہے اور ان کا یہ خیال بھی ہے۔ تمھارے خیال میں میاں سے گھر جا کر محفوظ ہو جاؤ گی؟ نہیں آرا بیگم بلکہ وہاں جا کر تم ان لوگوں کو بھی پریشانیوں کے انتہائی پیکل میں ڈال دو گی۔ تمھاری وجہ سے اندازاً "اس اور اب بھی اذیت کا شکار ہو جائیں گے۔"

"میں کیا کروں میرے خدا میں نے وہ گھر چھوڑا ہی کیوں تھا۔"

"آپ کو تلاش کرنے کے لیے اپنی ماں کے قاتلوں تک پہنچے اور آپ کو پانے کے لیے۔"

"ظہار نے یہ کہ میرے اعصاب سمجھا دیے۔"

"مگر ظہار میاں تو ظہار ہی ہیں جو میں میں قاتل کی ماں باپ سے بھی ہاتھ جو بیٹھی جھڑپوں سے میں میں قاتل دھوپ اور دھن کے اندر رسواں سے چلتا ہوا تھا۔"

"نہیں آرا۔ یہ بات نہیں بات ہے کہ تم حوصلہ ہار بیٹھی ہو۔ ورنہ تمھارا باپ اگر زندہ ہے تو تم حال میں اس تک پہنچ سکتی ہو۔ اپنی ماں کے قاتلوں کو کیڑا مار کر تک پہنچا سکتی ہو بلکہ زرا حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

یہ۔ جس طرح افسانہ جاتا۔

"مگر ظہار۔" میں نے ظہار کی بات کاٹ دی "میں بتا تھا کہ باس نے زینت کی وجہ سے مجھے اس سے منع کر دیا تھا۔ افسوس نے کہا تھا کہ تم زینت سے میں وہاں رہ لوں گی مگر۔"

"بے وقت ہو تو تم۔" اس نے میری بات کاٹ دی "جن لوگوں نے زینت کو میاں بھی بھیجا تھا وہ تم سے بھی خوب واقع ہیں اور میرے خیال میں تم پر نگاہ بھی رکھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے نزدیک اس پائی کا انتم مہو ہو اور ان کا خیال ہے کہ لاکٹ جیسی انمول چیز تمھارے پاس ہے اور ان کا یہ خیال بھی ہے۔ تمھارے خیال میں میاں سے گھر جا کر محفوظ ہو جاؤ گی؟ نہیں آرا بیگم بلکہ وہاں جا کر تم ان لوگوں کو بھی پریشانیوں کے انتہائی پیکل میں ڈال دو گی۔ تمھاری وجہ سے اندازاً "اس اور اب بھی اذیت کا شکار ہو جائیں گے۔"

"میں کیا کروں میرے خدا میں نے وہ گھر چھوڑا ہی کیوں تھا۔"

"آپ کو تلاش کرنے کے لیے اپنی ماں کے قاتلوں تک پہنچے اور آپ کو پانے کے لیے۔"

"ظہار نے یہ کہ میرے اعصاب سمجھا دیے۔"

"مگر ظہار میاں تو ظہار ہی ہیں جو میں میں قاتل کی ماں باپ سے بھی ہاتھ جو بیٹھی جھڑپوں سے میں میں قاتل دھوپ اور دھن کے اندر رسواں سے چلتا ہوا تھا۔"

"نہیں آرا۔ یہ بات نہیں بات ہے کہ تم حوصلہ ہار بیٹھی ہو۔ ورنہ تمھارا باپ اگر زندہ ہے تو تم حال میں اس تک پہنچ سکتی ہو۔ اپنی ماں کے قاتلوں کو کیڑا مار کر تک پہنچا سکتی ہو بلکہ زرا حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

ہوئے فون میں فون کر لیتا۔

"مگر ظہار۔" میں نے ظہار کی بات کاٹ دی "میں بتا تھا کہ باس نے زینت کی وجہ سے مجھے اس سے منع کر دیا تھا۔ افسوس نے کہا تھا کہ تم زینت سے میں وہاں رہ لوں گی مگر۔"

"بے وقت ہو تو تم۔" اس نے میری بات کاٹ دی "جن لوگوں نے زینت کو میاں بھی بھیجا تھا وہ تم سے بھی خوب واقع ہیں اور میرے خیال میں تم پر نگاہ بھی رکھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے نزدیک اس پائی کا انتم مہو ہو اور ان کا خیال ہے کہ لاکٹ جیسی انمول چیز تمھارے پاس ہے اور ان کا یہ خیال بھی ہے۔ تمھارے خیال میں میاں سے گھر جا کر محفوظ ہو جاؤ گی؟ نہیں آرا بیگم بلکہ وہاں جا کر تم ان لوگوں کو بھی پریشانیوں کے انتہائی پیکل میں ڈال دو گی۔ تمھاری وجہ سے اندازاً "اس اور اب بھی اذیت کا شکار ہو جائیں گے۔"

"میں کیا کروں میرے خدا میں نے وہ گھر چھوڑا ہی کیوں تھا۔"

"آپ کو تلاش کرنے کے لیے اپنی ماں کے قاتلوں تک پہنچے اور آپ کو پانے کے لیے۔"

"ظہار نے یہ کہ میرے اعصاب سمجھا دیے۔"

"مگر ظہار میاں تو ظہار ہی ہیں جو میں میں قاتل کی ماں باپ سے بھی ہاتھ جو بیٹھی جھڑپوں سے میں میں قاتل دھوپ اور دھن کے اندر رسواں سے چلتا ہوا تھا۔"

"نہیں آرا۔ یہ بات نہیں بات ہے کہ تم حوصلہ ہار بیٹھی ہو۔ ورنہ تمھارا باپ اگر زندہ ہے تو تم حال میں اس تک پہنچ سکتی ہو۔ اپنی ماں کے قاتلوں کو کیڑا مار کر تک پہنچا سکتی ہو بلکہ زرا حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

"میں نے سر اٹھا کر حوصلہ پیدا کر کے یہ بات ہے۔"

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔

ہماری سرزمین میں، جمہوریت کی بڑی بہت کمری ہیں، ہماری کو شش ہے کہ یہ مزید کمری ہو جائیں لیکن زمین کے اندر ہی رہیں۔ ہمیں ہر دے کہ اگر یہ سچا نہیں ہو سکتا تو اسے دھڑو دھڑو کر جائیں گے۔



ایک شخص کا فساد، چاہے ہی عکس سے خوف زدہ تھا
بہ جہ مذاق و زہر ہر سرد و دہن کا زندگی میب ایک باہر مشورہ آتا ہے

عکس

مردوں کو چائے پی رہے تھے کہ رضا چلا آیا۔ ”آداب اٹکل اور آئی۔“ وہ تھوڑا سا جھک کر ادب سے

”آداب بیٹے۔“ ہم دونوں خوش مزاجی سے بولے۔ وہ کچھ لمبے خاموش کھڑا رہا۔

”کاشی اور فری باہر لان میں کھیل رہے ہیں۔“ قیوم بولی۔

”میں جانتا ہوں آئی مگر مجھے اٹکل سے ایک کام ہے۔“ وہ بڑی شجیگی سے بولا۔ اس کی بات پر ہم
وہ مسکرا دیے۔ بھلا ختمے رضا کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے، میں نے سوچا اور پھر سمجھ میں نہیں آیا

الغبت سے اس کا بازو پکڑ کر اپنے قریب کر لیا۔

اور اس کی وردق گرانی کیسے لگے کرے میں
ی کے چلنے کی آواز گونج رہی تھی یا پھر وہاں
تک لگے۔
چند لمحوں بعد ہی ایک آوی چائے کی زالی سے
اس نے سب کو بلایا ہے اور صورت حال کافی ہار
”آپ جانتے ہوں گے کہ تمام اشاف کی ہمارے
کسی اہم موقع پر ہی بلاتا ہوں۔“ پاس نے کہا
شروع کیا۔
”اس وقت میں نے تمام صورت حال تانے
آپ سب کو بلایا ہے اور صورت حال کافی ہار
لندن میں ہمارے آوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اسے
کے بعد کسی نے پولس کو اطلاع کر کے اس کے قتل
پڑا دیا جس سے سارا مال پڑا کیا اس کے علاوہ
سلطان کے ہاتھ ہمارے ایسے راز لگے تھے جہاں
بدولت وہ میں اتنا ہی دولت آمیز موت مار سکتا ہے اور
کاٹے دار کا رہے۔“
میں نے چونک کر طاہر کی طرف دیکھا جس کا
ہونچا تھا۔
”دیکھ میرا

”کاش شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“ میں نے ہمت
کر کے اسے مخاطب کیا۔
وہ بے نیچان ہی ٹھہری رہی جیسے میری آواز ہی نہ
ہو۔ میں چل ہی ہو گئی۔
ذرا دیر بعد ہم مطلبہ منزل پر پہنچ گئے۔ میں لفت سے
اٹکل کر مسروچی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ گل شاید
مخالف سمت کی تھی۔
مسروچی مجھے دیکھنے ہی کھڑے ہو گئے۔
”کیسے منہ؟“ یہ کہہ کر وہ مجھے لے ہوئے باہر آ گئے۔
”ہم آگے چھپے چلے ہوئے ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے
جہاں میں اس سے پہلے بھی نہیں آئی تھی۔ کمرے میں بلی
روشن تھی۔ ایک بہت بڑی میز کے گرد تقریباً پندرہ آدمی
بیٹھے تھے۔ طاہر اور گل بھی وہیں موجود تھے۔ میرے اندر
داخل ہونے کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ سب خاموش
سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ مسروچی نے آگے بڑھ کر ایک کرسی
سرکائی اور میں خاموشی سے اس کرسی پر بیٹھ گئی۔

ماحول بہ حد پر سراسر قہر میں تھا۔ طاہر اور گل، چادروں
طرف ڈالی وہاں موجود لوگوں میں میں صرف گل اور طاہر کو
پہچانتی تھی باقی سب میرے لیے نئے تھے۔
چند منٹ بعد ہی دروازہ کھلا اور باہر اندر داخل ہوئے
سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ پاس کے بیٹھ جانے کے
بعد سب دوبار بیٹھ گئے۔
پاس نے ایک نظرب کو دیکھا اور جب سے پائپ نکال
کر سلگائے گئے۔ اب سب کی نگاہیں پاس پر جمی ہوئی
تھیں۔ پاس نے انٹر کام اٹھایا اور بولے۔ ”مسروچی
چائے بھیج دیں۔“
یہ کہہ کر انھوں نے دائیں جانب رکھا ہوا فائل اٹھایا

”تو“ پاس نے ہاتھ اٹھا کر طاہر کی بات کا ردی
”تیسری بات یہ کہ وہ اہم راز زینت کے
سینو سلطان تک پہنچے اور اس نے زینت کو قتل
راستے سے ہٹا دیا۔ میں نے سن مارا کو یہاں
دعوت اس لیے دی ہے کہ اب ان سے کچھ بچا
ہے۔ دیکھیں اب وہ ہمارے تحریک ہیں ہماری
بھی سینو سلطان کے آدھوں اور شاید پولس کی بھی
میں ہیں۔ مجھے نہیں ہے کہ وہ پولس زینت کے سلسلے
تک جلد بدر ہی پہنچنے کی دلی ہوگی۔ ایسے میں ہر
فوراً یہ ملک چھوڑ دوں میرا خیال ہے کہ میں
منفیوہ اعصاب کی مالک نہیں کہ تشدد برداشت کر
میرا سر کھوٹنے لگے۔ میرا وجود کسی ایسے پتھر سے
نہ تھو جو لوگوں کی ٹھوکوں میں پڑا ہو۔

بجرو کا
آئندہ کارہ

”انکل دراصل اب میں بہت تنگ آگیا ہوں مجھے برداشت نہیں ہوتا۔“ وہ رو دینے کو تھا۔

”اوہ!“ اب میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا قیامتہ وہ کاشی سے ناراض تھا اور شاید اس کے کسی غلط رویہ پر کراہتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اس کا مسئلہ سن کر اسے سلجھانے کی کوشش کی۔

”رضا! دوستوں میں ایسی باتیں تو ہوسکتی ہیں جو دینے تم فکر مت کرو میں کاشی کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”اوہ انکل ایسی کوئی بات نہیں“ کاشی تو میرا بڑا پیارا دوست ہے۔“

”تو پھر فری؟ ارے! یہی وہ بڑی جھگڑالو لڑکی ہے۔ اس کی بات کا برا مت مانا کرو۔“

”انکل آپ سمجھ نہیں رہے نا۔“ وہ میری قیامتہ شناسی سے جو شاید غلط تھی اکتا سا کیا تھا۔

”تو ٹھیک ہے رضا صاحب میں اب بالکل فعل ہو گیا ہوں۔ آپ ہی بتادینے کیا بات ہے؟“ قیامتہ ہاتھ پاؤں پر مسکراتے جاری تھی۔

”اصل میں انکل میں اپنے ڈیڑی سے ت تنگ آگیا تھا۔“

”ارے!“ اب ہم دونوں کے حیران ہونے کی باری تھی

”رضائیں تمہارے ابو سے کبھی ملا تو نہیں مگر کاشی اور فری تمہارے ڈیڑی کی تعریف کرتے ہیں۔“

”وہ تو ب ٹھیک ہے انکل مگر ڈیڑی! امی کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔“ رضائی آواز بھرا کر

”اوہ!“ ہم دونوں کا فوس سا ہوا۔

”انکل وہ مجھ سے تو بہت پیار کرتے ہیں، میرے لیے ڈیڑیوں چیزیں لاتے ہیں اور گھمانے کے لیے جاتے ہیں مگر وہ امی کو ذرا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔“

”رضائے!“ اگر آپ کے ڈیڑی آپ سے پیار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھے باپ ہیں

اچھے باپ عموماً اچھے شوہر بھی ہوتے ہیں۔“ تمہارا رضامیری منطق نہیں سمجھ سکا۔ ”محسوسیت سے“

تکتنے لگاتوں نے کہا۔

”دیکھو رضا میرا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے تمہاری امی بھی اچھی تنگ کرتی ہوں۔“

”اوہ نہیں، کبھی بھی نہیں۔“ وہ جوش جذبات سے سرخ ہو گیا۔ ”میری امی بہت اچھی ہیں، وہ ڈیڑی

کبھی بھی تنگ نہیں کرتیں، ان کے آفس لوٹنے سے پہلے ہر چیز تیار رکھتی ہیں، ڈیڑی کو اپنے کام کے

کبھی بھی امی کو پکارنا نہیں پڑتا۔“

”تو بیٹے پھر میں سمجھ نہیں پا رہا کہ تمہارے ڈیڑی ان سے سخت رویہ کیوں رکھتے ہیں۔“

”انکل وہ امی کو براہے بھی ہیں اور۔۔۔ اور کبھی کبھی کالی گلوچ بھی کرتے ہیں۔“ وہ کہتے کہتے شرمندہ سا ہوا۔ اس کا تمہارا سر جھک گیا۔

”اوہ یہ تو واقعی بہت تکلف وہ بات ہے۔“ قصہ وہاب ہماری گفتگو میں شامل ہو گئی تھی۔

”اور انکل وہ مجھے بھی کہتے ہیں کہ تمہاری ماں اچھی عورت نہیں ہے مگر انکل مجھے امی اچھی لگتی ہیں

ڈیڑی سے ڈر گئے لگا ہے وہ مجھے پیار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میرا

لوٹ دین گئے، مجھے مار دیں گے۔“ اب اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے اس کے سرخ

دھڑکال آنسوؤں کی قطار سے گلیے ہو گئے تھے۔ میرے دل میں اس نغصے سے بچ کے لیے ترم کے

ات لٹ رہے تھے اور قیوہ دپے لفظوں میں اس کے وحشی باپ کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

”بیٹے اب آپ مجھے بتائیں گے کہ میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہوں جبکہ یہ آپ کے ڈیڑی اور

اپنی قطعی ذاتی مسئلہ ہے۔“

”مجھے ایسا کوئی بھی نظر نہیں آیا انکل، میں جیسے یہ سب کہہ سکوں۔ آپ اتنے اچھے ہیں کہ میں نے

یہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے۔ انکل! آپ ڈیڑی کو سمجھاتے ہیں نا۔“

”اوہ ٹھیک ہے رضا، مگر ظاہر ہے تمہارے ڈیڑی میری اس مداخلت کو کبھی بھی پسند نہیں کریں گے۔“

”نہ اس خدشے کا اظہار کیا تو اس کی آنکھوں کے روشن دیے مجھ سے گئے اور اب وہی کا کمر جال اس

مہرے پر تن گیا۔“ قیوہ بہت متاثر سی ہو رہی تھی۔ اس نے ایک نظر باپوس رضا کو دیکھا پھر میرے

اس کو اپنے پاؤں سے ذرا سا چھوا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی نظروں میں رضا کے لیے التجا

وہ کہہ رہی تھی ”چلیں کچھ کچھ کیجیے۔۔۔ میں اپنے آفس میں ایک بار عجب باس ہوں۔ تمام ماتحت

میں خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور کبھی بھی میں نے کسی کو دباؤ قبول نہیں کیا مگر

اب یہ میری کمزوری ہے کہ میں قیوہ کی بات کبھی بھی رد نہیں کر پاتا عبت اور امتداد کی عظیم ڈوری ہمیں

دوسرے کی پابند رکھتی ہے اور اسی لیے قیوہ کی گفتی لگائیں مجھے یکدم اپیل کر گئیں۔“

”ٹھیک ہے رضا بیٹے میں جلد ہی تمہارے گھر آؤں گا۔ یہ سب ایک دم سے ٹھیک نہ ہو سکے گا رفتہ

و میں شاید تمہارے ڈیڑی کا رویہ بدل دوں گا۔ تم جی مدد کرتے رہنا۔“ رضائی آنکھوں کے دیے

اٹھنے اور قیوہ کی منتظر نظر مجھے سرشار لگتی۔

اور انکی صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ رضا آگیا۔

”بیٹے انکل۔“ اس نے آتے ہی میرا بازو تھما مجھے بچوں کو اسکول چھوڑ کر آفس جانا تھا اور اگر

میں اس کے ساتھ چل دیتا تو آفس سے دیوہو جاتی اور یہ میرے معمول کے بالکل خلاف تھا۔

”نگل!“ وہ رازداری سے بولا۔ ”آج صبح سے ہی ڈیڑی کا موڈ سخت خراب ہے اور انھوں نے اچانکا مارا ہے“ امی رو رہی ہیں۔ آپ کے جانے سے شاید ڈیڑی انھیں ڈانٹا بند کر دیں۔“

گو میں اس معاملے کو سمجھانے کا وعدہ تو کر چکا تھا مگر ایسے نازک وقت میں اسے سلجھانا بہت مشکل رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کی سوچ کے بعد میں نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تین بچوں کو گاڑی بٹھا کر میں رضا کے گھر گیا ڈرائیور کو بچوں کو اسکول چھوڑنے کا کہا، میرے وہاں رک جانے پر کافی فری ڈرائے حیران ہوئے مگر میں نے انھیں کچھ کہنے کا موقع دے بغیر ان کے گال چوم کر خدا حافظہ کہا، تیل بجا کر گیس کے اندر داخل ہو گیا۔ رضا کا گھر یقیناً ثروت اور سیٹھ کا حسین عظم رکھ رہا تھا۔ رام طویل مگر بہت صاف ستھری تھی، ارد گرد کے لان شاداب تھے۔ چاروں طرف لان سے گھرا خوبصورت بنگلہ ہمارے معاشرے کی لڑکیوں کا آئیڈل گھر تھا، جہاں وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ ساری زندگی بٹانے کے خواب دیکھتی ہیں، مگر رضا کی امی نے اس بنگلے اور اس امارت سے کیا پایا تھا، ایک سخت اور آئے دن کی ڈانٹ ڈپٹ۔ رام اپاری ختم کرتے کرتے فاصل ڈھن سے جانے کیا کچھ سوچ والا والے دروازے تک پہنچتے پہنچتے میرے ذہن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کاشی اور فری کے باپ کی طرح سے اپنا تعارف کراؤں گا۔ تعارف کے بعد ہم اپنے بچوں کے تعلق سے ہی ایک دوسرے سے بات کرے گی۔ پہلی ہی ملاقات میں پندو صانع کا درس ”زہر قاتل“ بھی بین سلک تھا۔ دروازہ ہلکی سی دستک پر بند گیا۔ ”آئے والا راز قاتل اور حسین خدو خال کا مالک تھا۔ سخت گیری کا پلکا سا عکس اس کے خوبصورتی مٹانے میں ناکامیاب رہا تھا۔ اس نے ایک لمبی میری جانب خاموشی سے دیکھا مگر میں ہاتھ مٹانے کے لیے برہنہ ہوا تو اس کا چہرہ حلقہ تو گیا۔

”فرمایے؟“ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

”ہم یقیناً باہر مل رہے ہیں لہذا آپ کا یہ رویہ بجا ہے۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”اندر آجائیے۔“ وہ راستے سے ہٹ گیا اور میں اندر آیا۔ وہ کامن روم طرز کا کمرہ تھا اور وہاں وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اس بنگلے سے مطابقت رکھتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اب میں اپنا تعارف کرا رہی ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہوا۔

”میں احتیازاً انھن ہوں آپ کے بیٹے کے دوست کاشی اور فری کا باپ۔“

”اوہ“ وہ واقعی خوش ہوا۔ ”وہ دونوں بچے کیوں ہیں ماشاء اللہ۔“

”اور رضا بھی۔“ میں نے بات مکمل کی ”ہم اس وقت اپنے بچوں کے والد کے تعارف سے مل رہے ہیں۔“ ہم دونوں ہی ہنس دیے۔

”میرے پہلے میں آپ کے لیے چائے منگا لوں۔“ اور میرے انکار کے باوجود وہ آواز دے پکے تھے۔ دلی دیر بعد کاشی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی میرے سامنے آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ڈراسی ”آداب!“ لیوں کی جنبش سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے یہی کہا ہوگا۔ ”یہ میری بیگم ہیں!“

”اوہ۔“ مجھے واقعی حیرت ہوئی تھی وہ بہت کسن اور معصوم سی لڑکی تھی۔ حزن و ملال نے اس کے چہرے پر عجیب ملائمٹ سی پیدا کر دی تھی۔

”اور بیگم یہ کاشی اور فری کے ڈیڑی ہیں؟“ ایتنا زانہ۔

”میرا ڈرائیور بچوں کو اسکول پہنچانے گیا ہے۔ رضا اکثر خدا کرتا تھا کہ آپ ہمارے گھر چلیں۔ آج صبح فارغ تھا سوچا آج آپ لوگوں سے ملاقات کر لی جائے۔ دراصل میں اپنے بچوں سے بہت پیار کرتا مگر میری ملازمت ایسی ہے کہ میں ان کی تعلیم اور تربیت پر زیادہ توجہ اور وقت نہیں دے سکتا۔ جبکہ اگر ملازمت میں مل کر رہتا ہوں تو تعلیم اور تربیت پر توجہ دے سکتا۔“

”مگر مل کر رہنا تو تعلیم ہی نہیں، اسکول میں ہونے والی دیگر سرگرمیوں پر بھی۔“ وہ بول اٹھی۔

”میں ہاں بالکل۔“ میں نے تاکید کی۔ بظاہر دونوں کے چہرے خوش و خرم تھے۔ صبح سویرے ہونے والی ملاقات سناٹان بھی ان کے چہرے پر نہ تھا مگر ایک چیز رضا کی خبر کی تاکید کر رہی تھی وہ رضا کی امی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی اس عمر کی لڑکیاں سیاسی نفرت لے ہوتی ہیں مگر وہ شہید کی کا مجسمہ بنی ہوئی

رضا کے ڈیڑی نے بھی اس امر میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا، وہ بھی اپنے دن بدن بڑھتے کاروبار کی وجہ اپنے بچے کی تعلیمی سرگرمیوں سے غافل ہو رہے تھے اور خوش تھے کہ اب ہم مل جل کر اپنے اول کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیں گے۔ باتوں ہی باتوں میں وقت خاصا گزر گیا، میری گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو چنک گیا، دفتر سے دیر ہو جانے کا خیال جو ذہن سے تقریباً محو ہو چکا تھا دوبارہ جاگ گیا۔

”ابا اب میں چلوں ضیا صاحبہ۔“ میں نے اجازت طلب کی۔

”گو میرا اجازت دینے کو جی نہیں چاہتا مگر ہر حال یہ آپ کی مجبوری ہے اور آپ کو جانا ہے۔“
 ہم اس شرط پر جدا ہو رہے ہیں کہ جلد پھر ملیں گے۔“
 ”جی ہاں، فیاض صاحب! غالباً“ نہیں یقیناً۔“

ہم انجے ہی باہر نکلے تھے مگر مرفیضیا کا من روم سے ہی کسی اور کمرے میں چل دیں اور رضا کے
 مجھے باہر تک چھوڑنے آئے۔ ایک بار پھر خدا حافظ کا سلسلہ چلا اور میں چلا آیا۔

☆☆☆☆☆☆

”ڈیڈی سے بات ہوئی تھی انکل؟“ رضا تو شاید میرے آفس سے واپسی کا شدید انتظار کر رہا تھا۔
 آمد سے پہلے یہ وہ گویا آج کی ملاقات کے نتیجے سے آگاہ ہونے کے لیے میرے گھر آیا تھا اور میری کار
 کی آواز سنتے ہی میرے بچوں سے پہلے ہی پوچھ میں آیا تھا۔ میں آفس کی مصروفیت میں اس کے
 سے ملاقات کا واقعہ تقریباً بھول چکا تھا۔ رضا کا جوش جذبات سے سرخ چہرہ دیکھ کر سب یاد آیا۔
 ”صبر میرے بچے صبر۔“ میں نے مذاق سے کہا تو وہ شرمندہ سا ہو کر ہنس دیا میری آواز پر قہقہہ لگایا
 آئی تھی۔ مجھے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور گویا میری سارے دن کی تھکان ہوا ہو
 ”آگئے آپ۔“ وہ عادتاً بولی۔

”جی نہیں۔“ میں بھی عادتاً ہی بولا اور ہم دونوں ہنس دیے۔ رضا نے ہمارے چہرے دیکھ کر
 گیا۔

”میرے ڈیڈی کے آفس سے آنے کا وقت ہوتا ہے تو امی بہت پریشان ہو جاتی ہیں اور ادا لیں
 کہیں میرے ڈیڈی کسی بات پر غما ہو کر ڈانٹ ڈپٹ نہ شروع کریں۔“

ہمارے بچتے چہرے تاریک ہو گئے۔ کاشی اور فری مجھ سے پیار وصول کرنے کے بعد ہم
 مصروف ہو گئے۔ قیصر نے میرا بریف کیس تمام لیا اور میرے ساتھ چلتی اندر آئی۔ عورت کا
 نازک ہوتا ہے۔ رضا کی بات نے قیصر کو سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ خاموش سی تھی اور میں جو اس
 جلدی براہ راست منسلک ہونے والا تھا دلچسپا ہوا سا تھا۔ قیصر ہنسی کی قیافہ شناس عورت تھی اور
 میرے بارے میں تو وہ مجھ سے زیادہ جانتی تھی۔ میرے چہرے پر پھیلی ہوئی بے رونق سی اس نے
 لی۔ جیسے ہی کمرے میں آکر میں کرسی پر بیٹھا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ
 میرے چہرے پر ذرا سا مہلکی اور لاڈ سے بولی۔

”آج آفس میں بالکل بھی تھکان نہیں ہوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ہوئی۔“ میں اس بات کے لیے

ہاں کر ہنس دیا۔ اصل میں، میں نے ہی قیصر سے کہہ رکھا تھا کہ میرے آفس سے آنے کے بعد بچوں
 کہ وہ بعد ہاتھ کر میرے سامنے تنہا آیا کرو تاکہ میں آفس کی ساری تھکان اور ناخوشگوار باتیں بھول
 اں وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنے قریب کر

☆

”میں کل بچوں کے اسکول گیا تھا۔۔۔۔۔ میں کہہ رہا تھا۔

”وہ بہت اچھا کیا حسن، ورنہ میں تو ان دونوں مصروفیات میں ایسا بھنسا کہ بالکل بھی وقت نہ نکال
 ”فیاض نے متون نظروں سے مجھے دیکھا۔

”فیاض بھائی! بچے ہماری توقع سے زیادہ ذہین ہیں اور کاشی سے ان کے سب استاد خوش ہیں اور آپ کا
 نامی ماشاء اللہ کلاس کے نمایاں بچوں میں ہے مگر اس کے بارے میں نیچر کو ایک مشترکہ شکایت
 ہے۔“

میں نے ارادے کے مطابق بات کو ذرا سا ڈرامائی رخ دیا اور میری توقع کے عین مطابق فیاض میری
 بات سننے لگا اور ذرا دور بیٹھی لا تعلق سی مرفیضیا بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔

”فیاض بھائی! یہ شکایت اس کی تعلیمی یا دیگر سرگرمیوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ مجھے تو یہ خالص نفسیاتی
 مسئلہ لگتا ہے۔“ میں جان بوجھ کربات کو طول دے رہا تھا اور وہ دونوں حقیقت جاننے کے لیے بے چین
 رہ رہے تھے۔

”اصل میں مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ اس کی کلاس نیچر کے کتنے کے مطابق وہ عدم تحفظ کا شکار پچھ
 کلاس میں سما ہوا سا رہتا ہے اور براہ راست کسی سے بھی کھل کربات نہیں کرتا۔ گوا سے سبق یاد
 ہے مگر کسی کسی روز وہ اس قدر زرد اور ڈرا ہوا لگتا ہے کہ ایک لفظ اس کی زبان سے ادا نہیں
 آتا۔“ میں نے کسی کسی روز پر خاص زور دیا اور یہ بات میں جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کی کلاس نیچر
 بہت بات مجھ سے واقعی کہی تھی۔ ان کے چہرے پر حتی سنجیدگی کی چادر تکلیف دہ حد تک دبیز ہو گئی تھی
 دیا کہ اسے بچے پر سلوٹس ابھر آئیں۔

مرفیضیا کی کلاس نیچر مس روز کا رہی تھیں کہ آپ اس کے انکل ہیں اس کے گھر پلو حالات سے
 کہ ہوں گے کیا اس کے مئی ڈیڈی کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں جو یہ پچھ اس قدر خوفزدہ سا رہتا
 میں نے اس کی بات کو بھٹکا کر جواب دیا کہ مس روز آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ رضا کا گھر محبت

اور امن کا گوارا ہے۔“

میں اپنی توقع سے بھی بڑھ کر کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا تیر تھا جو اگر نشانے پر لگ جاتا تو اس کی شکایت رفع ہو سکتی تھی اور میرا مشن بھی کامیاب ہو جاتا۔ میں نے پہلا جھلکا ہی اتنا زوردار دیا تھا اس کے اثرات دونوں کے چروں پر نمایاں نظر آنے لگے۔ ضیا کچھ دیر خاموش رہا پھر نارمل ہو کر کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”حسن بھائی میری زندگی کا واحد مقصد ہی یہ ہے کہ رضا ایک کامیاب ترین آدمی بنے اور میرا حال ہے کہ میں نے اپنی دانست میں کوئی غلطی نہیں کی۔“

”میں یہ جانتا ہوں ضیا، مگر جب تمام ٹچرز نے ایک ہی بات کی تو مجھے ایسا سوچنے پر مجبور ہو جانا تھا۔ خاص طور پر رضا کا بی بی ماسٹراس سلسلے میں خاصا پریشان تھا، وہ کہنے لگا کہ میں جب بچوں کو بی بی ماسٹراس کے step لیتا ہوں تو ہاتھ اٹھاتے ہی رضا خوفزدہ ہو کر رنج اٹھتا ہے۔“ مجھے مت ماریے۔ ”میں اس چرب زبانی کے اثرات دیکھنے کے لیے خاموش ہو گیا۔ مسز ضیا رو دینے کو تھیں اور ضیا جو نارمل ہو کر کوشش میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا اب پھر اس کے چہرے پر پریشانی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اب ان دونوں کو تھا چھوڑ دینا تھا اس لیے اٹھ آیا۔ وہ دونوں ذہنی طور پر اتار پریشان تھے کہ ان کی طرح رکنے پر اصرار ہی نہیں کیا۔ مگر اگر میں نے سرور لیے میں قیصر کو بتایا۔“ قیصر جان میں نے بہت تاک کر مارا ہے۔ ضیا بہت برا شوہر سی مگر وہ بہترین باپ بننا چاہتا ہے اور ہو سکتا ہے اہم کام ثابت ہونے کے لیے اسے اچھا ترین حیات ہی بننا پڑے۔“

☆☆☆

کئی روز گزر گئے اور رضا نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہم دونوں نے یہ لیا کہ اس کے گھر میں بی سگون تھا ورنہ گھر میں ہونے والی کسی بھی بدمرگ پر وہ میدھا میرے پاس دوڑ کر آتا تھا۔ ایک روز میں سے کہنے لگا کہ ہمیں خود ہی رضا کے گھر جانا چاہیے۔ قیصر ابھی تک ان لوگوں سے نہیں ملتی تھی وہ اس ہو گئی مگر جب ہم رضا کے یہاں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ قیصر کی آہا کا فون آیا۔ وہ کہہ گئی تھیں اور قیصر کو اپنے ساتھ لیڈی ڈانکڑ کے ہاں لے جانا چاہ رہی تھیں۔

”حسن، میرا آپا کے گھر جانا زیادہ ضروری ہے، مگر تمہارا پروگرام۔۔۔“

”اے تم اس کی پروا نہ کرو مجھے رضا کے گھر چھوڑنی ہی تھی تم آپا کے گھر چلی جاؤ۔ واپسی پر مجھے

غزل

تھے آسمان میں کبوتر یہاں وہاں یہ بولتا بدن کہیں پتھر کا ہو نہ جائے
پڑے ہیں اب وہ زین پر یہاں وہاں دیکھا کو نہ راہ میں سڑ کر یہاں وہاں
بڑا سنا ہے باہر یہاں وہاں کشمیر تا دکن ہے مسلط ہوا کا خوف
انفلتکس و ریخت ہے اندر یہاں وہاں اک آگ سی لگی ہے برابر یہاں وہاں
اثر رقبوں کا بدن پر نہیں رہا ہے زندگی کہ ڈار سے پھڑپھڑا ہوا ہرن
کہتے ہو اب اسے چھو کر یہاں وہاں رہ رہ کے دیکھتا ہے بدک کر یہاں وہاں
ہوا میں آنے کا دامن چراغ بے چرگی سے اپنی پریشاں ہو کس لیے
ہزار بار الجھ کر یہاں وہاں آہٹیں ہیں تمام مکدر یہاں وہاں
نہیں وقت کی صورت نکل پڑا کوئی تو پھل بھی تو گرے گا رونق خیر
پڑے ہیں خواب بہتر یہاں وہاں بیڑوں پہ مارتے رہو پتھر یہاں وہاں
ہے ساتھ ساتھ کوئی ہاتھ تمام کر رہے نہیں ہیں ہم بھی ٹھوکر یہاں وہاں
روٹ خیر

”میں نے خوش دلی سے کہا۔

اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا۔ ڈرائیور اس روز چھٹی پر تھا۔ قیصر نے مجھے رضا کے گھر کے گیٹ پر اتارا اور پارے ہاتھ ہلاتی ہوئی چل دی۔ میں پچھلے دنوں ان سے دو تین بار مل چکا تھا، اس لیے مجھے ہنگامے میں ہونے کسی قسم کی جھجکا احساس نہیں ہوا مگر کامن روم کے نظارے نے مجھے ایک دم حیران سا کر دیا۔ وہاں ایک انجینیئرس اور بولڈال بندھا پڑا تھا۔ ضیا قریب ہی خاموش کھڑا تھا۔ کمرے کی فضا لڑی اکٹری سی لگ رہی تھی۔

”آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں کیا؟“ میں نے بظاہر عام سے لیے میں پوچھا۔

”میں نہیں صرف لیو۔“ ضیا کی آواز کڑخت اور خشک تھی۔ اپنی بیوی کے معاملے سے قطع نظر، ضیا خوش اخلاق اور بذلہ سنے آدمی ہے مگر اس روز میرے ساتھ گفتگو بھی بہت خشک لگنے میں کر رہا تھا۔ اور وہ مجھے نالے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لیو ہمارے پاس آئی۔ وہ ہمیشہ ہی کی طرح تھی، اصرار اور دلکش، مجھے آواب کہہ کر وہ پھر کچھ نہیں بولی، بس خاموشی سے صوفے پر بیٹھی خلا میں سکتی

رہی، میرا دل جذبہ رحم سے بھر گیا۔

”رضا کہاں ہے؟“ میں براہ راست میرے بیٹے سے مخاطب تھا۔ ”وہ اندر سو رہا ہے۔“ اس نے دہرایا۔
آواز میں جواب دیا۔

”کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں جا رہا؟“ میں نے پوچھا۔

جواب میں بیٹہ نے دھیرے سے پلکیں جھکا لیں۔ چہرے پر المتہ کرب کے آثار دیکھ کر میں سمجھا کہ
رضا اپنے باپ کے پاس رہے گا۔

”تو گویا فیصلہ ہو ہی گیا۔“ میرا دل انجانے میں دکھی سا ہو گیا۔

”آپ جانتے ہیں حسن صاحب کہ میں رضا سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں ہو سکتا اور اس کی
غیر معینہ مدت کے لیے سیکے لوٹ رہی ہیں۔“ فیا کا لہجہ بظاہر نارمل ہی تھا مگر اس کے انداز میں چٹانوں کی
سی سختی تھی۔

”اور فیا آپ حیران ہوں گے کہ میں بچوں سے غیر معینہ مدت کے لیے دور رہ سکتا ہوں مگر قصور
بیوی کی ایک دن تو کیا، چند گھنٹوں کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ میں نے یہ بات اس ماحول
خوشگوار بنانے کے ارادے سے کہی تھی مگر فیا کی پیشانی کی لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں اور بیٹہ
پھوٹ پڑی۔

”حسن صاحب آپ کی بیوی بہت اعلیٰ کردار کی مالک ہوں گی مگر میں تو بدکردار عورت ہوں
چاہنے اور پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ بیٹہ جو کبھی بلند آواز سے بات کرنا نہ جانتی تھی پچ پچاتی تھی۔ فیا نے چونک کر اسے دیکھا،
پہلی بار اس روپ میں دیکھ رہا ہو، واقعی وہ نئی بیٹہ تھی حالات کی تسطر۔ نہیں میں جہنم لینے والی ہالی
اس کی آنکھوں سے اب آنسو رواں ہو گئے تھے۔ آواز بھرانے لگی تھی۔

”حسن صاحب میں نے اپنے شوہر کے بہت طعنے سے بہت مار کھائی ہے مگر میں ہوش غافل
رہی، مجھے خوف تھا کہ کہیں میرے ٹکڑے کے جواب میں میرا گھر، میرا بچہ، مجھ سے جہنم نہ جائے گا
مجھے کوئی ڈر نہیں رہا۔ میری بیش بہی کو شش روی کی میری زبان کل کر میری لیے مشکل پیدا نہ کرے
اب میں کسی مشکل سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ حالات اس سے زیادہ اور کیا بگڑیں گے، میرے
طبیعتی سے سنگین کیا کوئی اور بھی واقعہ ہو سکتا ہے۔ جب مجھے جانا ہی ہے تو دنیا سے انصاف
ماگوں۔ حسن صاحب بے میرا تصور یہ تھا کہ میں شریک، روبرو دنیاؤں کی طرح اپنے بچپن کے

میں بیا بیٹھی تھی۔ ہماری خشکری کی مانگ تھی اور میرا مختصر سیل میرا بچا زاد بھی تھا۔ ہم ایک
میں رہتے تھے۔ ”وہ جیسے خواب میں بول رہی تھی میں خاموشی سے اس کا منہ تک رہا تھا اور فیا کے
ہر کھنکھناتی بدستور تھی۔ وہ بھی غالباً اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا شہر تھا سی لیے وہ بیٹہ کی پوری
میں سناؤنا چاہ رہا تھا۔

انہی ہی سے ہمارے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ ہم آئندہ زندگی میں شریک حیات ہوں
ایک گھر میں رہ کر بدوہ کرنا ممکن نہ تھا آہستہ آہستہ ہماری جھجک دور ہوتی گئی اور ہم ایک دوسرے
تکلیف سے ملنے لگے۔ سیل تو مجھے اپنی ملکیت ہی تصور کرنے لگا۔ اس کے کپڑے میں استری کیا
وہ رات کو دیر سے آتا تو میں اس کے لیے جاگا کرتی، اسے کھانا بھی دیتی۔ ہم انسان تھے فرشتہ نہیں
ہے جھجک ملاقات میں کئی جذباتی لمحات بھی آئے مگر ہماری محبت میں تقدس قائم رہا اور پھر میری بد
کہ ایک روز سیل بیمار پڑ گیا۔ میں نے خدا کے حضور رو کر التجا کی مگر وہ بچ نہ سکا۔ ”بیٹہ کی آواز
تھی۔ اور آنسو پھر پلکوں کا بند توڑ کر بہ نکل۔“ سیل کی موت کے بعد مجھے سنبھلنے سنبھلنے سال لگ
اور پھر میری شادی فیا سے ہو گئی اور میری بد قسمتی کے یہاں بھی میرا بیچنا نہ چھوڑا۔ ہماری محبت کی
معاذ ان والے سب جانتے تھے، فیا کو بھی معلوم ہو گئی۔ انھوں نے میرے زخمی دل کو دلاسا دینے کی
میرے دل کو بچو کے لگانے شروع کر دیے۔ میں نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ میں گزری
ہدایت کی دھول مٹاؤں مگر رضا کی پیدائش کے باوجود یہ تہہ دبیز ہی ہوتی گئی اور آج سب ختم ہو گیا
دہتی ہوں کہ انتاعصرہ میں اس زندان میں کیسے رہ گئی۔ آج میری آزادی کا دن ہے۔“ وہ کہہ جا رہی
کہ یکدم آنسو پونچھتے ہوئے ہنس دی۔

صاحب آپ مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑ آئیں گے یا حسن بھائی سے کہیں۔“
اور ایئر پورٹ جس پر چھوڑ آئے گا۔ فیا ابھی تک ویسا ہی تھا۔

خاموشی سے باہر جانے لگی۔

میرا سامان؟“ فیا نے پکار کر کہا۔

”کچھ نہیں چاہیے۔“ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا شاید وہ رو رہی تھی اس کی آواز اشکوں سے
وہ پہلی گئی اور میں سناٹ کھڑا تھا۔

”بھائی! اگر کمائی ایسی ہے جسے بھائی نے سنا ہے تو اس میں کوئی بھی قابل اعتراض بات نہیں
کے لیے ایک معصوم لڑکی کی ساری زندگی اجیرن کر دی جائے۔“

رنگین اور حسین منفرد اور بہترین

کراچی

شوہزنس

میلیشن فلم ریڈیو اسٹیج اور فیشن سے متعلق دلچسپ اور تازہ ترین مضامین

گیمز

نیا نکھار

نیاروپ

نیا انداز

شوہزنس کی
چمک دمک

رنگوں کی شگ

نئی بہار

ہر دل عزیز فن کاروں کے انشردیو اور ان کی جاذبہ نظر رنگین تصاویر

ایک سے ایک انوکھی اور دل موہ لینے والی تحریک

حقائق پر مبنی بے لاک تجزیہ اور تبصرے

شوہزنس کے مرکز کا احوال ہر مضمون معلوماتی اور بے مثال

درون خانہ جہنم لینے والی کسانوں کی جھلکیاں

طبعیت کتکتا پٹ جھٹ آپ اور لے آؤٹ کا اعلاقی تر معاہدہ

رنگارنگ اور دلچسپ سببوں سے بھرپور پیرچر

شعبہ ۱۸/۴ روپے

لہذا لاہور میں شام ۷ بجے تک بذریعہ ڈاک ۲۸۸ روپے

پیشہ کار شوہزنس ۱۰۸ - آدم آکر کی شہریت روڈ - کراچی

”حسن میں ایسی عورت سے کبھی بھی نباہ کے لیے تیار نہ ہو سکا جو مجھ سے پہلے کسی کو اپنی سالانہ اپنے من میں بسا چکی ہو میں نے خود کو بہت دفعہ سمجھایا کہ وہ بے قصور ہے مگر میرا دل کبھی مطمئن ہوا اور یقیناً میری اس جھنجھلاہٹ نے انتقام کی صورت اختیار کر لی اور میں یہ انتقام اسے مار کر تباہ کرتا۔ یہ حالات میرے بیٹے کے لیے قابل قبول نہ تھے لہذا میں نے سوچا کہ وہ عورت جو اس سکون کی دشمن ہے اسے یہاں سے ہٹا دیتا ہی بہتر ہے۔“ نیا ایک سانس میں سب گم کیا۔
اودھ گویا میری اس حکمت عملی کا اتنا غلط مطلب لیا گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو قصور وار محسوس کر رہا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب تو کمانی ہی ختم ہو گئی نیا بھائی، مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مرد اور عورت کی زندگی میں جذباتی دور ایسا ضرور آتا ہے کہ وہ اپنی زلیلت میں داخل ہونے والے پہلے پیار پر اپنا تن من بھروسہ کرتے ہیں۔ اب یہ حالات پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ شخص زندگی بھر کے لیے اس کا بن سکے یا نہیں۔ بات کے لیے تمام عمر دشنام طرازیوں انسانی فطرت کی توہین ہے۔ میری اپنی بیوی قیسرو کو کھانے لڑکے سے پیار تھا مگر وہ اب میری ہے اور مجھے اس کے پیار پر پورا اعتماد ہے۔“ میں تیزی سے اس میں جانا تھا میں اگر چند لمحوں اور رک گیا تو ضبط کے تمام بندھن دھڑا دھڑوٹ جائیں گے اور میں اس سنگدل کی وجہ سے اس پر ہاتھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ میں باہر آیا ہی تھا کہ قیسرو بھی گاڑی چلائی قریب آئی۔ ”حسن! پاپا تو میرا انتظار کر کے چلی گئی تھیں۔ ارے تمہیں کیا ہوا؟“ وہ ایک دم پریشان سی ہو گئی۔ ”کیا ہوا مجھے؟“

”تمہیں میں شراپور ہو اور اور پلیز حسن تم جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“ وہ باہر نکل آئی۔ ”چشمہ؟“

”وہ اندر ہی رہ گیا مگر اب میں نیا کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔“
”تم حسن نہیں بیٹھ جاؤ میں لے آتی ہوں۔“ مجھے گاڑی میں بٹھا کر وہ تیزی سے اندر چل دی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ آہٹھی گئی وہ ہراساں سی نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں راستے بھر خاموش رہے۔ آکر وہ مجھے اپنے ساتھ لیے کرے میں آگئی اور آرام کرسی پر بٹھا کر بڑے ہی پیار سے پوچھا۔ ”اب بات تمہیں حسن؟“

”قیسرو اصل میں نیا نے اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لیے میکے بھجوا دیا اور رضا کو اس سے چھین لیا۔“
”لے جس میں درودی درو تھا۔“

”تو کیا وہی رضا کا باپ تھا جو ان کے کامن روم میں خاموش بیٹھا تھا۔“

”ہاں“ میں نے کہا۔

”گر وہ رضا کا باپ ہی تھا تو وہ اپنی بیوی کو لینے ضرور جائے گا۔“ وہ مسکرا دی۔

”یہ کیا پتلا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور جان لیا ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں اور تم مجھے بہت پاہو۔“

”قیصرو میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔“ میں واقعی حیران سا تھا۔

”حسن میں اپنے ماضی سے ہراساں نہیں ہوں گر وہ یقیناً اپنے ماضی سے خوف زدہ ہے، جیسا کہ میں بھی ہوں۔“

ماضی برداشت نہیں کر سکا۔ حسن یہ وہی لڑکا ہے جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ فوراً

میں ہم دونوں ایک کالج میں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے میں دلچسپی بھی لیتے تھے۔ پھر میری تمہاری

ہو گئی اور ضیا چند برس انتظار کرنے کے بعد گھر رہا بیٹھا اور پھر وہ مجھے نہیں ملا۔ میری زندگی اتنی مکمل

کہ کسی بھی لمحے مجھے اس کا خیال نہیں آیا اور میں نے آج اسے دیکھا، اپنا تعارف کرایا اور پہلی بار

حسن تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے گر میری ایک جھلک رضا کی امی کی تقدیر بدل دے گی۔ میری

میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا ہوگا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ انکشاف میرے لیے تکلیف دہ نہیں تو چونکا دینے والا ضرور تھا۔ میں حقیقتاً

آوی ہوں۔ زندگی کو اس کی کمزوریوں سمیت پیار کرتا ہوں۔ شادی کے پہلے ہی دن مجھے قیصر نے

بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور میں نے ڈرتی کائناتی قیصر کو اپنی باتوں میں لے کر کہا تھا۔ ”تو

اٹ۔“ اور پھر میرے پیار سے اس کا خوف دھل گیا تھا۔

”آؤ رضا کا پتا کریں، جانے وہ کس حال میں ہے۔“ میں نے کہا اور وہ رضا کے گھر کا نمبر ڈال

گئی۔ چند منٹ گفتگو کر کے وہ میری طرف چلی۔

”رضا گھر پر نہیں ہے۔ وہ اپنے ابو کے ساتھ ایئر پورٹ گیا ہے“ غالباً اپنی امی کو واپس لائے

لیے۔ ”اس کا بھر سرت اور فتح سے بھر پور تھا۔

اور ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔

”تو کیا وہی رضا کا باپ تھا جو ان کے کامن روم میں خاموش بیٹھا تھا۔“

”ہاں“ میں نے کہا۔

”گر وہ رضا کا باپ ہی تھا تو وہ اپنی بیوی کو لینے ضرور جائے گا۔“ وہ مسکرا دی۔

”یہ کیا پتلا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور جان لیا ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں اور تم مجھے بہت پاہو۔“

”قیصرو میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔“ میں واقعی حیران سا تھا۔

”حسن میں اپنے ماضی سے ہراساں نہیں ہوں گر وہ یقیناً اپنے ماضی سے خوف زدہ ہے، جیسا کہ میں بھی ہوں۔“

ماضی برداشت نہیں کر سکا۔ حسن یہ وہی لڑکا ہے جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ فوراً

میں ہم دونوں ایک کالج میں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے میں دلچسپی بھی لیتے تھے۔ پھر میری تمہاری

ہو گئی اور ضیا چند برس انتظار کرنے کے بعد گھر رہا بیٹھا اور پھر وہ مجھے نہیں ملا۔ میری زندگی اتنی مکمل

کہ کسی بھی لمحے مجھے اس کا خیال نہیں آیا اور میں نے آج اسے دیکھا، اپنا تعارف کرایا اور پہلی بار

حسن تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے گر میری ایک جھلک رضا کی امی کی تقدیر بدل دے گی۔ میری

میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا ہوگا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ انکشاف میرے لیے تکلیف دہ نہیں تو چونکا دینے والا ضرور تھا۔ میں حقیقتاً

آوی ہوں۔ زندگی کو اس کی کمزوریوں سمیت پیار کرتا ہوں۔ شادی کے پہلے ہی دن مجھے قیصر نے

بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور میں نے ڈرتی کائناتی قیصر کو اپنی باتوں میں لے کر کہا تھا۔ ”تو

اٹ۔“ اور پھر میرے پیار سے اس کا خوف دھل گیا تھا۔

”آؤ رضا کا پتا کریں، جانے وہ کس حال میں ہے۔“ میں نے کہا اور وہ رضا کے گھر کا نمبر ڈال

گئی۔ چند منٹ گفتگو کر کے وہ میری طرف چلی۔

”رضا گھر پر نہیں ہے۔ وہ اپنے ابو کے ساتھ ایئر پورٹ گیا ہے“ غالباً اپنی امی کو واپس لائے

لیے۔ ”اس کا بھر سرت اور فتح سے بھر پور تھا۔

اور ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔



جیسے کسی غیبی طاقت نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چاچا لاشی لیتا اٹھ کھڑا ہوا اور لاشی تمام کرکلی میں ٹھہرے پانی میں سے شراب کی آواز کے ساتھ گزر کر چلی گئی! اس کے محفل میں ناپین پیدا ہو گیا۔

جنت اس گاؤں کی باغی اور انزہیاری تھی! جس کو دیکھ کر جو ان مزید جوان اور بوڑھے جو ان کو شش میں الٹی سیدی مرتیں کرنے لگتے تھے اور تو اور چودھری حاکم خان کے چہرے پر ہنسی اور اسے دیکھ کر پل بھر میں نرم مسکراہٹ میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی اور وہ ہنسی ہوئی مومچیں اہلک کے پردوں کی مانند پھڑکنے لگتیں! چودھری حاکم خان کی زندگی گزشتہ پینچا سال پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کئی مہینوں کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ سارے گاؤں کا کرنا دھرا تھا۔ اس سے جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائی تھی! طبیعت میں اُمریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی! چلانا جانتا تھا اور اس کے حکم کو تسلیم کرنا بہت سی کے فرض تھا۔ اب تو ذہنی عمر کے ساتھ دم ختم ہو رہا تھا۔ جب تک جو ان رہا عزتوں سے کھیلتا اس نے اپنا مسئلہ بنائے رکھا۔ وہ حاکم خان حاکو بنا اور گاؤں میں اس کے معاشقوں کی داستان ہر گھر میں سنائی دینے لگی مگر بچائیت اور چہال بازی کی پگ کا شہد اوچا بن رہا۔ دولت گناہوں کو خریدتی رہی اور حاکم خان وقت کے پستے دھارے ساتھ پیش میں مگن رہا لیکن اب وقت دوبارہ جیسے ٹھہر گیا تھا۔ حاکم خان کی جوانی قصہ پارسی تھی۔ وہ بوڑھا ہو چلا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا جو ان ہو گیا تھا، مگر وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ "شیطان میں ولی" اس کا جو ان بیٹا قاسم اس قول پر پورا اترتا تھا۔ وہ شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کبھار چھٹیوں میں گاؤں آیا کرتا۔ وہ شریف لڑکا تھا مگر اس کی رنگ شرارت بھی کبھار ہو جاتی لڑکیوں کو پانی بھرتے ہوئے دیکھتا رہتا اور کبھی کبھار جنت کی گاگر اس کی غلیل کا نشانہ بنتی۔ مگر خواب دیکھنے والی جنت کو اس کی یہ حرکت کبھی ناگوار نہ گزری تھی، بلکہ سیلیوں کے سامنے اس کا اعتبار کرتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی رہتی! دوسری طرف چودھری حاکم خان جنت کو دیکھ کر اپنے آپ میں اٹھتی ہوئی جوانی کی لہروں کا مدو جزو محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ خود بھی جاننے سے قاصر تھا۔ جنت کو دیکھتے ہی ماضی کا رنگین دور اس کی آنکھوں کے سامنے اُڑا لے تا تب وہ لکڑی کے فریم میں جڑے ہوئے شیشے کے سامنے اپنا چہرہ دیکھ کر سوچتا! "بھئی! ابے تے میں آں۔" وہ بار بار مومچوں کو بل دیتا۔ جنت کی جوانی نے اس کی عمر رفتہ کو آواز دے دی تھی۔ بہت سی اس سادہ سی دنیا کا روبرو قدرت کے اصول کے مطابق چل رہا تھا۔ چودھری حاکم خان

لہجہ گھوڑے پر سوار جب مہینوں کا چکر لگانے لگا تو غریب کشکاروں کی ساری ہستی احترام میں جکڑ آئی۔ ایک دوپہر وہ بڑی شان سے اونچا شعلہ کی گھوڑے پر سوار برابر والے قصبے کی بھری سے ایک لہجہ جیت کر واپس آ رہا تھا! اس قافلے میں مصاحبوں کی خاصی تعداد تھی جو اس کی شان میں قہقہہ کوئی کرتے جا رہے تھے! گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ سب کے سب بکھر گئے۔ چپکتی دھوپ میں گندم کے خوشے ہلکے رہے تھے۔ حاکم خان کی چپکتی نظریں ایک جگہ پر جا کر رک گئیں۔ یہاں جنت کا سر پہ نظر آ رہا تھا! اولیٰ ہوا کے سنگ سنگ چلتی ہوئی وہ گندم کے لہجائے خوش میں گم ہو گئی! اور گندم کی مایاں دور تک لپٹی چلی گئیں۔ حاکم خان رک گیا۔ پل بھر میں وہ دوبارہ ابھری! پلنگہ عزیٰ پر چلے ہوئے اس نے جھٹکا دے کر چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور کسی ذی روح کی آمد سے بے خبر چلنے لگی۔ حاکم خان دم بخورہ گیا۔ میرے میں سیندرگھلی رنگت اور کانوں میں جھولتے بڑے بڑے بالے جیسے حاکم خان کا دل نکال کر لے گئے۔ "جنت!" وہ بے اختیار پکارا اٹھا۔

جنت حیران سی واپس چلی اور سامنے چودھری کیا کر اس نے تھوک نچتے ہوئے اپنی حالت پر قابو پایا۔ "تو اس سنسان دوپہر میں یہاں کیا کر رہی ہے؟" حاکم خان نے لہجہ بدل لیا۔ "چاچا کو دیکھنے آئی تھی۔" جنت نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "اس طرح اکیلی مت پھرا کر۔" کس کو پانی نہ ہو جائے۔" حاکم خان نے بلا وجہ اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "تو فکر نہ کر چودھری۔" وہ سینہ تان کر بولی۔ "جنت کے متعلق بات کرنے والا کوئی مائی کا لال ابھی انہیں ہوا۔"

"میں تیرے چاچا سے شکایت کروں گا۔" بے شکا فقرہ حاکم خان کے منہ سے نکلا۔ اور جواب میں جنت کی ہمدردی نہی دور تک گندم کے کھیتوں پر بکھری! "کوئی بات ہوگی تو شکایت کرنے کا ناں! چاچا یا اپنا کام کر۔" وہ ہیزاری سے چل پڑی۔ حاکم خان کو اس نے بولنے کے قابل ہی کب نہ ہوا تھا۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور شرمندہ سادہاں لہجہ کی طرف چل دیا۔

چودھری حاکم خان کے دل میں اس دوپہر کی اپنی بے عزتی کا احساس جز پڑ چکا تھا حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن جنت کی بے نیازی کو اس نے اپنی آن کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہ کر ہر وقت جنت کو حاصل کرنے کے منصوبہ بنا رہا تھا۔ اب فصلیں کٹنے لگی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے کھلیاؤں میں گندم کے ڈھیر لگ گئے۔ جنت کا چاچا اب گندم کی حفاظت کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کھیت میں

سامنے پھیلتا چلا گیا۔ وہ مزی اور میز حیاں ملے کر کے اوپر جانے لگی۔ حاکم خان ایک گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ صحن میں بے قراری سے ٹھٹھکے لگا۔ دل و دماغ میں کنکش جاری تھی۔ دل جھپٹا رہا اور اس نے لپک کر گیس بجادی۔ صحن گھپ اندیرے میں ڈوب گیا اور پھر وہ کسی خوفناک سانس کی طرح میز حیاں چڑھنے لگا۔ جنت کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی قیامت خیز جوانی سے بے سداہ سو رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر رک کر آگے بڑھا اور پھر بڑھتا چلا گیا۔

رات کا پھیلتا سنا جنت کی تیز چیخ سے کانپ اٹھا۔ اس نے اپنے اوپر جھکے ہوئے چہرے کو آگے بٹھکے جھپک جھپک کر دیکھا اور اسے اپنی ہی نظروں پر دھوکہ ہونے لگا۔ وہ چہرہ حاکم خان کا تھا۔ جنت نے کہا تھا مگر ایک مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔

وہ جاؤں کی ایک گہری سیاہ شام تھی۔ قاسو قریب قریب سے اسٹیشن پر اترا اور اندھیرے کی پروا کیے بغیر ہی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہ استخوانوں سے فارغ ہو کر بغیر اطلاع دیے چلا آیا تھا کہ اچانک پہنچ کر کھڑا ہو کر دیکھا کہ گاؤں کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا چپال اڑ چکی تھی۔ سردی کی وجہ سے لوگ اندر گھروں میں بیٹھے تھے۔ اس کا دل عجب انداز سے دھڑکنے لگا اچوٹی کے نزدیک پہنچ کر وہ رہ گیا۔ باوجود اس سے روشنی چمن چمن کر رہی تھی۔ اس کا دل چارہ دم دم روشنی میں سما ہوا سا لگ رہا تھا۔ وہ اندر گیا۔ سامنے باورچی خانے میں جنت بیٹھی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اچانک دروازے پر کمرے سے حاکم خان باہر نکلا اور خلاف توقع قاسو کو سامنے دیکھ کر کانپ گیا۔ قاسو آگے بڑھا لیکن اس نے لگتا تھا جیسے حاکم خان کے قدم زمین میں گڑے ہوں وہ نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی قاسو سے ملنے پہنچ سکا۔ یہ بے قراری سے لپکا۔ قاسو نے محسوس کیا کہ باپ کو اس کا آنا بگاڑا ہے۔

”آپتہ... اچھا تو ہے؟“..... وہ ہنسنے لگا۔ تمام اپنے حواس درست کر کے بولا۔

”اوہ پتر میں تجھے اچانک دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔“ حاکم خان کو بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

”میں تجھے حیران کرنے ہی تو آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ حاکم خان اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ لپٹ کر باہر نکلا اور باورچی خانے کی طرف گیا مگر جنت وہاں نہیں تھی۔ وہ اس کی آواز سن کر اوپر چلی گئی۔ قاسو میز حیاں ملے کر کے اوپر جانے لگا اور چودھری حاکم خان کے دل کی دھڑکن اس کے ہر اٹھنے قدم کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔

کمرے میں لائٹیں کی زبردستی بجھلی ہوئی تھیں۔ پنگا پر جنت چادر کی نکل مارے بیٹھی تھی۔ قاسو

حاکم اندر چلا گیا۔ اس کے قریب اندام جسم کو دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہلا۔ ”سوہنیو بی بی جان بیانی اے۔“ جنت چلی اور قاسو اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ زرد پتلا رنگ دم روشنی میں خوفناک تاثر رہا تھا۔ آنکھیں جیسے دیر ان کنڈر میں جلتے دم دم دیے! کمال ہتکے ہوئے! قاسو کی نظریں اس کے چہرے کا جائزہ لیتی ہوئی اس کے پردے ہوئے پیٹ پر آکر رک گئیں۔

آن واحد میں اس کے چہرے کی شادیت غائب ہو گئی۔

”جنت!“ وہ گونج دار آواز میں چلا اٹھا۔ اونچے چہرے کی بنیادیں چودھری حاکم خان کے وجود سمیت لکڑی۔ ”جب میں گیا تھا تب تو...!“ وہ غصے کے مارے اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ ”پھر بتا کیسے“

جنت کچھ نہ بولی۔ آنسو لڑتی کائناتی بوندوں کی صورت میں آنکھوں سے نکل کر چہرے پر پھیل گئے۔

”راش شکی آواز کے ساتھ پھر پور چائنا اس کے منہ پر پڑا۔ وہ اپنا چکرانا سر قہار میں زمین پر بیٹھ گئی۔

”اب چلا ہے کہ تو تھی پاک دامن تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتی تو...!“

”آگے کچھ مت کہنا۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”اگر سن سکتا ہے تو سن! یہ ہونے والا پتہ تیرا بھائی ہے قاسو۔

اپنے باپ نے میری عزت لوٹ لی۔“

”خاموش! بے حیا۔“ اپنے باپ کے متعلق یہ الزام سن کر وہ تاپو تو اس پر کئے برساتا چلا گیا۔

صبح کا اجالا پھیلا مگر میں چھائی سیاہی نہ مٹ سکی۔ حاکم خان نے بیٹے کے سامنے صاف کمرہ دیا کہ وہ جب غنڈوں کے قبضے سے چھڑا کر لایا تو وہ پاک دامن نہیں تھی لیکن اس نے گاؤں کی عزت کا احساس کرتے ہوئے اسے قاسو سے بچا دیا تھا۔

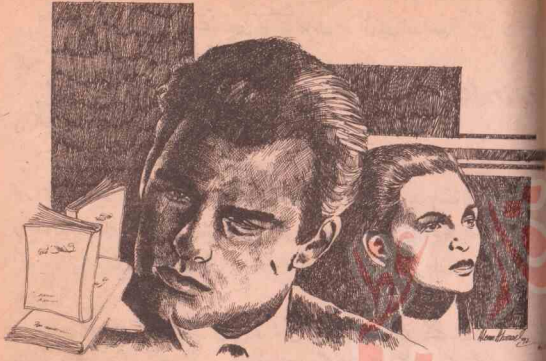
جنت ایک بار پھر پنجایت میں آن کھڑی ہوئی۔ چودھری حاکم خان اونچا شملہ کیے سب کے درمیان بٹا تھا اور وہ سر جھکائے اس کے گناہ کو دامن میں سینے بھر کر کھڑی تھی۔

”جنت جنت۔“ یہ پتہ کس کا ہے؟“ قاسو نے اپنی ہی عزت سے سب کے سامنے چیخ کر پوچھا۔

”تیرے باپ کا“..... وہ دلیر شہرینی کی طرح گہری۔

”کیا ثبوت ہے...!“ اب کی بار اس کا لہجہ طعنے تھا۔

”جو گناہ اندھیرے میں کیے جائیں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا کہ اس لیے کہ رات اپنے وسیع دامن میں سب کچھ چھپا لیتی ہے! جب میرے مقدور کی سیاہی چھٹنے کے بعد روشن اجالا طلوع ہوگا تو سب کو ثبوت مل جائے گا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔



سہارے کی تلاش میں وہ فقیرانہ تنہا رہا
مگر...

مصلحت کا خبیث صورت کاوش ہے بیپناہ سہارا لگایا

اقبال بانو

سہارے کی تلاش

”آخر تمہاری آپا کب جائیں گی؟“ عمار حیدر بیٹھے ہوئے لمبے لمبے بولے۔

”آپ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں عمار؟“ رات حیران تھی۔

”یا تم سمجھ نہیں سکیں یا انجان بن رہی ہو۔ تمہاری آپا کو پورے پندرہ دن ہو گئے ہیں انہیں آخر جانا ہے۔“

”عمار! رات ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی چلی چلی۔“

”میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟ آخر اس قدر غصے کی وجہ؟“ عمار اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

حاکم خان کے متعلق یہ الزام سن کر لوگ غصے میں آ گئے۔ اس پر ہر طرف سے لعنت برساتی جا رہی تھی۔ قاضی نے سنگسار کرنے کا حکم دیا جو قبول کر لیا گیا لیکن ایسی حالت میں اس پر عمل درآمد ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے ساتھ ایک اور جان بھی جاتی۔ سب کے متفقہ فیصلے کے مطابق اس سزا کو سنبھالنے کی پیدائش تک ملتوی کر دیا گیا۔

وقت گزر رہا تھا لوگ بڑی بے چینی سے جنت کی اس سزا کا انتظار کر رہے تھے۔ اسلامی قوانین کے مطابق کے بعد یہ پہلا کیس تھا جب زانی کو سنگسار کیا جا رہا تھا۔ پر جوش و خروش ان کو کمنا تھا کہ اگر ”جہنم“ بھی کیا جائے تو وہ دونوں کو ایک ساتھ ہی سنگسار کر دیا جائے۔ مگر ”جہنم“ کو پکڑنے میں وہ سب ناکام رہے تھے۔

ایک صبح جنت کی چیلوں سے حویلی کی دیواریں مل گئیں۔ دھجکی کا مرحلہ قریب آ گیا تھا۔ قاسم نے اپنے کالوں میں انگلیاں غولس لین اور حاکم خان اپنے منصوبے بننے کا اعلان کرنے کے لیے دیوانہ وار مہمیں چکر کاٹنے لگا، پھر بیچے کی باریک آواز گونجی اور حاکم خان کا دل بری طرح سے دھڑک اٹھا۔ اب جنت کی آواز خاموش ہو گئی تھی اور حویلی کے باہر جمع ہوا تھا جا رہا تھا۔ شاید انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ سزا کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اب جنت کی آواز بند ہو گئی تھی۔

دانی فیروزاں توبہ توبہ کرتی حویلی کی رخسٹ ہو گئی۔ حاکم خان نے بچی نظریے اپنے بیٹے کو دیکھا جو گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے بیچے کی طرح رو رہا تھا۔ اس کے اپنے دل نے ایک لمحے کے لیے ندامت سی محسوس کی۔ ایک نظر جنت کو دیکھنے کی خواہش نے سرا اٹھایا۔ وہ دبے پاؤں کوٹھے پر آیا اور چوروں کی طرح جنت کے کمرے میں پہنچا۔ جنت کی پر آڑی تر بھی پڑی تھی اور پولوں میں لیٹا تھا سا پیرہی بری طرح چلی رہا تھا۔ حاکم خان خوفزدہ سا آگے بڑھا۔

”جنت!“ وہ پیار سے بولا۔ جنت نے جنبش نہ کی تو وہ بے قراری سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ جنت کی سرخ و سفید چہرے پر موت کی نیلا ہٹ چھائی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے ایک بھیاکت چلی نکلی۔ جنت کے مرہ کو دیکھ کر نہیں بلکہ بچے کی کلائی میں پڑے ہوئے سونے کے ننھے سے کنگن کو دیکھ کر ابھری تھی۔ یہ وہی کنگن تھا جو چندھری نے برسوں پہلے گزارا کر دیا تھا۔ گزارا اس کی بدست ہوا تھا۔

شکار تھی جس نے راتھی کے وقت آنسوؤں سے حاکم خان کے پاؤں چھو کر کہا تھا۔

”حاو! کنگن میں تیرے بچے کے ہاتھ میں پناؤں کی تو اپنی اولاد کو اس کنگن سے پہچان لیتا۔“

حاکم بچن بچن آنکھوں سے کبھی جنت کو دیکھ رہا تھا اور کبھی نواں دیکھ رہا تھا۔

یولا۔

”آپ۔۔۔ آپ ایسے تو نہ تھے۔ میری آپا کتنے سالوں بعد آئی ہیں اور اب تو ہم ہی ان کا سارا ہیں۔“ اس کی آنکھوں سے ٹھم ٹھم آنسو بہ رہے تھے۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو راجی!“ عماد کہنے لگا۔ ”تمہاری آپا دراصل سہاروں کے بغیر رہنے کی دعویٰ دار ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ انسان اپنا سہارا خود ہے۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے برسوں سے آپ کو جانتے ہوں۔“ راحت نے آنسو پونچھے ہوئے کہا اور عید عید کرکے انداز چل چل کر کہہ رہا تھا کہ کہہ دو کہہ ہاں تم اسے برسوں سے جانتے ہو۔ اندر آکر بیٹھا۔ وہ خود پر قابو پا کر بولا۔ ”بس میں کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ تم کوئی بھی بات متاؤ اور انھیں چلا کر۔“ اگر۔ اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو تم بھی ان کے ہمراہ چلی جاؤ۔ تم کو بھی وہ بغیر ہمارے کہہ رہے ہیں۔“

مباحث عباس اس سے زیادہ نہ سن سکی اور کڑی سے جٹ گئی۔ دل میں جھگڑے سے لگ رہے تھے۔ بہت ہی مشکل سے کمرے میں آکر اور صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ دل کا ابو آئینوں کی آکھوں سے لگا۔ ”اے اللہ! اتنی ذلت کی ہے تم نے میری عماد حیدر پر کہ تم قبول رہے تھے عمادؑ“ مباحث کو ایسا غم رہا جتنا تھا جسے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔ ذہن میں یادوں کا طوفان اٹھ آیا اور نظر کے ماضی کے اوراق پھینکانے لگے۔

گرگز کامن روم میں اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تائبندہ اور صباحت عباس درمیان خاصی گرگرا کر رہی تھی۔ موضوع تھا جیسا کہ عورت مرد کے سارے کے بغیر نہ سکی۔ صباحت حمایت میں بول رہی تھی اور تائبندہ کا خیال تھا کہ ہرگز عورت جاندار کی طرح عورت کو ہی اس کے سارے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے مرد ایک مضبوط سارا ہے۔

”یہ غلط ہے۔“ مباحثہ چینی۔
 ”یہ درست ہے۔“ تابندہ بھی زور سے بولی۔

”کم بختو! امرا یا زکا میرید ہونے والا ہے باقی کل بحث کر لیتا۔“ نرگس نے جو دونوں کی مگر مگر سی
ملاحظہ ہو رہی تھی گاؤں اٹھاتے ہوئے تیزی سے کہا تو ان دونوں نے اس کی بات مان لی اور تینوں بالوں
پیار ٹنٹ کی طرف چل دیں۔

ایاز نہیں آئے تھے۔ صاحت اور تابندہ میں پھر بحث شروع ہو گئی۔

رہا کہو صوبہ جس طرح ایک نازک پیل کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بلندی پر چلی ہے اسی طرح عورت بھی سہارے کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر سکتی ہے۔ ”تاہنہ نے سمجھایا۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتی۔ عورت تمام بھی ترقی کے منازل طے کر سکتی ہے۔" مباحث نے اپنے

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟“ تابندہ زچ ہو کر بولی۔

م مجھے سمجھانے والی کون ہوتی ہو؟" صباحت بہت زور سے بولی۔

اے بابا تم لوگ لڑتی کیوں ہو؟ مرد اور عورت دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ ”عماد حیدر جو اس سے بائیں بن رہے تھے ان کے قریب آئے۔ ”ٹھیک ہے صاحبہات بیگم؟“ عماد حیدر صباحت کی دیکھ کر مسکرائے۔

یہ بھی غلط ہے۔ ”صباحت ہو لے سے بولی۔

”why؟“ عماد بہت حیران تھے۔ عجیب لڑکی ہے یہ۔“

لوئی کسی کا سہارا نہیں ہوتا مسٹر عماد۔ انسان خود اپنا سہارا ہے اور مرد ہو کہ عورت! صیاحت تشری سے اس کا مطلب ہے کہ تم مکمل طور پر باغی ہو مگر باغی داؤے تم کو یہ بتا دوں کہ تم خدا کے قانون کو غلط کر رہی ہو۔“

ارے نہیں مشرعا۔ خدا کے بعد میں کسی اور کو سہارا تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں۔“ صباحت زور لگادی۔

مگر خدا بھی تو سہاروں کا وسیلہ بناتا ہے۔" تابندہ بولی

”ابھا بھئی دیکھیں گے کہ تم کب تک سہارے کے بغیر رہتی ہو؟“ عمامہ نے بات ہی ختم کر دی۔

تم دیکھ لینا کہ میں تمام عرب غیر مرد کے سہارے کے رہوں گی۔ بس کماؤں گی اور کھاؤں گی باقی اللہ اللہ اللہ اللہ صبحت زور سے ہنس دی۔

دیکھیں گے صباحت تمہیں! جلد ہی ہم نے تمہیں اس سہارے والی خوبصورت زنجیر میں نہ باندھا تو بدنام نہیں۔ ”دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

لا حیدر جانے کب سے اسے چکے چکے چا رہے تھے۔ کامنی سی صباحت انھیں بہت پسند تھی مگر کبھی

چاہتا تھا کہ ان کا خیال تھا کہ محبت وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں پروا ہے اور اس کا اظہار محبت کی توہین ہے۔
یہ عماد حیدر اور صبا کا ایم۔ ایس۔ سی کا آخری سال تھا۔ صبا کی باتوں سے عماد کو تو ادا ہوا مگر انھوں نے اپنے ذہن سے یہ بات جھٹک دی کیونکہ تمام لڑکیاں شادی سے پہلے ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔

احتمالات ہو رہے تھے۔ اس دن آخری پرچہ تھا۔ وہ گھر آئی تو چند خواتین دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے قصائی کمرے کو دیکھتا ہے۔ صبا جلدی سے اپنے کمرے میں ہوں گی کوئی محترمہ اپنے تخت جگر کے لیے آئی ہوں گی۔ ان عورتوں کو تو سوائے شادیوں کے اور کوئی ہی نہیں۔ صبا نے غصے سے کتابیں میز پر پٹھیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اسے شک تھا مگر وہ سودا کی ضدی اور مزہ پٹھتھی فوراً اس رشتے سے الگ دیا۔ "میں نے نہیں کئی شادی وادی۔ ساری زندگی بڑھتے رو پھر پیچے پالو۔ آخر یہ ڈگریاں کس نام لیے ہوتی ہیں۔ آدمی عمر ہم ان کو حاصل کرنے میں گنوا ہے تو پھر اس سے فیض یاب کیوں نہ ہوں۔" صبا بیٹی لڑکیاں تو یاد شاہوں کی بھی بیانی جاتی ہیں، آخر کب تک بغیر سارے کے رو کی آج ہیں تو کل نہیں۔ "اماں بی باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

"اماں بی میں سب کو بتا دیتا چاہتی ہوں کہ عورت مرد کے سارے کے بغیر رہ سکتی ہے۔" صبا نے اماں بی کے گلے میں بازو مائل کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمیں فکر نہ کریں۔ آپ راحت کے لیے کریں میں تو ابھی اپنی ایچ ڈی کروں گی مائی سوئٹ بائٹ۔" اس نے ماں کے جھروں والے ہاتھ لیے۔

جب عماد حیدر کو پتا چلا کہ صبا نے انکار کر دیا ہے اور ان کی ماں نے راحت کے لیے بات کی قدرے پس و پیش کے بعد وہ بھی مان گئے۔ شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی تھی اور راحت کی وجہ سے کبھی وہ صبا کو بھی دیکھ لیا کریں گے آنکھوں کی پراس بجالیں گے۔ یہی سوچ کر انھوں نے راحت کے لیے ہائی بھر لی۔ ان کی امی اور بہنوں نے راحت کو جا کر انگوٹھی پٹا دی۔ راحت کے ہاں سے بھی ان کچھ عزیز آئے اور عماد حیدر کو منگنی کی انگوٹھی پٹانے لگا مگر انھیں جس کی امید تھی وہ نہ آئی تھا اس میں اپنے بسکلی کی تڑپ دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف عماد حیدر کی سوچ تھی ورنہ وہ تو عماد حیدر ہر جذبے سے نا آشنا تھی۔ اسے تو یہ تک پتا نہیں تھا کہ راحت کی منگنی اس کے کلاس فیلو عماد حیدر

ہے اور صبا کو اپنے دل و ماں بھائی کو دیکھنے کا کس قدر شوق تھا مگر بھلا ہوا ہائی بھیل کا کہہ برآمدے بھایاں اترتے ہوئے پاؤں مڑ گیا تھا اور اب وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ سب چلے گئے تو صبا کو کمرے میں آکر رو دی۔ اسے سب کے ساتھ نہ جانے کا کس قدر افسوس تھا جیسی تو آنسو جھم جھم بہ رہے تھے۔

راحت کی منگنی تو ہو گئی مگر مختصی اس کے پی اے کرنے کے بعد رکھی گئی۔ راحت ابھی تھوڑا عرصہ منگنی کے بعد تو راحت پر ایک نیا ہی روپ آ گیا۔ آپ ہی آپ وہ مگر اتنی تو اس کے گال سرخ آئے۔ آنکھوں میں شوخی ہی شوخی ہوتی۔ اماں بی اور ابیاں سے چھپی پھرتی۔
"وہ راحت جان آخر یہ کیا بے وقوفی ہے! اماں اب کیا کوئی غیر تو نہیں ہیں۔" ایک دن صبا نے اسے دیا۔

"اے تپا شرم آتی ہے نا۔" راحت نے کہا
"نری بھئی ہو۔" صبا زور سے دس دی۔
"اپا اگر تم کسی سے منسوب ہو گئی ہو میں تو تم کو پتہ چتا۔" راحت نے کہا
"ہاں سن! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ پاگل پن تم کو ہم مبارک ہو۔" صبا کھکھلا کر ہنس دی۔
"وہ ایک بات کہوں! زندگی بغیر سارے کے نہیں گزارا جاسکتی۔" راحت نے کہا
"جانے تم میں کہاں سے یہ بوڑھی روح سامنی ہے جو دل فول بک رہی ہے۔"
"آپ کبھی نہ کبھی آپ کو کسی مرد کا سارا لیتا ہی پڑے گا چاہے وہ شوہر کا سارا ہو یا بھائی کا یا اور کسی۔" راحت نے اپنی بہن کو قائل کرنا چاہا۔

اراحت میں تم سے بڑی ہوں اور تم مجھے سبق پڑھا رہی ہو۔" صبا خشکی سے بولی تو راحت نے وہاں کھٹکنے میں ہی عافیت جانی۔ صبا ہارنا نہیں جانتی تھی جب کوئی بات نہ بن پڑتی تو اسے خواہ مخواہ ہی آجاتا۔ شاید وہ اس طرح اپنی برتری قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

اس دن صبا بہت خوش تھی۔ رزلٹ آیا تھا اور صبا نے یونیورسٹی میں پوزیشن لی تھی اسے دیکھ کر کولوریڈو یونیورسٹی کی طرف سے اسکالرشپ بھی دیا گیا تھا۔ اماں بی اور ابیاں اتنی دور اسے پہنچا نہیں جاتے تھے اور وہ ان کی منتیں کرتی پھر رہی تھی۔ چھوٹے بھائی اتفاق نے رورو کر آنکھیں مل لی تھیں۔

"بھئی کوئی شے غرق ہونے تو نہیں جاری جو تم سب نے گھر کو ماتم کہہ دیا ہے۔" صبا تھجھکا ہی

تھی۔ اخلاق اور عقمت نے اس سے لپٹ کر بھوں بھوں رون شروع کر دیا۔ اخلاق تو ایک جھگٹے سے ہو گیا کہ کہیں کیا ماری نہ دیں۔ اور خود سر اور ضدی صباحت آخر اہاں ایسے اجازت لے کر لی اسے نہ اہاں بی کے انھوں کا خیال آیا اور نہ ایساں کی خاموش حسرت بھری نگاہوں کا نہ راحت آنسو اس کا راستہ روک سکے اور اور نہ اخلاق، عقمت اور اتفاق کے ننھے ننھے بازو اس راستے کی دیوار بن سکے۔ تمام انتظامات اس قدر جلد ہوئے کہ چند ہفتوں بعد ہی وہ چلی گئی۔ ہر ایک پرانے قہا اور عماد حیدر قدرت کے اس حسین مذاق پر دل کھول کر ہنس دیے کہ جس کے قرب کی خاطر وہ اس کو اپنا رہے تھے اب تو اس کی دید سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ یوں تو انھوں نے آج تک اس کے قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ باہر سے اس قدر خوبصورت نظر آنے والا گھرانہ دیکھا ہے؟

دن اپنی رفتار سے گزرنے لگے۔ راحت کی شادی ہو گئی۔ صباحت نے صرف مبارکباد کا خط بھیج کر فرض پورا کر دیا۔ راحت شادی کے بعد راولپنڈی چلی گئی تھی اور اپنی زندگی میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ بھٹوں بعد اپنی آپا کو خط لکھتی۔ ایک مرتبہ صباحت نے راحت کو لکھا بھی تھا کہ ”راجی جان شادی کے بعد عورت صرف ایک مٹھین بن جاتی ہے اور ہر دم شوہر کی غلامی میں لگی رہتی ہے اور تم بھی مٹھین ہو۔“ تو راحت نے لکھا تھا ”آپو آپ کیا جانتے ہیں اس غلامی میں بھی کس قدر سکون ہے، کتنا اطمینان کا ش آپ بھی اس غلامی کا مزا چکھتے ہیں۔ اس غلامی میں آزادی کا سرور ہے۔ آپ جانتے ہیں۔“

راحت کا جواب پڑھ کر صباحت کتنے ہی دنوں تک محفوظ ہوتی رہی۔ ”تمہیں نا آخر وہی شوہر ملے گا جو شتی لوکی۔“ اس نے غور سے سوچا اور دیر تک اپنا مقالہ لکھتی رہی۔ بی۔ ایچ۔ ڈی کے بعد صباحت کو لورڈ یونیورسٹی میں ہی ریسرچ شروع کر دی اور اہاں ایساں کی آس ٹوٹ گئی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ابھی اس کا چند سال پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور وہ یہاں کی جاب میں کرنا نہیں چاہتی۔“ لڑکی تو اس سے ہی نکل گئی۔ ”ایساں خط پڑھنے کے بعد ہولے ہولے چلی۔“

”میں تو پہلے ہی آپ سے کہتی تھی کہ بیٹی ذات ہے اتنا مت پڑھا مگر آپ پر خاندان میں خیر سے بلند کرنے کا بھوت جو سوار تھا۔“ اہاں بی نے غصے سے بولیں۔

”اب اب بھی میرا سرخ رے بلند ہے۔ جو بھی وہاں سے آتا ہے اس کی کامیابیوں کے مقابل بتاتا ہے تو کیا میرا سرخ رے بلند نہیں ہو جاتا؟ صبو کی ماں وہ تو میرا بیٹا ہے مینا اور چاند جو اس قدر درویش ہے اتنا خوبصورت ہے اس میں بھی ایک داغ ہے اور یہی بات ہماری بھویں میں بھی ہے۔ بس ذرا امداد ہے اور تو کچھ نہیں ہے نا۔“ ایساں ہنس دیکر مگر ان کی ہنسی کو کھلی تھی۔ کتنی پیاری تھی ان کی ہنسی۔

صباحت سے لپٹ کر اس قدر رویا کہ صبحات کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

”اتنے بڑے مرد رویا نہیں کرتے اتفاق۔“

”آپو! کیا میں آپ کا انتظار کرتے کرتے چلے گئے؟ آپ تب ہی آجائیں۔“

”اب میں مستقل آگئی ہوں اتفاق۔“ صبحات نے کہا۔

”کاش یہ فیصلہ آپ پہلے کر لیتیں آپو۔“ وہ بولا۔

”اے اب ہمیں سے لوٹنا ہے کارا وہ ہے کیا؟“ صبحات شوشی سے بولی۔

”آپو یہ ناچیزی بیگم غامیہ ہے۔“ اتفاق نے حیران پریشان سی غامیہ کا تعارف کرایا تو صبحات کو محسوس

ہوا کہ ان تینوں کے علاوہ بھی کوئی اور موجود ہے۔

ڈرائنگ روم میں وہ سراج کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اتفاق اور غامیہ اس سے مل کر بہت خوش تھے۔

کمرے سولہ سالوں کی تھیں بھری تھیں۔

”اتفاق یہاں آکر مجھے ایک عجیب اطمینان حاصل ہوا ہے، ایک تحفظ کا احساس ہوا ہے، ایک سکون

بہر آیا ہے۔“ صبحات نے کہا۔

”تو آپ کو یہ سب کچھ پہلے کبھی نہیں ملا آپ؟“ غامیہ نے کہا۔

”نہیں غامی جان! آج جو کچھ مجھے محسوس ہوا ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔“ صبحات ایک صمتی میں

ملا۔

”اچھا آپو میں اخلاق بھائی کو اطلاع دے آؤں کہ آپ آئی ہیں اور راحت کو بھی اطلاع کر دوں۔“

اتفاق اٹھتا ہوا بولا۔

”اخلاق تک تو درست ہے کہ اسے بتا دو مگر راحت کو مت بتانا۔ میں خود بخود جانوں گی۔ اسے سر

انزدہ بنا چاہتی ہوں۔“ صبحات نے کہا۔

”آپ کی پہلے والی عادتیں نہیں گئیں۔“ اتفاق نے کہا تو صبحات زندگی سے بھرپور نفی نہیں دی۔

اچانک ایک دن وہ راحت کے ہاں پہنچ گئی۔ راحت مارے حیرت کے گنگ ہو گئی اور صبحات کی فطری

شوشی لوٹ آئی۔

”ہائیں کیا میرے سینگ نکل آئے ہیں جو تم پر سکتہ طاری ہے۔“ صبحات نے اس کے سامنے ہاتھ

لہرائے تو راحت اس سے لپٹ گئی اور پھر دونوں والدین کو یاد کر کے بہت روئیں۔ ”تمہارے صاحب

کمال ہیں؟“ صبحات نے موضوع بدلنا چاہا۔

صبحات کو جب ہوش آیا تو وہ اب تک وہیں پڑی تھی جہاں پر گری تھی۔ ماتھے سے خون بہہ کر رہا تھا۔
”تو کیا کسی نے بھی میرے کمرے میں آکر نہیں جھانکا کہ میں زندہ ہوں یا.....“ قہرناک
میرا اس قدر گہری دوست ہوئی تھی آجائیں۔“ صبحات نے دل ہی دل میں سوچا اور کتنی ہی آنسو زہرا
کر اس کے دل پر گرے۔

جس نے بھی سنا وہی حیران تھا۔ صبحات عباس کو بلوئیڈ ویونیورسٹی کی ہر دلچسپ پروفیسر واپس پاکستان
رہی تھی۔ ”آخر تم پاکستان جا کر کیا کرو گی۔ کس لیے جاری ہو تم؟“ جو بیان نے کہا۔

”سارے کی تلاش میں۔“ صبحات نے کنا چاہا مگر الفاظ اس کا ساتھ نہ دے سکے اور وہ دل ہی
سوچ کر رہ گئی۔ صبحات عباس آج سارا روم کا قائل ہو گئی تھی۔ بغیر اطلاع کے جب وہ گھر آئی تو اچانک
بھی نہ پہچان پائی۔ کتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ ہر طرف شاندار عمارتیں بن گئی تھیں اور عباس لان کی
ایک نئی طرز کی کونجی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گیٹ میں داخل ہوتے سے پہلے تو وہ جھجکی۔ ”لو یہ وقت
آنا تھا صبحات عباس کہ اپنے گھر آتے ہوئے بھی جھجک رہی ہو۔“ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا۔ کال
بجائی تو ایک خوبصورت سی لڑکی نے دروازہ کھولا۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ نہایت شائستگی سے پوچھا گیا۔

”جی..... جی وہ اخلاق اور اتفاق ہیں۔“ صبحات ہٹکا گیا۔ ”یہ اتفاق صاحب کا پورش ہے۔ اخلاق

صاحب دوسرے پورش میں رہتے ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”تو..... تو کیا بھائی بھی علیحدہ ہو گئے ہیں۔ کیا انہیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت نہیں

رہی۔“ اس نے سوچا

”تم تو دروازے سے چپک کر رہ گئی ہو یہ تمہارا لاڈلا دور ہے۔“ ایک خوبصورت سائز جوان

پیارے سچے کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھرے دروازے تک گیا۔

”اے اتفاق میں تمہاری آپو ہوں.....“ صوب کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا اور اس نے

سمیت ہی اتفاق کو اپنے سے لپٹا لیا۔

”تو..... تو کتنا بڑا ہو گیا ہے اتفاق۔“ وہ دلیانہ وار اس کو چومے جاری تھی۔ روئے چلی جاری

اور اتفاق حیرت سے اسے دیکھ گیا۔ وہ اب بھی دریاے حیرت میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

”تم خوش نہیں ہو میرے آنے سے اتفاق؟“ وہ جھجکی۔

”آپو سوچ رہا ہوں کہ یہ حقیقت ہے یا ہمیشہ کی طرح خواب۔“ اتفاق نے آہستہ سے کہا اور

”عماد کا بچ گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ راحت نے کہا۔

کھری کھری سی راحت، صباحت کو بہت اچھی لگی۔ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود مگر اس کی دلکشی برقرار تھی بس ذرا سنجیدہ ہو گئی تھی۔
”مگر آپ اچانک آئیں کیسے؟“ راحت کو تو یہ جاننے کی جلدی تھی۔

”بچوں کی تلاش میں راجی جان اور یہ بات میں صرف تم کو بتا رہی ہوں کسی اور کو مت بتانا۔“
صباح نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ٹوٹے سپنوں کی کڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جیسے وہ آج بارگاہی ہو اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی ہو۔

”رنگی! راحت اچھل پڑی۔ یہ بات اس کی تپا کہہ رہی تھی وہی جو ساراوں کی مخالف تھی۔ اسے
میں پر وہ مٹا اور عماد ڈرا رنگ روم میں داخل ہوا۔

”آپ آگئے مجھے تو پتا ہی نہ چلا۔“ راحت جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”تم باتوں میں مصروف تھیں نا۔“ عماد غائی کی گردہ چلی کرتے ہوئے بولے۔

”عماد ان سے ملے یہ میری آپو ہیں۔“ راحت سے اپنی خوشی چھپائی نہیں جاری تھی۔

”کب آئیں یہ؟“ عماد نے مصوٰی حیرت سے پوچھا۔ وہ دونوں بہنوں کی گفتگو سن چکے تھے اور صباحت
کی سوچ کی تبدیلی پر وہ دل ہی دل میں ڈبے تھے۔

”آج ہی آئی ہیں۔“ آپا یہ عماد ہیں۔“ راحت تعارف کروا رہی تھی۔

”بہت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔“ صباحت نے بولے کہ کہا۔

”شکریہ۔“ عماد نے بے نیازی سے کہا اور قریبی صوفے پر بیٹھ گئے۔ راحت کھانے کا انتظام کر کے پل
گئی۔ دونوں اپنی جگہ خاموش تھے۔

تو عماد حیدر یہ تم ہو میرے بہنوں جیسے دیکھنے کا مجھے بے حد اشتیاق تھا۔ صباحت نے کئی مرتبہ راحت کو
لکھا تھا کہ وہ عماد کی کوئی تصویر بھیجے مگر راحت بیشہ جواب دینی کہ عماد تصویر دینا پسند نہیں کرتے۔ آج
مستھی کھل گئی تھی۔ مگر..... مگر یہ عماد حیدر تو بیشہ اس کے سنگ سنگ رہا تھا۔ جب بھی کسی وہ
ہوتی تو خیالوں میں وہم سے آجاتا تھا اور جب بھی وہ سوچتی کہ آخر میرے اور بھی تو کلاس فلور تھے وہ
مجھے یاد نہیں آتے..... اور اس نے اپنے آپ کو خوب ڈانٹا تھا۔ جب بھی عماد حیدر کا خیال آتا وہ فوراً
لا حول ولا برہتی جیسے شیطان کو بھگا رہی ہو۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ عماد حیدر کہاں ہے۔ حال میں
ہے۔ اس کی تو شادی بھی ہو گئی ہوگی اور وہ اپنے پیوی بچوں میں مست ہو گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ

دراحت کا شوہر ہے۔ اس کا سنا بان ہے۔ اور..... اور پھر عماد حیدر کی آواز پر وہ چوٹ کی۔

”آپ اتنا عرصہ امریکہ میں کیا کرتی رہیں آخر؟“ عماد نے کرے کی یو جھل فضا کو ختم کیا۔
”وہی جس کے لیے گئی تھی۔“ صباحت مسکرائی۔

”آپ آپ کا کیا خیال ہے؟“ عماد حیدر نے پوچھا۔

”کس بارے میں۔“ صباحت نے کہا۔

”میں کہ عورت مرد کے بغیر رہ سکتی ہے یا نہیں۔“ عماد حیدر نے سگریٹ سلا گیا اور دھپے میں کھڑے
گئے۔ وہ خلا میں نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔

”مثال آپ کے سامنے ہے عماد حیدر۔“ صباحت نے کہا حالانکہ یہ جھوٹ کتے ہوئے اس کا دل شک
کا رہا اپنی بار مائنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔

”وقت انسان میں بہت تبدیلیاں پیدا کرتا ہے مگر.....“ عماد حیدر پلٹے اور اس کی طرف دیکھا جو
کی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور جھک گئیں۔

”مگر کیا؟“ صباحت بے دردی سے مسکرائی مگر آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ عماد نے کچھ جواب نہ دیا
دوٹی سے باہر چلے گئے اور کچھ دیر بعد چاروں بچوں نے اندر آکر اسے گھیر لیا۔ ”آئی پیاری آئی۔“
..... ساجدہ ان سے لمبی جاری تھی۔

”نہیں بیٹے خالہ کیسے صباحت نے ساجدہ کی بات کاٹی۔

”خالہ! اہم تو سمجھتے تھے کہ آپ بے حد مدھور ہوں گی منہ میڑھا کر کر کے انگریزی بولیں گی مگر آپ
بہت مختلف ہیں۔“ سجادہ نے کہا ساجدہ کا لفظ ”خالہ! اہم“ اس کے کانوں کی امرت گھول گیا۔ کتنا خوبصورت
الہ ہے امی۔ اس نے پہلی بار اس محاسن کی لذت محسوس کی۔

بچے صباحت سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ صباحت کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے ان کے
اور رہ رہی ہے۔ اسے اسی پیاری کی تلاش تھی مگر..... مگر آج عماد کے ریک جملوں نے ان تمام
ان پر اپنی پچھیرا دیا تھا۔ ”عماد تم ٹھیک کر رہے تھے۔ مجھے بغیر ساراوں کے رہنے کی عادت ہے۔“ پھر وہ
کی اور اس نے اپنا سامان سمیٹا۔ سامان ہی کیا تھا صرف ایک انٹیجی۔

”آپ کہاں جاری ہیں آپ؟“ راحت نے اسے دیکھا تو ڈر کر قریب آئی۔ اس نے کسی کو اپنے جانے
کا متعلق بتایا بھی تو نہ تھا۔

”سارے کی تلاش میں۔“ صباحت آہستگی سے بولی۔

”آپوں میں.....“ راحت نے کہا جاہر مگر صباحت نے بات کاٹی۔

”نہیں، تم میری منزل نہیں ہو رانی! اٹھتے جانے دو خدا تمہارا سائبان سلامت رکھے۔“ صباحت نے راحت کی پیشانی چوٹی اور پھر ٹھکے ٹھکے قدم اٹھائی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور راحت اسے دیکھ کر ہنسی۔ وہ کس منہ سے روکتی کہ اس کے شوہر نے اس کا مان ڈوڑیا تھا۔

”آپو خدا کرے آپ کو سہارا مل جائے۔“ راحت نے آنسو پونچھتے ہوئے دعا کی۔
وہ ”عباس لان“ واپس آگئی تھی دل میں ایک کسب لے۔ نماز روئیل جب رابعہ کو امی کتا اور اپنے لیے جس تمام محبت سمو کر رہی تھی اسے چوتھی تو صباحت بے چین ہو جاتی۔ بے اختیار اس کا دل ہلکا ہوتا تھا۔
کہ کوئی اسے امی کے اور جواب میں اس کا رواں رواں ہی..... جی پکارے۔

”اس دن سلا بان میں شام کی چائے پر جمع تھے۔ صباحت نے اخلاق اور اتفاق کو اکٹھا کرنا تھا۔
اب دونوں کے الگ پورشن نہیں تھے۔ رابعہ اور عانیہ بھی خوش تھیں۔

”اخلاق! صباحت نہ جانے کیا سوچ کر بولی۔

”جی آپ.....! اخلاق سعادت مندی سے بولا۔

”ایک بات کا منوں مانو گے؟“

”ایک کیا ہزاروں مانوں گا۔“

”تم میری خاطر کیا کر سکتے ہو اخلاق؟“ وہ اعتماد سے بھر پور لہجے میں بولی۔

”میں تو جان دے سکتا ہوں آپ حکم تو کریں۔“ اخلاق جوش میں بولا۔

”روئیل کو مجھے دے دو۔“ صباحت نے کہا تو اخلاق کا چہرہ زرد ہو گیا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ اخلاق حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اخلاق، میں اکیلی چلتے چلتے تھک گئی ہوں اور اب مجھے ایک سہارا ضرورت ہے۔“

”آپ شادی کر لیں آپ۔“ رابعہ نے روئیل کو لپٹا لیا جیسے صباحت اسے ابھی پھین لے گی۔

”بھئی آخر یہ بھی میرا ہی بچہ ہے اور اس بڑھاپے میں شادی کچھ اچھی نہیں لگتی۔“ صباحت اس کی ایک دھکی بھری ہنسی۔

”جی نہیں۔ میں روئیل نہیں دے سکتی۔ اب میں سمجھ کر کہ آپ کیوں آئی ہیں یہاں۔“ رابعہ نے

سے کہا اور روئیل کو گود میں لیے اندر چلی گئی۔

”یہ رابعہ کو کیا ہوا؟“ صباحت نے حیرت سے اخلاق کی طرف دیکھا۔

”آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔ یہ تو سوچنے کے ہم اپنا لخت جگر کیسے آپ کو دے سکتے ہیں؟“ اخلاق نے ہنسا اور خود بھی اندر چلا گیا۔

پر اتفاق اور عانیہ بھی اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے اور وہ کرپٹی کرپٹی دل لیے بیٹھی رہی۔

”تو..... تو یہ تم لوگ ہو۔ اخلاق تم تو میرا خون ہو تم مجھے بھی سارا نہیں دے سکتے تو مجھے عمار حیدر کیا کھلا! تو..... تو کیا اولاد بہنوں سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اس رشتے کی شدید محبت کا ماں اسے پہلی بار ہوا تھا.....“

پر صباحت اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کی دونوں بھابیوں اس سے ڈری رہتیں مہاوا ان بچے بچھن چائیں۔

”اے تمہاری امریکی مندر نظر نہیں آتی۔“ صباحت کے کانوں میں آواز آئی تو وہ چونک سی گئی۔
ات کا کراؤ رانگ روم کے ساتھ ہی تھا۔

”خالہ جان وہ اپنے کمرے میں ہیں۔“ عانیہ نے جواب دیا۔

”شاید وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔“ وہی خاتون بولیں۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں مگر.....“ عانیہ رکی۔

”مگر اب وہ سارے کی تلاش میں ہیں۔“ رابعہ نے عانیہ کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہا۔

”کیا مطلب۔“ یہ کسی دوسری خاتون کی آواز تھی۔

”مطلب یہ ہے کہ مجھ سے روئیل کو مانگ رہی تھیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ روئیل کو سہارا بنانا تھی۔ خالہ اب آپ بتائیے میں کیسے دے دوں۔“ رابعہ نے کہا۔

”اے بس! ماں باپ ساری زندگی کمائی کھاتے رہے اور لڑکی کو کیا پٹنے کا خیال نہ کیا۔ لڑکی اپنے منہ کیسے کہتی کہ مجھے بھی کھانا چاہیے۔“

صباحت سے آگے کچھ نہ سنا گیا۔ اس نے ٹکیے میں منہ چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی مگر اس کی لمباں ڈرا رنگ روم سے آنے والے قہقہوں میں دب کر رہ گئیں۔

جلد ہی اس کا مقامی یونیورسٹی سے اپنا عنایت لیٹر آگیا بیٹش کی طرح اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے اور صباحت عباس نے کسی کو اپنی جاب کے متعلق نہ بتایا اور ایک دن چپکے سے وہ ”عباس لان“ کو چھوڑ یونیورسٹی کی طرف سے ملے ہوئے ’خوبصورت پھولوں سے گھرے ہوئے چھوٹے سے بیٹنگ میں آگئی۔

صباحت عباس اب اسی یونیورسٹی میں پروفیسر تھی جہاں کے چپے چپے سے اس کے شوخ دلوں کی یادوں کی خوشبو آتی تھی مگر اب وہ شوخ و شریر صباحت عباس نہ تھی وہ صباحت تو نہ جانے کہاں گئی اب تو صرف ایک بڑا پارٹنر کی صباحت عباس تھی جس سے ہر طالب علم مرعوب تھا اور اس کی کرتا تھا۔

اس دن سائنس روم میں فائقہ احمد اور رضیہ شائق کی اچھی خاصی جھڑپ ہو رہی تھی۔ صباحت آفس میں تھی اسے میں آصف محمود اندر آگیا۔ وہ ایک ہونما طالب علم تھا اور صباحت اسے بہت پسند کرتی تھی۔

”میڈم وہ..... آپ پر کیکنگ نہیں لے رہیں۔“ آصف محمود کی گھبراہٹ ہوئی آواز صباحت کے توجہ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ سائنس روم جائیے میں ابھی آتی ہوں۔“ صباحت نے رجسٹر پر نظریں متبادیں۔

”مگر..... اسکیوڈی میڈم۔“ آصف محمود آہستہ سے بولا۔
 ”یوہو!“ صباحت ہولے سے مسکرائی تو آصف محمود کی ہمت بڑھی۔
 ”میڈم پوری کلاس سائنس روم میں جمع ہے اور ایک ہنگامہ ہے وہاں۔“
 ”کیا مطلب؟“ صباحت کھڑی ہو گئی۔

”جی ہاں فائقہ احمد اور رضیہ صاحبہ لڑ رہی ہیں۔“ آخر آصف محمود نے کہہ دیا۔
 ”چاؤ دونوں کو بلاؤ فوراً۔“ صباحت نے تجزی سے کہا۔
 تھوڑی دیر میں فائقہ احمد اور رضیہ شائق، آصف محمود کے ہمراہ اس کے آفس میں تھیں۔ صباحت نے تینوں کو اپنے قریب کر سبوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آخر کیا بات ہے کہ آپ دونوں لڑ پڑیں؟“ صباحت دونوں سے مخاطب تھی۔
 ”میڈم یہ فائقہ کی بحث کی عادت ہے۔“ رضیہ نے بات ختم کرنے کے لیے انداز میں کہا۔
 ”نہیں میڈم.....“ فائقہ بولنے لگی۔
 ”تم بتاؤ آصف محمود۔“ صباحت نے کہا۔

”میڈم بات کچھ بھی نہیں ہے صرف اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا عورت مرد کے سہارے بغیر رہ سکتی ہے؟“

”کیا؟“ صباحت اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی! ”تو کیا.....“

لا اور دوبارہ بیٹھ گئی۔

اس میڈم بس اسی بحث میں گرما گرمی ہو گئی۔ ”آصف محمود کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے گیا۔“
 ”مگر کیا کتنی ہو رضیہ؟“ صباحت نے رضیہ سے پوچھا۔

”میڈم میرے خیال میں عورت کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔“
 اور تم فائقہ؟“ صباحت نے اس کی جانب دیکھا۔

”میرے خیال میں انسان اپنا سہارا خود ہے۔“ فائقہ احمد ایک غرور سے بولی۔
 مگر یہ غلط ہے فائقہ۔“ صباحت چپٹی۔

”میڈم اگر میں کہوں کہ یہ درست ہے تو۔“ فائقہ نے کہا۔ صباحت کو محسوس ہو رہا تھا کہ فائقہ نہیں ہانپنے والی ضدی سی صباحت عباس بول رہی ہے۔

”یہاں اگر آپ سناڑ نہ کریں تو پھر مجھے یہ بتائیے کہ آخر عورت کو ہر قدم پر سہارے کی ضرورت کیوں ہے عورت کو ہر قدم پر سہارے کی ضرورت ہے چاہے وہ ایک شوہر کا سہارا ہو یا اس کی کوکھ سے والے بچے کا۔“

پھر ہم اتنا پڑھتے لکھتے کیوں ہیں؟ شروع ہی میں گھبراہٹ کیوں نہیں سنبھال لیتے۔ کیا ہماری ڈگریاں ایک بے کار گانڈ کی طرح ہوتی ہیں۔ جب ہم اس سے فیض حاصل نہیں کر سکتے تو ان کو حاصل کے لیے اپنا کھنچا جین کیوں قربان کر دیتے ہیں پھر یہ تعلیمی ادارے عورتوں کے لیے بند ہو جاتے۔“

فائقہ جان یہ ڈگریاں ہم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ ایک نئی نسل ہماری گودوں میں پرورش پاتی ہے کہ پہلا مدرسہ ماں کی گود ہوتی ہے اگر وہ تربیت اچھی کرے گی تو بچہ کل اچھا شہری بن سکے گا۔“
 نے اسے قائل کرنا چاہا۔

رحال میڈم کسی اور کو سہارے کی ضرورت ہو تو ہو مجھے نہیں ہے۔“ فائقہ نے بڑی متانت سے کہا۔

فائقہ! تم حقیقت سے منہ موڑ رہی ہو! ابھی تم جوان ہو، خوبصورت ہو، کئی لوگ تمہیں سہارا دینے آگے بڑھ رہے ہوں مگر تم سب کو ٹھوکر مار کر آگے بڑھ رہی ہو..... آنے والے کل پر نظر بٹم سہارا لینے کے لیے ہاتھ بڑھاؤ گی تو کوئی بھی آگے نہیں بڑھے گا۔ آنے والا کل ایسا ہو گا جب

”تھا؟“ اس نے ہولے سے پکارا۔

”وہ!..... تم“ صاحت چونک گئی۔ ”کیسے آئے ہو؟“

اس کا کھجہ کھٹلا ہو گیا۔

”ایک کام تھا آپ سے؟“

”کہو؟“

”کیا آپ بیٹھے کو نہیں کہیں گی؟“ وہ زبردستی ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بیٹھو۔“ وہ رکھائی سے ہوئی۔

”میں آپ کو لینے آیا ہوں آپا۔“ اخلاق اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کیوں؟“ وہ ترشی سے ہوئی۔

”اس لیے کہ ہم میں دنیا کے طعنے سننے کی ہمت نہیں ہے۔“

”کیا کتنی بے دنیا تم؟“ صاحت کھڑی ہو گئی۔

”یہی کہ جوان بہن الگ تھلگ رہتی ہے۔ نہ جانے کیا وعدے کرتی ہے اور یہ کہ ہم آپ سے کہا

نہیں ملتے۔“ اخلاق چٹانوں کی سی سختی سے بولا۔ ”یہ سب سن کر ہمیں شرم آتی ہے۔“

”اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تم کہہ دو کہ تم اپنی بہن کے لیے جان تو دے سکتے ہو مگر سارا نہیں

صباحت نے کہا۔

”میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اس ملک میں رہنا ہے تو ہمارے ساتھ رہنا

ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”ورنہ کیا؟“ صباحت نے حیرت سے پوچھا۔

”ورنہ یہ کہ وہیں لوٹ جائیے جہاں سے آئی تھیں آپ۔“ اخلاق نے کہا۔

”اخلاق؟“ وہ چپٹی۔ ”یہ ملک تمہاری جاگیر نہیں ہے۔“

”مگر والدین کی عزت اور اپنی عزت میری جاگیر ہے۔“ اخلاق نے کہا۔ ”آپ نے پہلے ہماری

عزت میں کون سی سرچھوڑی ہے۔“ وہ ہنس کر پوچھا گیا۔ ”آپ کو ان دونوں فیصلوں میں سے ایک فیصلہ

کرنا پڑے گا۔ میں ایک ہفتے بعد آؤں گا۔“ اخلاق نے صباحت پر ایک اچھٹی نگاہ ڈالی اور کمرے سے

گیا۔ صباحت حیران پریشان سی صورت کی پشت پکڑے رہ گئی۔

صبحات تلخی سے مسکرائی۔

”اللہ میاں کیا ذرا ذرا سی غلطیوں کی ایسی ہی سزا ملا کرتی ہے؟“

ایسے میں اسے راحت یاد آگئی۔ جب سے وہ راحت کے پاس سے آئی تھی نہ اس کی خیریت کا پتا چلا

اور نہ صباحت نے اسے کوئی خط لکھا تھا حالانکہ اس سے تو اسے ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا اور نہ ہی وہ

راحت سے ناراض تھی مگر نہ جانے وہ کون سی مصلحت تھی جس نے قلم کو روکے رکھا۔ اس نے قلم

بھالالا اور اسے خط لکھنے بیٹھ گئی۔



”صباحت یہ خط آیا تھا صبح آپ کو نہ یاد ہی نہیں رہا۔“ غفور نے خط بیٹٹ میں لاکر ٹیبل پر رکھ دیا۔

”اچھا رکھ دو جاؤ۔“ عمار نے نگاہیں کاپی پر جما کر کہا۔ عمار حیدر کا اشتیاق بڑھا تو انھوں نے لفاظی

انگلیا، چاک کیا اور پڑھنا شروع کر دیا مگر پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہوا جیسے دل کی دھڑکنیں رک جائیں

کی۔

عمار حیدر مزید بکھر کر رہ گئے۔

حالانکہ وہ خط راحت کے نام تھا مگر پھر بھی انھوں نے پڑھ ہی لیا۔

صبحات نے لکھا تھا۔

”راحت! ڈھائی سال کا طویل عرصہ اس آس میں گزر گیا کہ شاید تم مجھے کھوجتی ہوئی آنکھوں میں

میں بہن ہی نہیں غمگین دوست بھی سمجھتی تھی مگر تم نے میرا مان تو ڈوبا۔ عمار کے سلوک کا مجھے کوئی

مدد نہیں غم تو ان سہاروں کے ٹوٹنے کا ہے جن میں دنیا کے سب سے مضبوط رشتے مجھے ہوئے تھے۔

میں نے اپنی دنیا تعمیر کرنے کے لیے اخلاق سے روٹی لیا مگر ان سب لوگوں نے مجھ سے نگاہیں پھیر لیں۔

میں نے اپنی تمنائی کو ابھی سارا بتا لیا اور یہاں ہو چل میں آگئی۔۔۔۔۔ دو سال تک تم لوگوں میں سے

ہی نے یہاں آکر یہ نہ پوچھا کہ میں زندہ ہوں یا مر گئی۔۔۔۔۔ مگر کل اخلاق بلا اطلاع آگیا۔۔۔۔۔ وہ مجھ پر

اپنے دو فیصلے مسلط کر گیا ہے۔ پہلا یہ کہ اس کے ہمراہ عباس لاج چلوں یا واپس لوٹ جاؤں جہاں سے آئی

ہوں۔ راجی میں نے اس کی دو سرری بات منظور کر لی ہے۔ اپنوں میں بے سارا ہو کر رہنا زیادہ تکلیف دہ

ہوتا ہے۔ میں بت جلد یہاں سے چلی جاؤں گی۔ عمار حیدر سے کہنا صباحت نے اپنی ہمارا مان لی ہے۔ وہ

لی جاچکے تھے تاکہ صباحت کو اس کی خود سرری کی سزا ملے تو انھیں بتا دیا کہ صباحت پرانے دیس میں

رہنے کے بعد ”لاوارث“ کہلائے گی۔“ صباحت۔

صبحات کا خط پڑھتے پڑھتے عمار حیدر کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ انھوں نے اپنا سر قدام

لیا، وہ کیسے اس خود سر کو جانتے کہ آج بھی وہ ان کی ماسوں میں بس رہی ہے۔

ایئر پورٹ پر اسے چھوڑنے فائقہ اور آصف محمود آئے ہوئے تھے۔ ابھی جہاز کی روانگی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ آصف محمود ان کے اواس چہرے کو دیکھ کر اندر ہی اندر دکھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی ادا پٹانگ باتوں کے اپنی میڈیم کو ہنسانا چاہتا تھا، کبھی فائقہ کو چھیڑ کر اور کبھی کسی مسافر پر ہنستا ہوا فائقہ چاہاں کر کے۔ مگر صباحت کی آنکھوں کی اداسی وحشت میں بدلتی جا رہی تھی۔ اس نے نرمی سے آصف سے کہا کہ وہ فائقہ کو لے کر چلا جائے وہ کچھ دیر تمہارا چاہتی ہے۔ ابھی یہ جملہ اس کی زبان سے ہوا اور ابھی نہ ہوا تھا کہ زبان لڑکھا گئی۔۔۔ سامنے عماد حیدر آرہے تھے۔ ان کی گود میں چھوٹا سا بچہ داکا ہوا تھا وہ اپنا خوب صورت چہرہ اٹھا کر بار بار ارد گرد کے لوگوں کو دلچسپی سے دیکھتا اور پھر عماد کے شانے پر سر رکھ دیتا۔ عماد بالکل اس کے قریب بکھڑے ہوئے تھے۔

”ہاں صباحت بیگم! میں برسوں پہلے تمہارا سارا بننا چاہتا تھا مگر مجھے تم نے ٹھکرا دیا۔ آج میں وہ ساری بار اپنی پیش کش دہرانے آیا ہوں۔“

”عماد۔۔۔!“ صباحت کا لہجہ حیرانی لے ہوئے تھا۔

”صباحت یہ میرا بیٹا عماد حیدر ہے۔ یہ تمہارے جانے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ابھی یہ ڈیڑھ سال کا ہے۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے میں اسے تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔ یہ تمہارا سارا بنے گا۔ میں اس کی روانگی کے سارے کاغذات مکمل کر چکا ہوں۔ فون پر ہی تمہارے کالج سے مجھے تمہاری روانگی کی ساری اطلاعات مل گئی تھیں۔ میں نے سوچا اسے آخری لمحات میں تمہارے سپرد کروں۔ تم شادی کی ہو پہلے یہ پیش کش کرنا تو یقیناً انکار کر دیتیں مگر اب مجھے یقین ہے کہ میری یہ آخر میں ٹھکراؤ گی۔“

”عماد۔“ صباحت کی آواز گلے میں گھٹ گئی۔

”سو بیٹے جاؤ یہ تمہاری ای ہیں۔!“ بچے نے جھٹ با نہیں پھیلادیں۔۔۔ جاؤ جان عماد اپنی ماں! خوش رکھنا۔ عماد نے دھکی لہجے میں کہا تو فائقہ اور آصف محمود کی آنکھیں بھر آئیں۔ صباحت نے اسے بازو پھیلا دیے اور بچہ اسی کہہ کر اس کی بانوں میں سا گیا۔ برسوں کی پیاس پل بھر میں مٹ گئی تھی۔

”عماد سدا تمہارے ساتھ تھا صوب۔۔۔ سدا تمہارے ساتھ رہے گا۔“ یہ کہہ کر وہ نجم خیم سا آواز رو دیا۔ اس کی آنکھوں میں برسوں کے چھپے ہوئے گلے آج آنسو بن کر بہ نکلے تھے۔ صباحت نے ایک نظر عماد کو دیکھا اور عماد کو بازوؤں میں سمیٹ کر سسکتے لگی۔

اس کی اندھیری رات میں تنہا سنا جتنو چک اٹھا تھا۔



اسے گھبرے بہت تھی۔ اس گھبرے جو کبھی ت. بن سکا سارا بون اور خیر بون کا تعاقب کر فدا کی لڑکی کا داستان

جیلانی بانی



ایک ہندو دودھ والے۔ ڈائننگ سٹون۔ تاریخی رومانوی اور خاندانی ناولوں کا مرکز۔ کشکاش لائبریری اینڈ جنرل اسٹور۔ جمنانج چوک بسکھو۔

بادل دھیرے دھیرے بڑھتے آرہے تھے۔ دل میں گھس آنے والے یقین کی طر شام کی بھیجی بھیجی آئیں بشارت دے رہی تھیں کہ اب میں برے والا ہے۔ دہلی میں جن کی اس جتنی ہوئی شام کو کوئی ان نہیں کر سکا کہ اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کی کمپس میں ایسے کالے بادل چھائے ہوں گے اور فضا میں کی خشکی ہوگی جو آدمی کو آپ ہی آپ پکپکا دیتی ہے۔ میں بس اسٹاپ پر تھا کھڑا تھا۔

دیتا کے لیے اور مجھ جوس آیا۔ پر کاش کے چرے کا ہری ایکشن دیتا کے چرے پر ابھرتا، ڈھٹا اور
 اکڑا کر جاتا تھا۔ دوسرے کے بعد سریندر سے ملاقات ہوئی تھی اس لیے باؤل کا ایک بوجھ میرے دماغ
 کا ہوا تھا مگر پر کاش اور دیتا کے قصے کسی کو سنجیدہ نہیں ہونے دے رہے تھے۔ بارش بیٹھے ہوئے
 سڑکوں کے ہمیں دیکھ رہے تھے، بلکہ صرف دیتا کو۔ اس کے چاروں طرف رنگوں اور خوشیوں کا ہالہ سا
 ہوا تھا۔ کوالٹی کے حوالہ کے ساتھ کہ اس کی آنکھیں چمک چمک جاتیں، ہونٹوں کے گلاب مکمل مکمل
 تھے۔ دیتا کے چرے پر سب سے اچھے اس کے ہونٹ تھے، چمکے، ابھرتے والے اور بار بار اپنی بناوٹ
 اور جذبات کا اظہار کرنے والے اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی تھیں، باتیں کرتے وقت زور سے
 دیتا دے اپنے چھوٹی سی ناک کے ساتھ آنکھوں کو بھی اور سیکڑی تھی، نخی پچھوں کی طرح مگر پھر بھی
 کے گندمی رنگ، کسے ہوئے بے ترتیب بالوں اور صحت مند بدن میں بڑی کشش تھی۔ سیاہ تیل یاٹم
 سرخ چھوٹی سی شرٹ میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی، یوں ہی جیسے آپ ہر روز بس اسٹاپ، سینا ہاؤس
 کے سامنے بہت سی خوش شکل لڑکیوں کو دیکھتے ہیں جو خوبصورت نہیں ہوتیں، مگر پھر بھی آپ کی
 دل دور تک ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ ان کے نظروں سے چھپ جانے پر جانے کیسے دکھ کا احساس سا ہر
 لمحہ چھایا جاتا ہے مگر دیتا تو میرے سامنے بیٹھی تھی اور آج بڑی میز پر بٹھا کر رہا تھا۔ میں سریندر کے ساتھ
 میں مصروف تھا۔ پر کاش بھی ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ دیتا جوس کا گلاس سامنے رکھے گاؤں کی
 اس سے ایک گھر بنانے میں مصروف تھی، جو بار بار دے جاتا تھا پھر بھی وہ ہنسنے جاتی۔ جانے کس بات
 کی بار کوئی مزید اچھا اس نے اپنے ہاتھ سے پر کاش کو کھلائی مجھے سریندر کی اس بات پر یقین نہیں آ رہا
 اس نے دیتا کے بارے میں بتائی تھی۔ بی اے کی اسٹوڈنٹ معلوم ہو رہی تھی، میں بائیس برس کی
 وہ بچہ چلتے چلتے سب سے آگے نکل جاتی، سڑک سب سے پہلے پار کرتی، آگے بڑھ کر ٹیکسی کو بلا لیتی
 تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ٹیکسچر بھی ہو سکتی ہے۔ پر کاش عرصہ میں اس سے جیسے باتیں بڑا لگتا تھا، مگر وہ
 بچنے کی طرح دیکھ بھال کر رہی تھی۔ آج پر کاش کو ذکاوت تھا اور وہ پر کاش کی ہر چھینک پر گھبرا کے
 پر کاش، پلیز، ڈاکٹر کے پاس آج چلے جاؤ تاکہ میں فکروں سے بچ جاؤں۔
 "اؤہ! پر کاش نے جھنجھلا کر کہا۔ "نہی، ذرا مزے کی باتیں ہو رہی ہیں یوسف صاحب سے، اس
 ڈاکٹر کا نام لے کر روبرو مت کرو یا۔" اور پھر دہلی کی سیاست کے اندرونی حقائق پر قہقہے لگاتے

لیں، کبھی اس کے کانڈھے کے پاس سر لے جا کر غیر محسوس دھول جھینکتے لگتی تھی اور کبھی بس یوں لی
 لگاتے جاتی تھی۔ بس میں سوار ہونے کے بعد پر کاش نے سڑک سریندر سے کہا۔
 "سریندر، یوسف صاحب تمہارے دوست ہیں تو آج سے ہمارے بھی دوست ہو گئے۔ اب اس
 کسی ہوٹل لے جا کر حیدر آبادی بریانی کھلائیں گے۔"
 "ہوٹل کیوں؟" دیتا نے برا سامنے بنایا۔ "پر کاش! انھیں اپنے گھر لے چلو نا۔" می اور میں دونوں
 جھٹ پٹ خوب مزیدار کھانا بنائیں گے۔" دیتا نے بچہ خوش ہو کر کہا۔
 "ارے نہیں۔" پر کاش نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔
 "شام کے وقت گھر میں بڑی بورت ہوگی۔"
 "ہاں بھی یوسف! میں تم سے یہ کتنا تو بھول گیا کہ یہ جو ہمارے پر کاش باپو ہیں تا یہ بڑے من
 ہیں۔ بس ہر وقت چمک کے موڈ میں رہتے ہیں۔ انھیں گھر میں بیٹھے سے بڑی نفرت ہے۔"
 "واہ واہ۔ تو پھر ملاؤ یا رہا تھ۔" میں نے بڑھ کر گرم جوشی سے ہاتھ بڑھایا تو پر کاش بڑی محبت
 لگ گیا۔
 "میری عمر چالیس برس ہے۔ اس میں سے بیس برس میں نے گھر سے دور سفر میں گزارے ہیں۔
 نے جبکہ کر کہا۔
 "ارے ہاں یا، یوسف میاں تو یورپ کی گلی گلی چھان آئے ہیں۔ بقول مخمے کھاٹ کھاٹ کا
 چکے ہیں۔" ہم تینوں پھر دوسرے دنس پڑے سب سے جاندار اور اونچا قہقہہ دیتا تھا۔
 "یہ آدوری گلی میں۔" پر کاش بڑی دیر تک میرا ہاتھ تھا رہا۔ بس عابد شاپ کے اسٹاپ پر
 پر کاش نے سب سے کہا۔
 "بس یہاں اتار جائے ہیں کو الٹی چلیں گے۔"
 "مگر وہاں اندھیرا بہت ہوتا ہے۔" دیتا نے بڑی شوخ نظروں سے پر کاش کو دیکھا۔
 "یہ تم دونوں کے لیے اچھا ہے۔" سریندر نے مکر کے دیتا سے کہا۔ "البتہ ہم جیسے اکیلا
 بورت ہوگی! کیوں یوسف بھائی؟" اس بات پر پھر سب سے اونچا قہقہہ دیتا تھا۔ ایک کونے کی
 آس پاس سب بیٹھ گئے پر کاش نے مجھ سے پوچھا۔
 "میرے چلے گی یوسف صاحب.....؟"
 "نہیں....." میں نے گردن ہلائی۔ "آپ تینوں سے ملاقات کی اس یادگار شام کو راتیں گزرتی

رہے۔ بعض عورتیں صرف ماں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے باپ، بھائی، بیٹے اور محبوب سب کے لیے مٹا کر جگائے رکھتی ہیں مگر مجھے ایسا لگا جیسے پل پل کی خبر گیری سے پرکاش پور ہو رہا تھا لیکن دنیا کو نہ پتا تھا ماں جس کی تیلیں سے کھینچے دیکھ کر وہ اس کی طرف مڑ گیا۔

”ہاں تو بھئی، دینی، اب تم بھی تو یوسف صاحب سے کچھ باتیں کرو نا۔ وہ جو شادی کے بعد ماں گھر آگیا گا اس کی کمائی ساؤ۔ ایک بات سن لکھے یوسف صاحب۔“ اس نے دینی کی طرف بڑی پیار بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے دروازے پر کال تیل نہیں لگے گی یہ ہماری دینی کو پسند نہیں ہے۔ آپ اس دینی کا نام لے کر زور زور سے چلا پڑے گا۔“

”میرا کیا؟“ دینی نے چھوٹی پچیوں کی طرح تنک کر کہا۔ ”آپ کا نام لے کر پکاریں گے سب اور وہ مکان تو آپ کا ہو گا۔“

”بھناؤ بھگڑا لیا ہے۔ کیوں نہ ہم تم دونوں کو اسٹھے پکاریں پرکاش دینتا۔“ سریندر زور سے چلا پڑا دینی بھی ہنس پڑی اور کرسی کے کنبے پر سر رکھ کر چھت دیکھنے لگی۔

”کتنی خوبصورت سیلنگ ہے نا ہم بھی اپنے گھر میں ایسی ہی چھت لگوائیں گے۔“

”اچھا اوہو۔“ ہم سب پھر بٹھنے لگے اور پرکاش نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر کہا۔

”یارو! میرے سر پر چھت گر رہی ہے۔ مجھے بچاؤ۔“ ایک بار پھر میرے سر پر ڈوبے اور تھپتھپ سے سارا بار گونج اٹھا۔

”اس لڑکی کو دنیا کی ہر خوبصورتی چرا کے اپنے گھر میں بھر لیئے کا خبط ہے۔“ پرکاش نے ہنسنے ہنسنے کے سر پہ دھپ مارتے ہوئے کہا۔

”ہاں جس طرح اس نے دنیا کی ہر خوبصورتی چھین کر اپنے چہرے پر جمع کر رکھی ہے۔“ اب کی بار سریندر کی بات پر سب کو ہنسا لازمی تھا۔

”چلو ہلو“ سریندر بھیا کو ہنسا بہت آتا ہے۔ ”دینتا نے منہ بنا لیا اور پھر کچھ سنجیدہ ہو کر کہا۔

یوں۔

”یوسف صاحب، مجھے گھر جانے کا بہت شوق ہے۔ جب میں بہت چھوٹی تھی نا، مدراس کے ہاسٹل میں پڑھتی تھی تو دن بھر کا ڈیوڑے سے ننھے ننھے سے گھر بنایا کرتی تھی۔ مجھے گزلیوں کا گھر بنا بہت شوق تھا پھر کپڑے کی چھوٹی گزلیاں بنا کر اس میں بٹھا دیتی۔ مجھے رات کو سوئے وقت ایسا لگتا جیسے وہ گزلیاں اب چپکے سے اٹھ کر گھر میں چل پھر رہی ہوں گی مگر مجھے دیکھ کر پھر سوئی بن جاتی ہیں۔

”وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے میز پر جھکی بہت آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی جیسے ابھی تک وہ کسی گزلیاں کے اپنے آپ کو ایک ننھے سے گھر میں بیٹھا دیکھ رہی ہو۔

”میاں پرکاش، اب تم بھی تمہی کاٹھ کے اوبنائے جاؤ گے۔ بس چپ چاپ بیٹھے رہنا کسی طاق“

”سریندر کی بات پر ہم تینوں کا ہنسنے پر احوال ہو گیا۔

”اب کتنے ہو یا رانا نہ جانے یہ لڑکی مجھے کتنے ناچ چپانے والی ہے۔“ پرکاش نے نشے سے یو بھل ہاتھوں پر لڑکی کو اپنی طرف کھینچا تو وہ دور ہٹ گئی۔

”اچھا“ آپ کو ایک مزے کی بات سناؤ گی۔“ دینتا نے منہ پر سے ہال جھٹک کر بڑی سرخوشی کے ساتھ کہا۔ ”پرکاش کو گھر میں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا ہے نا اس لیے یہ اپنے گھر کا نام پتھر پر رکھیں گے۔“ اپنی بات پر دینتا خود ہی بڑے زور سے ہنس پڑی۔

”ہاں اور میں کسی جاندار کو پتھر سے بند نہیں دیکھ سکتا۔“ پرکاش نے سرگرمی سے سگایا اور دوسرا ہاتھ منہ پر آفر کیا۔

”یارو! میاں سب ہمیں پاگل سمجھ رہے ہیں اس سے پہلے کہ فیچر خود آکر ریٹ آؤٹ کر دے۔ ہمیں سب پر بے رحمی کر رہا لگا جیسے میاں سے۔“ پرکاش نے بل کے پلیٹ میں ایک سوکا نوٹ رکھا

”کھڑا ہوا۔ باہر سڑک پر آئے تو ٹھنڈی ہوائیں ہمارے استقبال کو کھڑی تھیں۔ پارش ہو کر ہتھم ٹی۔ اکاڈا بوند برف کی ذیلیوں کی طرح گرم بدن پر لگ رہی تھی۔

”ہاں تو خوب سردی ہے۔“ دینتا نے اپنے دونوں ہاتھ دونوں بازوؤں پر پلٹ کر کہا۔

”مجھے تو یوں لگ رہا ہے یار سریندر کہ یوسف صاحب سے ہماری بہت پرانی ملاقات ہے۔“ پرکاش سریندر سے کہا۔

”ہاں، ان میں ایک یہ بھی خاصیت ہے کہ یہ دوستی کو منٹوں میں پرانا کر دیتے ہیں۔“ سریندر تیزی سے بڑھا۔

”تو پھر کب آؤ گے حیدر آباد؟“

”میرا خیال ہے پرکاش اور دینتا کی شادی پر آنا پڑے گا۔ ذرا مجھے یہ بتائیے کہ آپ دونوں کی شادی اور کہاں ہوگی؟“

”ہماری شادی؟“ پرکاش نے سر کھٹکا کر سوچتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہماری شادی تو ہو چکی لیکن دینی؟“ دینتا نے اس بات پر خالص لڑکیوں والے انداز میں شرم کا سر جھکا لیا میں اور سریندر پھر

بس پڑے۔

”اچھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی نہیں ہوئی ہے۔“ وہ پھر میری طرف مڑ گیا۔ ”کب ہو گی کہاں ہو گی اس بات کا یقین نہیں ہے۔ البتہ اب کی پیشوں میں ہم ایک ٹور پر نکلیں گے۔ پہلے کلاں کوڈی کنال، پھر شملہ، پھر دہلی۔۔۔ بس اس سفر میں کہیں نہ کہیں شادی بھی کر لیں گے۔ کیوں دینی ہے نا؟“

”بس کرو۔“ دینی نے جھوٹ موٹ کے غصے سے پرکاش کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مجھے ابھی تھکان ہو رہی ہے“ اتنے ہانپاؤں پر چڑھنے سے۔ تمہارا بس چلے تو ہر وقت ہواؤں میں اڑتے ہوئے کیسا لگتا ہے اس آوارہ گردی میں۔“

”بہت کچھ لگتا ہے۔ کیوں یوسف صاحب؟“ اس نے بس کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا کیا؟“ دینیتا نے چڑ کر پوچھا۔

”دوسری رنگین چیزوں کا ساتھ۔“ پرکاش نے پہلے ہی سے دینیتا کی چپٹ سے بچنے کے لیے سر ہلاتے ہوئے ہاتھ رکھ کر کہا۔ دینیتا سے پکڑنے لگی اور پھر چاروں طرف بے فکرے تماشاویں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اس کی نگاہ پر کاٹنے لگی۔

”ہائے مریگا۔“ پرکاش جھوٹ موٹ کے غصے سے چلایا۔

”مجھے اس سائیکلو کی اسٹانی ماں سے بچاؤ یار۔ آئی ایم وری ساری، کو تو باسل جانے کے بعد بھی بن جاؤں۔“ وہ چھوٹے بچوں کی طرح کان پکڑ کے رہا تھا۔

”بھئی کیا ضرورت ہے؟“ دینیتا اس بات پر ایک بار پھر سب بس پڑے۔

”اچھا“ تو اب اجازت دیجیے، یہ خوشگوار شام جو آپ لوگوں کے ساتھ گزری میں کبھی بھولوں گا۔“ میں نے پرکاش سے ہاتھ ملایا اور پھر دینیتا کی طرف دیکھا۔

”تو پھر لگا ہی بار جب حیدر آباد آؤں گا تو آپ سے آپ کے گھر پر ملاقات ہو گی؟“

”لیکن آپ کو پرکاش سے ایک بار ملنے کے لیے ہمارے گھر دس بار آنا پڑے گا۔“ دینیتا نے منہ دھو کر کہا۔

”اچھا؟“ وہ کیوں؟ کیا آپ اس سے ہر وقت نہیں ملنے دیں گی؟“

”جی نہیں جناب، یہ مسٹر سیر پائے کے بڑے شوخ ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کبھی وقت پر گھر نہیں آئیں گے۔ مجھے تو ہرے کہ یہ مجھے بالکل اپنی دھرم جتنی نہ بنا دیں کہ رات کے بارہ بارہ بجے تک

ارکے جاگتی رہوں گی، جتنی دیر کے انتظار میں۔“

”یہ تو ہوا کرے گا۔“ پرکاش نے چایوں کا گچھا ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔ ”اپن ری تو چھوڑنے میں ہیں۔“

”پرکاش کیا چھوڑنے والے ہیں؟“ دینیتا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”جی الحال تو اس سڑک کو چھوڑنے والے ہیں ورنہ ہوٹل کا منیجر اب ہمیں ناشتا کرنے پھر اندر بلا لے گا۔“ پرکاش نے آگے بڑھ کر ایک ٹیکسی بلائی۔

”پرکاش کل ملیں گے یوسف بھائی، آپ صبح آٹھ بجے تک دینیتا کے ہاسٹل آجائیے کل عثمان ساگر لے کے آپ کو ڈرا کھلے آسان تلے گپ شپ ہو گی۔“

”میری ایک بات سنو پرکاش، جب تم اپنا گھر بنو آؤ تو اس پر چھت مت ڈالو نا کہ کھلے آسان تلے رہ سہندرنے ٹیکسی میں بیٹھے سے پہلے کہا۔“

”مگر ٹیکسی بھی کیا ضرورت ہے یار، ہم گھوم کر کے بھی زندگی گزار سکتے ہیں۔“ اس نے دینیتا کے تھپڑ مارنے میں پھر دو ٹوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔

”بہت ہو چکی ہو اس“ مجھے جلدی ہاسٹل پہنچاؤ ورنہ ہاسٹل کی وارڈن مجھے مارے گی۔“ دینیتا نے بچ بچ کر ارکے کہا۔

”آپ ہاسٹل میں کیوں رہتی ہیں؟“ میں نے دینیتا کے کمرے میں آنے کے بعد پوچھا۔

”ابھی آپ سے بات کرتی ہوں۔“ دینیتا اپنے ٹیکسے بالوں کو جھٹکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ دینیتا نے آج بڑی دھڑکتی سے میک اپ کیا تھا اور سیاہ پریٹنڈیکسی پینٹی تھی اور کوئی بھی خوشبو لگا کر تھی جو کمرے کے دروازے پر ایک خوشگوار مژدے کے ساتھ استقبال کرتی تھی۔ اس کا کرا کلاوی کے پارٹیشن سے دو حصوں میں بنا ہوا تھا، ایک طرف بیڈ روم دوسری طرف جہاں میں بیٹھا تھا اس میں دینیتا نے کچن اسٹور، ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم سب کچھ بنا رکھا تھا مگر پریٹنڈیکسی فاسٹ اور سلیٹ سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی جیسے اس نے اس چھوٹے سے کمرے میں ہر چیز رکھنے کے بارے میں کافی سوچ بچار کیا ہو۔ کونے کی ایک میز پر

اور نور اور اس کے اوپر شیٹ میں کچن کا سامان رکھا تھا۔ چھوٹے ساز کے فریج کے اوپر سورج مکھی کے ادا پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔ ریڈیو کے اوپر مٹی پلائٹ کی تیل کا واز تھا، صوفے پر خوبصورتی سے بٹے ہوئے کٹن اعلیٰ تھے۔ شوکیں میں ہر قسم کی گڑباز مسکرا رہی تھیں۔ ناچتی گاتی، بنگالوں کا لباس

255

254

پتے پنجابی سوٹ میں مسکراتی ولہا دلہن بنی، چھوٹے بچوں کی طرح دیکھنے والوں کی طرف ہنسکتی ہوئی گزریوں کی وجہ سے یوں لگتا جیسے کمرے میں بہت سے لوگوں کی چل چل ہو۔ دیتا تو ایسے میں ہال اندر آئی۔ اس نے فریج سے پھل اور مٹھائی نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔

”یہ گلاب جامن میں نے خود بنائے ہیں، پرکاش بڑے شوق سے کھاتا ہے۔“
ان گلاب جامنوں کا ذائقہ مجھے دیتا کے سارے چہرے پر گھلا ہوا لگا رہا تھا۔

”آپ ہاسٹل میں کیوں رہتی ہیں؟“ میں نے گلاب جامن کھاتے کھاتے پھر پوچھا۔ دیتا نے گم پات میں ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر کچھ رک کر بولی۔

”میرا گھر کہاں ہے ابھی، مجھے ابھی میٹھے میٹھے پیلے گلاب ملی ہے۔“ پھر وہ میرے سامنے والے آئینہ میں اور اپنے ہاتھوں کو نینک سے صاف کرنے لگی۔

”اس سے پہلے میں ایک مکان میں بینک گیسٹ تھی۔“

”تو کیا آپ حیدر آباد کی رہنے والی نہیں ہیں؟“ دیتا نے کاٹا اٹھا کر پلیٹ میں پڑی ہوئی گلاب کے دو ٹکڑے کیے، پھر تین اور پھر ان ٹکڑوں کو الگ الگ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے کسنے لگی۔

”میرا گھر کہیں بھی نہیں ہے یوسف صاحب، میں تین برس کی تھی جب امی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کی تو مجھے بورڈنگ میں داخل کر دیا۔ چھٹیوں میں گھر جاتی تھی تو میری سوتیلی بہن تھیں، تم ہمارے گھر کیوں آتی ہو۔ تب میں سوچتی تھی پھر میرا گھر کہاں ہے؟ میرے ایسے سوالوں کے پچھا مجھے چھٹیوں میں آئی کے گھر بھیج دیتے تھے۔ کبھی چاچا کے ہاں، اسی طرح میں اتنی گئی۔“ اس نے چھت کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، جنہیں وہ روک کوشش کر رہی تھی۔

”خیر! اب پرکاش آپ کے لیے بہت خوبصورت گھر بنادیں گے۔“ میں نے اسے خوش کرنے کہا۔

”ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ ایک دم بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔ ”میں نے سوچ لیا ہے اپنا گھر خود بنائوں گی۔ خود ہی اسے بنائوں گی، ویسے پرکاش کا بڑا خوبصورت مکان ہے۔ اس کا ڈیزائن بڑا بزنس میں ہے۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے، ناس لیے امی نے اسے بچپن میں ہر وقت اپنے لگائے رکھا۔ بس گھر میں رہتے رہتے پرکاش بور ہو گیا ہے اب۔“

”آپ جانتی ہیں پرکاش کی امی سے ملنے۔“ میں نے چائے کی پیالی اٹھا کر پوچھا۔

ان بڑی پیاری سی ہیں، پرکاش کی امی، دھما دھما اٹھنے پر بہت خوش ہیں۔ وہ بھی کبھی جانتی ہیں اب اب کسی ایک جگہ ٹھکانے سے بیٹھنا سیکھے۔ آپ چائے اور لیس گے؟“

”ہاں بس شکر ہے..... سگریٹ سلگنا سکتا ہوں۔“ میں نے جھک کر کاروا اور دیتا کے گردن ہلانے پر شکر یہ

اب تو آپ کو اس کمرے میں صرف چند مہینے رہنا ہے مگر آپ نے یہاں ہر طرف باغ لگانے کی لگ لی ہے۔“ میں نے دیوار کے سارے والے رنگ رنگے پودے اور پھل دیکھ کر کہا۔

مجھے پودے لگانے کا بڑا شوق ہے۔“ دیتا نے ایک تیل کے پاس جا کر اس کی پتیوں پر بڑی محنت سے جھرتے ہوئے کہا۔ ”پھولوں، پھلوں کے درختوں کی موجودگی سے گھر کی سی فضا بنتی ہے نا۔ یہ جو تیل سے میں نے ذرا سارسی کا ساہارا دیا تو کتنی اوپر آگئی۔“ دور کہیں سڑک پر پرکاش کی کار کا ہارن گونجا

آج چمک پڑی۔

وہ آگئے.....“ مکی کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر وہ باہر بھاگی۔ ”پرکاش آگئے.....؟“ دیتا بچپن کی طرح تالیاں بجاتی ہوئی اندر آگئی۔ ”آج میں نے کھانے کے لیے رات بھر جاگ کر خوب

پاکائی کی۔“ وہ جلدی جلدی نق کش کیریزر، پاکسٹ اور کچھ پیکٹ لالا کر سامنے رکھ رہی تھی۔ ”اس میں اور اور آلو کی کری، یہ کریلے کا سالن ہے، پرکاش کریلے بہت شوق سے کھاتا ہے۔“

پلو..... یعنی آپ آگئے ہیں۔“ پرکاش نے اندر آکر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اب جلدی آئیے ورنہ سورج نکل آیا تو مٹھنی ہواؤں کا مزہ نہیں آئے گا۔“ پھر اس نے دیتا کی پیالی اٹھوڑی چائے کی پیالی منہ سے لگا لی اور مڑکے دیتا کی طرف دیکھا۔

اف اتنی مٹھی چائے۔ یقیناً دیتا تم نے اس میں اپنے ہونٹ ڈبوئے ہوں گے۔“

پلو ہو۔“ دیتا بچ بچ شرما گئی۔

مگر تم اس سچ وچ کے ساتھ میرے ساتھ بیٹھو گی تو میں کار کیسے چلاؤں گا۔“ اس نے پھر دیتا کی طرف دیکھا۔ ”یوسف بھائی! آپ کو کار ڈرائیو کرنا آتی ہے تو بس آپ اور سرنڈر سامنے کی سیٹ پر۔“

اب بتائے مت ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔“ دیتا بالوں کو جھٹک کر پٹلی گئی، پھر اسے اچانک کچھ یاد

ورہ نق کش کیریزر اٹھانے لگی۔

پرکاش گلاب جامن کھاؤ گے۔ میں نے بڑی محنت سے بنائے ہیں۔“ پرکاش کچھ جواب دینا چاہتا تھا

اس کی نظر نق کش کیریزر پر گئی اور پھر اس نے پاکسٹ کو دیکھا۔

”یہ کیا سامان ہے“ مکی نے کیا تم نے گاؤں والوں کی طرح اپنے کھانے کی پوٹلی تیار کر لی۔
پرشاں چاکلٹ غصے میں آیا۔ ”کوئی سامان ساتھ نہیں جائے گا۔ ارے جنگل میں بھی جاؤ تو سامان
پوریوں ہی گھٹنا پڑیں گی۔“ دینتا کا چہرہ اتر گیا وہ ایک کونے میں ہٹ کر کھڑی ہو گئی تو سر سندر نے کہا۔
”مگر تم تو آج دینتا کے ہاتھ کا بنایا ہو کھانا ہی کھائیں گے اس لیے یہ فن کیہ تر ہمارے ساتھ
گا۔“

”پرشاں صاحب“ آپ کو معلوم ہے اس کھانے کو تیار کرنے کے لیے دینتا رات بھر جاگ رہی ہیں۔“
”مجھے معلوم ہے۔“ پرشاں نے منہ بنا کر کہا۔ ”تو پھر ہم باہر کیوں جائیں، ساری رات جاگ کر
کھانا نہیں کھائے لیتے ہیں۔“
”بالکل اوہل ٹو ہے یہ شخص۔“ سر سندر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”سب کاموڈ جاہ کر
وقت۔“

”موڈ تو میرا تیار ہوا ہے۔“ پرشاں بچوں کی طرح جتانے لگا۔
”اب یہ کھانا کوئی نہیں کھائے گا۔“ دینتا نے فن کیہ تر اٹھا کر تیزی سے دروازے سے باہر
اٹھایا اور تیزی سے باہر چلی گئی۔ چند منٹ تک سب چپ چاپ کھڑے رہے پھر میں نے پرشاں سے کہا۔
”دینتا کو منا کر لے آؤ پرکاں۔“
”وہ کہیں نہیں جائے گی۔ ابھی مولیاں اور گاجریں خرید کر آجائے گی۔“ پرکاں اطمینان سے
پریٹھ کر گلاب جاسن کھانے لگا۔

”یوسف بھائی“ میرے ڈیڑی نے میرے لیے بہت روپیا جمع کیا ہے۔ میں خود دو ہزار روپے کمانا
پھر دینتا کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن کھانا بنانا اور ترکاریاں خریدنا اس کی
ہے۔“
”خیر“ چلو اب دیر ہو رہی ہے۔“ میں نے سب کو باہر کی طرف ہانکا۔ پہلے چل کر دینتا کو منالیں
راستے بھر منہ پھلائے رہے گی۔“ پرکاں نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ہم سب بہت
مارکیٹ میں دینتا کو تلاش کرتے رہے۔ پھر میں دینتا کی دوست سلمیٰ کے ہاں گئے۔ وہ وہاں بھی نہیں
تھی۔

”وہ مکی کی پاس گئی ہے۔ میری شکایت کرنے۔“ پرکاں نے ماتھے سے پیتھ پونچھ کر کہا۔ دینتا
جانے سے وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ ادھر چپک چپ دو گرام خراب کرنے کی وجہ سے سر سندر اس پر

”اب مکی کے چانے بھی کھانا پڑیں گے۔“ پرکاں نے کار چھانک کے باہر روک دی اور دوڑتا ہوا
ایا۔ پھر اتنی ہی تیزی سے باہر آیا پیچھے پیچھے اس کی مٹی تھیں۔ گھبراہٹی ہوئی سی۔ دینتا وہاں بھی نہیں
تھی۔

”ایا بات ہے پرکاں! دینتا کہاں چلی گئی۔“ گوری جی نرم و نازک سی مٹی گھبرا گھبرا کے پوچھتی رہیں مگر
انہوں نے ہاتھ ہلا کر ٹانگا کرتے ہوئے کہا۔
”گھبراؤ مت مکی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم ذر جلدی میں ہیں۔ مکان سے ذرا آگے جا کر پرکاں نے کار
کے کنارے روک لی اور اسٹینرنگ وہیل پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

”گھبراؤ مت مکی کیا بات ہے۔ تم پیچھے آ جاؤ میں کار ڈرائیو کرتا ہوں۔“ سر سندر نے اسے پیچھے بٹھایا
اشارت کر کے بولا۔ ”پھر باشل پٹلے ہیں شاید وہیں واپس آ گئی ہو۔“ پرکاں پیچھے کی طرف سر ٹیک
ایا۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”میں مل دینتا کا کرا ابھی تک اسی طرح کھلا پڑا تھا“ جیسے ہم چھوڑ گئے تھے۔ پرکاں اندر گیا اور چپ
متر پریٹ گیا۔ سر سندر بھی بہت پریشان تھا مگر وہ پرکاں کے پاس بیٹھ گیا۔
”گھبراؤ مت پرکاں، کہیں اپنی کسی دوست کے ہاں جا بیٹھی ہو گی، غصہ کم ہو جائے گا تو آجائے گی۔ وہ
میں چھوڑ کر کہیں جاسکتی ہے؟“ اور پھر سر سندر نے مجھے اشارہ کیا کہ ہم دونوں ایک باہر چارے
ہیں۔

”ہم ذرا یونیورسٹی کیپس جا کر دیکھتے ہیں، ممکن ہے اپنے کسی دوست کے ہاں بیٹھی ہو۔“ پرکاں نے
وہاں نہیں دیا۔ وہ اپنی ہانموں میں منہ چھپائے چپ چاپ لیٹا رہا۔ دینتا کو ہر جگہ ڈھونڈا وہ کہیں
لی مگر ہم یہ بات پرکاں سے کہنے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ مجھے شام کی ٹرین سے دہلی جانا تھا اس لیے
بٹ باؤس جانا چاہتا تھا مگر سر سندر نے کہا کہ احتیاطاً ہم دو چار پولس اسٹیشنوں پر بھی اطلاع دیں
کہ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ نہ جانے پرکاں اپنی اس تیز مزاجی سے کیا کر دے گا کسی دن۔ دو چار اہم
اسٹیشنوں کو اطلاع دینے کے بعد دینتا اور پرکاں کی اس محبت کے انجام سے دل گھبرانے لگا۔ دن
اس بھاگ دوڑ سے ہم دونوں بہت تھک گئے تھے۔ صبح ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا لیکن ابھی
کو تسلی دے کر رخصت حاصل کرنے کا مرحلہ باقی تھا کیونکہ صرف ایک ہی دوپلا قاتوں میں ہم بہت
آپ آچکے تھے اور دینتا سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ کار باہر روک کر ہم نہایت مرل

پس خورشید ہائے جہاں اچھے سے ہیں چاہے وہ جہنمست نہ ہوں بلکہ ہوں کی اور مروت
یا کرتی ہوں۔ زندگی کسی بھی منزل پر انھیں پانے پہنچنے کی امید نہ ہو مگر پھر بھی ہم انھیں گلاب
و گلفے پھول کی طرح دیکھے جاتے ہیں۔ وہ گلاب کے کانے کی طرح دل کے آس پاس کھٹکتی رہتی ہیں،
چاہتا ہے وہ سامنے رہیں۔ ان کی باتوں کو سنتے رہیں بے معنی اور بے نکی سلی باتوں پر تعجب اور بڑی
باتوں سے بے تکلفی کا اظہار۔

موتوں کے ہاں کی حرکت بڑے۔ چنانچہ اس پر اس کی بے چینی سے ہمارے منظر ہو گا اور دینا
ساتھ نہ پا کر کیا کر بیٹھے۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا اور ہم دونوں اچھل کر پیچھے بڑھے، دیکھا
موسے پر بیٹھی تھی اور بڑے پیار سے بڑے انہماک کے ساتھ پر کاش کو لیک لکھاری تھی۔

”ارے! ہماری ملائت کا وقت ہو رہا ہے، میں بچ گئے۔“
”بچے دو۔“ پھر اس نے ایک ٹیکسی بلاتے ہوئے کہا۔

”برا مزہ آئے گا اگر میں دنیا کو چلیں سے اتر آیا تو نظر نہ آوں۔“ وہ چہرے لگا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔
پراکش کا قہقہہ نہیں رکا۔ میں جب اپنے ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو وہاں بھی جیسے پراکش کے قہقہوں کی
ٹپ کی نے لگا دیا تھا۔ وہ ہنسنے جا رہا تھا۔ سوئے وقت بھی مجھے جیسے ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہیں ایسا نہ
کہ دنیا کو چلیں کی میزھوں سے اتر آیا ہوا پراکش نظر نہ آئے۔ اس خیال کے ساتھ ہی جیسے کسی
پراکش کے قہقہوں کا ٹپ پھر لگا دیا۔

رات دھیرے دھیرے یوں بڑھ رہی تھی جیسے آوی کا اپنے اوپر سے اعتماد اٹھتا ہے۔

آج مجھے حیدر آباد میں بڑی سردی لگ رہی تھی۔ آپ سی آپ سارا بدن کاپ سا اٹھتا۔ ٹیکسی
کر کے باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ پراکش اور دنیا گھر جا چکے ہوں گے۔ ہوائیں ٹھنکی تھیں
گرمی اور محنت سی تھی۔ حیدر آباد کے اس بدلے ہوئے موسم پر مجھے تعجب ہوا، ابھی ٹھنڈی تھی اب گرمی
لگ رہی ہے۔ میرے موڈ کی طرح۔ مجھے پراکش کے مکان کا راستہ یاد نہ تھا۔ سرسبز کا فون خبر بھی
چکا تھا البتہ دنیا کے ہاٹل جا سکتا ہوں مگر تین برس ہو گئے ان سب سے ملے ہوئے اب تک تو دنیا
بچوں کی ماں ہوگی۔ اس ہاٹل میں کیوں رہنے لگی۔ میں بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا۔ کئی لمبیں آئیں اور
لوگ ان کی طرف بھاگے مگر میں آگے نہیں بڑھا۔ مجھے کہاں جانا تھا؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ
ہوئے اندھیرے میں بجلی سی چمکی، نہیں تارا سا ٹوٹا۔ نہیں شاید کبیں دور سڑک کے اس پار دنیا
رہی تھی بالکل اسی جیسی شکل و صورت۔۔۔ مگر ماری پیٹنے بڑی سنجیدہ سی بنی۔ شام کے دھندلے
ریڈیم کے موتی کی طرح چمکنے والی دنیا ہی ہو سکتی ہے۔ وہ میری طرف پیٹنے کے اپنی کسی اسٹوڈنٹ
ہائیں کر رہی تھی لیکن میں راستے سے گزرنے والی کاروں اور بسوں کی پروا کیے بغیر اس کی طرف یوں
جیسے ایک منٹ بھی دیر کی تو وہ خواب کی طرح فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔

”ہیلو دنیا۔۔۔“

”ہائے یوسف۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔؟“ کب آئے دلی سے؟۔۔۔ دنیا نے حسب عادت آنکھیں
پھیلا کر ہونٹ کھول کر مسکرا کے کہا۔ وہ عیش چہرے پر شدید تاثر پھیلا کے بات کرتی تھی مگر ایسا خلک اور
بغیر حقے کا استقبال دیکھ کر میں کچھ رکا نہ سکیا۔

”ایک مینٹ کے سلسلے میں آج صبح آیا تھا۔ سارا دن اسی میں مصروف رہا۔ اب میری شام ہے۔“

اسی تک سرسبز سے ملا ہوں نہ پراکش سے۔ اب اس میں تم سے معلوم ہو گا تو دونوں خفا ہو جائیں
ہاں وہ تو ہو گا۔“ آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ دنیا کافی بدلی سی لگ رہی
جیسے ان تین برسوں میں وہ کم سے کم دس برس اور بڑی ہو گئی ہو شاید اس لیے کہ میں نے پہلی بار اسے
اپنے پیٹے بٹو لگائے دیکھا تھا۔

پراکش کیسے ہیں۔۔۔؟“

”بالکل ٹھیک۔“ دنیا نے سر ہلا کے کہا۔ وہ کچھ دیر، میری طرف دیکھا اور پھر بس کہوئی۔ ”ہمارا ایک
ان کیا ہے اب۔“

”اچھا مبارک یہ کب ہوا؟“ میں واقعی بے حد خوش ہوا۔ ”تو آخر چیکو چیکو ہی شادی کی تم دونوں نے
کی خبر تک نہیں کی۔“ دنیا زرا سا مسکرائی پھر اپنا بڑا سا بیگ کانڈھے پر لٹکا کے کہا۔
”یوسف یہاں بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے تو لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ آئیے کینٹین میں بیٹھ
اچانے پیئیں۔“

”ہاں مگر پراکش کہاں ہیں، وہ حضرت تمہارے ساتھ نہیں ہیں آج۔۔۔؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھ
پر پوچھا۔

”ادھر۔“ دنیا نے حسب عادت منہ بنا کر جواب دیا۔ ہم دونوں کینٹین میں جا بیٹھے۔ دنیا گیم سی
کی شادی نے اسے کچھ سنجیدہ مزاج بنادیا تھا۔ اب اس کے لہجہ میں ایک سنجیدگی اور غمراہ سا لگایا
نہا۔

وہ بار بار میرے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

”یوسف بہت دنوں کے بعد تمہیں یہاں کینٹین میں دیکھ کر مجھے ایک بہت خوبصورت شام یاد آ رہی
ہے۔ وہ کوئی گانڈھیرے والا ڈنر جب ہم لوگ خوب ہنسے تھے۔“

”ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔“ میں ہنسنے لگا۔ وہ چمکی رات تو مجھے ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرح یاد تھی۔
میں اس وقت بھی یوں لگ رہا تھا جیسے ہم سب آج بھی اس شام کی پینٹنگ میں بیٹھے ایک فریم کے اندر
بڑے ہوئے ہوں اور کسی مصور کے پتلے ہلکے برش سے میرے اور پراکش کے اور دنیا کے نقوش
بہرے ہوئے۔

دنیا بھی جیسے اس شام کی ساری تفصیل اپنے ذہن میں جگ رہی تھی، اس نے آہستہ سے پیالی میز پر

رکھی۔

”کتنی اچھی شامیں تھیں وہ، ہم لوگ کتابتہ تھے۔“

”تھے۔“ میں دینیکا کے چہرے پر کچھ ڈھونڈنے لگا۔ دینیکا نے اب اسے تمہا کیوں چھوڑ دیا۔ پہلے لڑکیاں شادی کو بھی کسی فلم کا روٹائی منظر سمجھتی ہیں پھر جب فلم ختم ہو جائے تو حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پر کاش عاشق تو بہت اچھا تھا مگر شاید وہ اچھا شوہر نہیں بن سکا بھی تو آج دینیکا کے چہرے پر ہر بدلنے والے رنگ غائب ہو چکے تھے۔ وہ بات بات پر اس کا چنگلا رنگ دار قلعہ کہاں گیا جو اجالے کی ایک لکیر کی طرح دل کے اندر میرے میں چلا جاتا ہے اور بڑی دیر تک اس میں سے رنگین ستارے چمک کر بجھتے جاتے ہیں۔ مسلسل سی باتوں پر تعجب کرنا اور اہم باتوں پر بے پروائی کا اظہار۔ وہ سر ہٹا کر چائے کی پیالی میں چائے کا گھولے جا رہی تھی۔

”کیا تمہارے دو چار بار ہلانے سے اس میں مٹھاس نہیں آئے گی؟“ میں نے اسے پھینکنے کے لیے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ مجھے پیش کیا اور دوسرا اپنے منہ میں دبا کر لاٹا۔ ڈھونڈنے لگی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ دینیکا سگریٹ نہیں پیتی تھی۔ پر کاش کو عورتوں کا سگریٹ پینا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”اچھا بات کیا ہے؟ مجھے یوں لگتا ہے کہ اب تم کلاس روم میں سائیکالوجی پڑی سنجیدگی سے پڑھا رہی ہو۔“

”ہاں، مگر میں تمہیں سنجیدہ نظر آ رہی ہوں کیا؟“ اس نے حسب عادت بڑے تعجب سے پوچھا۔ ”حالانکہ اب مجھے سنجیدہ ہونا چاہیے۔ لیکن وہی اوٹیل پین، بچپن کے رنگین خواب اور ان خوابوں کی تعبیر پر اصرار یہ سب کیا حافقت ہے۔“ میں نے دیکھا دینیکا کے آس پاس دھوئیں کی ایک رسی سی لپک رہی تھی۔

”اور پھر تمہارا ساتھ بھی تو ایک بچے سے پڑا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بچہ۔؟“ اس نے سگریٹ کا دھواں اگل کر کہا۔

”پر کاش پھر نہیں ہے یوسف وہ تو بہت بڑا ہے، کئی صدیوں سے جی رہا ہے وہ۔“ دینیکا کے لہجے سے میں سمجھ گیا کہ اسے پر کاش سے کیا شکایت ہو سکتی ہے اس لیے میں نے بے پروائی سے کہا۔

”شادی کے سال بھر بعد سب مردوں کا یہی حال ہو جاتا ہے دینیکا ان کی دیوا لگی کم ہو جاتی ہے۔ رومانی

انہا جاتا ہے۔“

”دیوا لگی۔۔۔؟ رومانی شمار۔۔۔۔۔؟“ وینا بہت زور سے ہنسی۔

”تم پر کاش کے ساتھ بہت کم رہے ہو یوسف۔“

دوسرے دن شام ڈھلے میں نے پر کاش کے گیت پر کال ٹیل بجائی تو میں ایک بے پناہ خوشی سے سرشار ایک ایسی دلی مسرت سے جو اپنے کسی چہیتے دوست کا گھر بن جانے، اس کی محبوبہ سے اس کی شادی ہانے اور پھر ان دونوں کو اکٹھا دیکھ کر ہوتی ہے۔

آج میں پر کاش کے گھر پر کھڑا تھا۔ گیٹ کے ایک طرف ڈاکٹر پر کاش راؤ کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ دروازہ کھراں طرف سے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ فضا میں بجائے تھتے پھولوں کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ میں سو رگ ہے، میں نے سوچا، جس کی آرزو میں انسان مذہب اور سراج کے سارے کتنی نہیں ملے کر آتا ہے، کہاں کہاں بھٹکتا ہے مگر روح کا سکون، جسم کو آرام کسی ایسے ہی گھر میں ملتا ہے۔ دروازہ دینیکا نے کھولا۔ میک اپ سے عاری پیکا پیکا چہرہ اور ایک بد رنگی سی ڈھیلی ڈھالی یکسی پنپے۔۔۔ حالانکہ نئی شادی شدہ عورتوں کو خطہ ہوتا ہے شام کے وقت میک اپ کے تمام رنگوں کو چہرے پر کھلانے کا چیز کی نام ساریوں کو بدن پر چمکانے کا۔

”تمہیں گھر آسانی سے مل گیا؟“ اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”بعض وقت یہ گھر بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں اور موٹر بہت ہیں نا اس لیے۔“ صاف ستھرے بڑی نزاکت اور نفارت سے ہانے ہوئے ڈرائنگ روم میں مجھے لا کر وہ میں قالین پر کھڑی ہو گئی اور دلی مسرت سے کہا۔

”یہ پر کاش کا گھر ہے۔ میں نے بڑی محنت سے سما یا ہے۔ اچھا لگتا؟“

”واہ کیا کہنے بنتی! تم دونوں کو دلی مبارکباد کہ آخر کار پر کاش کا گھر بن گیا مگر یہ حضرت کہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ کیا بچہ سے باہر نہیں نکلتے؟“ اچانک دینیکا جیسے کسی پتھر کی ضرب سے اچھل پڑی پچھ بٹی اور میری طرف پیچہ کر کے واز کے پھولوں کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں انھیں بھی گھر میں ہونا چاہیے تھا۔ نہیں ہیں۔“ ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب ہم کسی دکھ کی خوشبو آپ ہی آپ سونگھ لیتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ دینیکا کے گھر میں مجھے اتنی زور سے نہیں ہنسا چاہیے اور پھر اچانک جیسے کسی کردار کے احساس کو لیے میں بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ صوفے پر بلائک کی باسکٹ میں سرخ اون کے گولے پڑے تھے۔ اور ایک لمبی سی آستین ایک چمچ کے سویٹر میں بدلنے والی تھی۔ ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ایک سستا رومانی ناول بھی پڑا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھنے کے

دونوں ہاتھ اپنی گردن میں لپیٹ کر ایک کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
 "پر کاش کا صوفہ میں نے ایسی جگہ رکھا ہے کہ شیشے سے باہر لان کا سارا ویو نظر آتا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ پر کاش کی جگہ مقرر کردی۔" بے ساختہ قہقہے لگانے کا میرا موڈ ہو گیا مگر صرف مسکرا کے رہ گئی۔ پھر وہ انھی اور نیپ ریکارڈز آن کر دیا۔ روی شکر ستار پر جانے کوئی اداس منہ بجانے لگا اور میں جیسے سہم سا گیا پھر میں نے دینیا کی طرف دیکھ کر کہا۔
 "خوش تو ہونا۔"

"ہمت۔۔۔" دینیا نے جواب میں کہا۔ "خوش نہ ہوں گی بھلا؟ تمہیں ایسا شہ کیوں ہوا یوسف؟" وہ میری طرف گہرا کر دیکھنے لگی۔ اس کی آواز میں جانے کیوں بھٹے بھٹے سا طرنگ، صرف میرے ہی لیے بلکہ اس پوری فضا پر جس کا میں اس وقت ایک حصہ تھا۔ دینیا اپنی میسکی کی سلوٹیں صاف کر رہی تھی اب مجھے خیال آیا کہ اس بچے نے کمرے کے سارے رنگ و دینیا کی بد رنگ میسکی نے چھیکے کر دیے تھے۔ بار بار میرے سامنے سے دینیا کا چہرہ کھوجاتا، اس کی بد رنگ میسکی پھیل جاتی۔
 "تم غور نہیں بڑی دھن کی بچی ہوتی ہو۔ میں جانتا تھا کہ اب تم پر کاش کو زندگی بھر چھوڑنے والی نہیں ہو۔"

"مگر پر کاش ایسا نہیں سوچتا تھا۔" اس نے چھوٹی سی اون کی آستین کو اوڈھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اون کو انگلیوں پر لپیٹنا شروع کر دیا۔

"گہرا رائے میری بات پر۔؟" اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔ "تم ہمارا گھر دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہو تو بس خوش ہی رہو کیونکہ آج کل دنیا میں خوشی بڑی نایاب شے ہے اس لیے اگر کوئی خوش ہے تو اسے خوش رہنے دو سب سے بڑی نیکی ہے۔" وہ ہاتھ سے آستین کا سا زنا تپتے ہوئے بولی۔

"لیکن تم لوگ تو ابھی مہن ہون بیٹھ میں ہو۔ ابھی سے خوشی اور غم کے مسائل پر غور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے غور سے دینیا کو دیکھا اور سگریٹ نکال کر سلگائے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے دینیا آج بات کئے سے پہلے اسے تول رہی تھی۔ بعض باتیں تو وہ صرف تولی رہ جاتی، بول نہیں پاتی تھی۔
 "پر کاش کہاں ہے۔۔۔؟" اس میں نے آٹا کر پوچھا۔

"وہ ہے۔۔۔" میں نے جلدی سے گردن پھیر کر دیکھا۔ دیوار پر پر کاش کا ایک بڑا سا پورٹریٹ لگا

نمونہ

ایک پرانا اور ادیب بہت ہی مہموت تھا۔ ایک دن وہ تھا
 اٹھا کھڑا کہ صحت کس کے پاس کاٹی اور کہنے لگی۔ مجھے کپ سے
 ہے، ذرا تھوڑی دور میرے ساتھ چلیے۔
 شاعر غنی تھی اس کے ساتھ چلیا۔
 صحت ایک سنا کر کان پر جا کر کھڑی رہتی اور ہمارے ہولہ
 ہولہ سن کر صحت ہنسی لگی۔
 خاصہ بچا تھا۔ گلیا جس نے سنا سے بچا۔ کیا سنا ہے؟
 سنا سے جواب دیا۔ اس صحت سے مجھے ایک گڑب گڑا اڑا
 لگا کہ میں اس فضا کی تصریح کر دوں۔ میں نے کہا کہ میں کیا دیکھتا
 ہوں کہ ہے؟ یہ کہہ کر وہ بھی ادیب کر رہے سنا تھا۔ آؤ۔
 مصلہ، ڈاکو اٹھا، اڑھتہ چلی کر رہی

دوشیزا

"میں اس صحت کو ملا کر دینا چاہتا ہوں۔" پریشان حال
 تھوڑے بہتات میں کہا۔ صحت خواب گاہ میں گری پڑے پر
 مصرعے خواب گاہ میں اس قدم پر پہنچا ہوا ہے کہ اس کی ایک
 کلمے کے لیے دواں نہیں رہ سکتا۔ اب میں یہ بڑا بڑا وہ صحت تک
 برداشت نہیں کر سکتا۔
 مجھے سنا تھا۔ بڑا واقعی بہت بڑی بات ہے یہیں
 کیا تم ایسا نہیں کر سکتے؟ خواب گاہ کی ایک کون کھل دوں گا
 کہ میں بوم ہر جانے؟
 کیا؟" شہر چنچ اٹھا۔ اگر میں کون کھل دوں تو کیا
 میرے سارے کبر و اڑھتہ باقی رہے؟

اب چہرے پر بال بکھرے ایک ابرو اٹھائے وہ اپنے مخصوص اشارے سے مسکرا رہا تھا۔ دینیا قہقہہ مار کے
 لی پڑی۔

"ڈور گئے۔۔۔؟ پر کاش کو اس کمرے میں دیکھ کر ڈور گئے کیا۔؟" دینیا کے قہقہے پر میں چنچ چنچ
 گیا۔ اس بو جھل سی گھٹی گھٹی رات میں مجھے دینیا کی یہ آواز اجنبی سی لگی، جس کا نام نہیں تھا۔

اب میں ایک ایسی فضا میں پہنچ گیا تھا جہاں بہت سی باتیں اجنبی لگتی ہیں یا کچھ بھی اجنبی نہیں لگتا۔
 یہی بات سوچتے کہ جب گھر کا ایک اہم فرد اچانک غائب ہو کر کسی دیوار کے فریم میں کیل سے جڑا ہوا نظر
 نے تو ایسی مصلوب فضا میں دم نہیں کھٹے گا، روی شکر جس دھن کی دورت پر پہنچ گیا تھا، اس میں
 لمبے ہی شکوے تھے، شکایتیں اور توانی کا دکھ۔ بس ایسا ہی کوئی روگ تھا جس کی مجھے پہچان نہیں ہو رہی
 لی۔

"نہیں،" امید فضول ہے کہ آج پر کاش ویر سے آئے گا۔ وہ کسی دوست کے ہاں گیا ہے۔ ابھی لوٹ
 لے گا۔" یہ کرا اس کا منتظر نہیں تھا اس لیے دینیا نے پر کاش کے وجود کو ایک کیل سے دیوار پر جڑ دیا تھا
 اور مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"انتظار کرو تا اپنے دوست کا آتے ہوں گے۔"

"مگر میں تنہا تک اس کا انتظار کروں!" میرے دل کی بات جیسے دینیا نے سن لی اور وہ اچانک جیسے
 دترار ہو کر انھی اور اون اور بایکت زمین پر گر گئی۔ وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی میسکی سمیٹ کر کھڑکی کی طرف

”تم یہاں تنہا بیٹھے ہوئے مجھے اچھے نہیں لگ رہے ہو یوسف، میں نے تمہیں ہمیشہ سرسند اور ہنسنا کے ساتھ ہی دیکھا ہے نا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم آج ہی شام کو آرہے ہو تو میں تمہارے لیے ان دو کو کیس سے ڈھونڈ لاتی۔ تم نے آنے سے پہلے مجھے رنگ کیوں نہیں کیا؟ اب تک تم تینوں مل کر ایک قہقہے لگا لیتے نا!“

”میرے لیے۔۔۔؟ میرے قہقہوں کے لیے۔۔۔؟“ میں صرف یہی بات سوچتا رہا۔ دینیتا جواب دیتا۔ پھر ایک ادھیڑ عمر کی آیا اندر آئی۔ دینیتا نے مجھ سے پوچھا۔

”اکیلے بیڑ پیتے ہوئے بور تو نہیں ہو گے؟“ اس نے میرا سگریٹ کیس اٹھایا اور میرے پاس سگریٹ سلگانے لگی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”اوہ۔۔۔ کیا اکیلے اکیلے کی رٹ لگائی ہے تم نے؟“ میں جھنجھلا کر کہا۔ ”سچی بات تو یہ ہے دینیتا میں تمہیں اکیلا دیکھ کر سخت بور ہو رہا ہوں۔ تمہیں ایک بات سناؤں۔“ میں نے اس وقت کی بو جھل لیا کو بدلنے کے لیے کہا۔ ”جب سب سے پہلے سرسند نے تم دونوں کا تعارف کرواتے وقت کہا تھا کہ پرکاش ہے اور یہ دینیتا تو میں نے سوچا تھا کہ سرسند کو بچ میں ”اور“ لگانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تم دونوں بہت قریب تھے۔“ میری بات سن کر دینیتا خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے جلدی سے سگریٹ الٹا لٹا کرے میں مل دیا۔

”ج؟“ تم نے ایسا سوچا تھا۔ تو یہ بات پرکاش کو بھی بتانی تھی!“ اتنے میں آیا بیڑ کے دوگ ایک ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ ٹرے اس نے پٹائی پر رکھی تو میں نے دینیتا سے کہا۔

”تم بھی ساتھ دے رہی ہو کیا۔۔۔؟“

”میں۔۔۔؟“ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر تعجب سے کہا۔ ”آئی ایم ویری سوری۔۔۔ میں نہیں جانتی۔ یہ دوسرا گلاس تو پرکاش کے لیے بنوا دیا ہے۔ شاید آجائے وہ مجھے بڑی تلاش کے بعد اس کے لیے ابھی شراب لا کر رکھنا پڑتی ہے۔“ میں نے غور کیا کہ دینیتا جب یہ کہہ رہی تھی تو آیا بڑے غور سے دینیتا کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں اب پرکاش کو آنا چاہیے۔“ میں نے گھڑی دیکھی۔ ”دس بج رہے ہیں کیا روز اتنی ہی دیر آتے ہیں۔؟“ میں نے بیڑ چکھی۔ اس کا مزا بالکل پھیکا تھا جیسے دینیتا نے اپنی اداسی اس میں گھول دی ہو۔ ”یہ مت پوچھو یوسف۔“ اس نے دونوں ہاتھ مل کر صوفے کی پشت پر سر ٹیک کر کہا۔ ”میں پرکاش کا

آتے۔ میری بجائے کوئی اور عورت ہوتی تا تو پاگل ہو جاتی اب تک۔" اس بار وہ اپنے بننے والے اس نہیں روک سکی۔ دینیتا کے آنسوؤں سے میں ڈر گیا اور پھر اس کا موبڈلے کے لیے کہا۔
 "تو آخر دنیا پا کاش نے تمہیں اپنی دھرم بتائی۔"

"وہ پلیز ایسی بات مت کہو یوسف۔" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے دکھ سے کہا۔ اب مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن مجھ میں ایک ایسی حرارت آگئی تھی جو صرف پینے کے بعد ہی آتی ہے اس لیے میں نے بیڑ کا گلاس میز پر رکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"پکاش کی کیا مصروفیت ہے۔۔۔۔۔" دینیتا سرگرم سے سلگنے لگی اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری بات کا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔
 "تو اس کا مطلب یہ ہوا دینیتا کہ تمہیں پکاش کو باندھنے کا گھر نہیں آیا، حالانکہ یہ گر شادی کے بعد اس لڑکی کو خود بخود آتا ہے۔"

"شادی کے بعد۔۔۔؟" دینیتا نے تعجب سے پوچھا اور پھر سرگرم کی راگ ایش ٹرے میں جماؤ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے۔۔۔ کیونکہ اسے جیسے جیسے دم ہلاتے ہوئے چلنا آتا ہے یہ بات جانتی ہوں۔"

"کس کے جیسے۔۔۔؟" میں نے گلاس اٹھا کر دینیتا کو غور سے دیکھا تو پھر میری بات کا جواب تو نہیں دیا۔
 "میں نے گلاس اٹھا کر دینیتا کو غور سے دیکھا تو پھر میری بات کا جواب تو نہیں دیا۔"

"میرا خیال ہے اب میں آیا کو مچھل تلنے کے لیے کہہ دوں۔ تمہارا کیا خیال ہے! اب پکاش کو آگیا چاہیے یا نہ؟"

"یقیناً۔۔۔ گیارہ بج رہے ہیں نا۔۔۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ دینیتا کچن میں گئی اور سوئی ہوئی آیا کو اٹھا کر مچھل تلنے کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا وہ پریشان سی تھی، گھر میں ایک مسمان آیا تھا۔ شاید اس لیے اس کا بیچہ چاہ رہا تھا کہ آج پکاش جلدی سے آجائے۔ واپس آکر ان کی بیٹی ہوئی تھی اس آئین میں نے تلنے پر رکھی اور بڑے پیار سے اس پر ہاتھ بھیرنے لگی۔ شاید اس کو سیر کر پھرنے والا جلدی ہی اس گھر میں آنے والا تھا، یہ بات پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مچھلی کی ہموک لگانے والی خوشبو سے ڈرائنگ روم بھر گیا۔ دینیتا کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر بولی۔

"ہرچیز ٹھنڈی ہو جاتی ہے ان کے انتظار میں، بس انتظار کیسے جاؤ ان کا۔" میں نے غور سے دیکھا۔

دینیتا دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہو رہی تھی، جیسے اگر ہی کا آخری سڑا جانے کا پچھلے سے راکھ بن جاتا۔ دینیتا کے چہرے کی شادابی اس کے قہقہے اور اس کے بدن کی رعنائی ہر چیزوں مرتبہ ہی تھی جیسے لی پورے کو لوگ پانی دنیا بھول گئے ہوں۔

اب مجھے دینیتا کے کمرے میں وحشت ہونے لگی۔ شاید اور تھوڑی دیر میں وہ بیٹھا تو میرا دم گھٹ جائے

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں دینیتا۔" میں نے سرگرم کیس اور لائٹ اٹھا کر کہا۔ "پر سوں تو دہلی واپس آ رہے۔ کل شام کو رسی سے باندھ کے رکنا۔ میں تمہاری مچھلی کھانے ضرور آؤں گا مگر مٹھائی پہلے کھانا۔" میں کرسی سے اٹھ رہا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔

"یہ الگ مصیبت ہے" اس کالونی میں آئے ان لائٹ چلی جاتی ہے۔ "مگر مجھے گپ اندھیرے میں بھی لایا ہوں نظر آ رہی تھی جیسے ریڈیم کا مونی چمک رہا ہو۔
 "موم بتی لے آئی؟" کہیں سے آیا کی آواز آئی۔
 "نہیں ضرورت نہیں ہے۔" دینیتا نے کہا۔

"یوسف! بعض وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے اندھیرا ہی پناہ ہے۔ ہم اپنی بہت سی خوش فہمیوں کو اندھیرے میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اچالا تو خواب بھی چھین لیتا ہے ہم سے۔"

"مگر اندھیرا تو دھوکا دیتا ہے دینیتا، خوابوں سے کب تک کوئی بھل سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ دینیتا نے نیا سرگرم سلگایا۔ ایک لمحے کو لائٹ کا شعبلہ اس کے چہرے پر پڑا اور پھر بج گیا۔

"تو پھر زندگی میں اور کیا ہے! حقیقت کو مٹنی رکھتے ہے کیا؟ ہر دانشور حقیقت کی تلاش کرتے کرتے لڑکھاؤی فائدے میں رہے۔ جنہوں نے اپنے آپ کو بھلانے کے لیے کھلونے سامنے رکھ لیے، جیسے ایک مولی یا بچی کا فکری کتروں سے ایک چھوٹا سا گھر بناتی ہے اور گڑیا کی بجائے خواہش میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر پھر میں اس کے بچوں سے گھر بھر جاتا ہے بچے ہی بچے۔۔۔ سارے گھر میں۔ ساری کالونی میں ساری لائٹیں اور پھر۔۔۔ پھر اچالا ہو گیا۔۔۔ اچاکا مرکزی لائٹ نے دینیتا کو چپ کرادیا وہ بار بار آنکھیں پونکے بڑی مشکل سے اچالے کو قبول کیا۔

"اچھا تو اب اجازت دو دینیتا۔" اس نے کچھ نہیں کہا۔ سوئی ٹرکی چھوٹی سی ادھوری آئین پر ہاتھوں سے استری کرتی رہی۔ "اب تم بھی سو جاؤ جانے کس اہم کام میں اٹھ گئے ہیں پکاش۔"

"ہاں جانے کس کام میں اٹھ گئے ہوں گے۔ گڈ نائٹ یوسف۔ میں دراندازے میں آیا تو چاروں طرف

سے اس خوشبو نے پھر گھیر لیا جو اس گھر میں سورگ کی یاد دلاتی تھی۔ گھرے اندر میرے مایوس گھر کے اونچے اونچے درخت چاروں طرف سے دنیا کو گھیرے کھڑے تھے۔

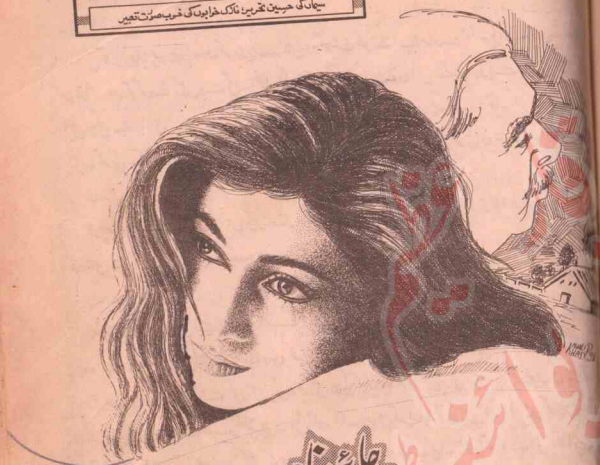
بہت دور جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے سورگ کی کھڑکی میں ریڈیم کے موتی کی طرح چمک رہی تھی جیسے کارڈ بورڈ کے ننھے سے گھر میں ایک گڑیا بیٹھی ہو۔ پتا نہیں پرکاش کی کیا مصروفیت ہے اب! ابھی تک گھر میں بند رہنے سے وحشت ہوتی ہے تو دنیا کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتا؟ شادی کے بعد اس کی بے پروائی؟

کل میں پرکاش کو اس بات پر خوب ڈانٹوں گا۔ میں نے دنیا کو اپنے ہوٹل کا پتا بتا دیا تھا، اس لیے میں سارا دن منتظر رہا کہ پرکاش دنیا کے ساتھ ہسٹا کا میرے پاس آنے کا اور پھر سب مل کر کہیں مکمل لکھا میں قہقہے لگائے چلیں گے مگر شام ہو گئی۔ میرے دل پر جانے کیوں اداسی کی بارش سی ہوئے گی۔ شادی کے بعد پرکاش کو شاید یہ پسند نہ ہو کہ میں پہلے والی بے تکلفی کو قائم رکھوں، پھر میں کیوں جاؤں اس گھر! سریندر کو کئی بار فون کیا لیکن وہ اس وقت آیا جب میں ایئر پورٹ کے لیے عیسیٰ میں بیٹھ چکا تھا راستے میں خوب گپ بازی ہوئی اور جب مسافروں کو پلین میں بیٹھ جانے کی ہدایت مل گئی تو میں بریف کس اٹھایا اور اپنے دل کے اوپر سے ایک بھاری پتھر پھانسنے کے لیے کہا۔

”سریندر! اس بار پرکاش سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں پتا اس کے ہاں گیا تھا مگر بتا رہی تھی کہ بڑی رات گئے گھر آتا ہے وہ۔“

”رات گئے۔۔۔؟“ سریندر بڑی زور سے ہنسا۔
 ”دنیا بچاری تو پاگل ہو گئی ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم ہوا، پرکاش سے دنیا کی شادی نہیں ہوئی۔“
 ”کیا۔۔۔؟“ میرے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹ گیا پھر میں نے اسے دوبارہ تھام کر پوچھا۔
 ”یہ کیا کہہ رہے ہو سریندر؟“

”ہاں! جتنی ڈھائی برس ہوئے۔ پرکاش تو یورپ میں ہے سنا ہے کسی آوارہ امریکن لڑکی کا بچہ ہے۔“
 ”تو اس نے امریکن لڑکی سے شادی کر لی؟“
 ”اب یہ مجھے نہیں معلوم۔“ سریندر نے حسب عادت سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے امریکن لڑکی سے شادی کر لی ہے ابھی اسے ساتھ لیے کھلی فضاؤں میں اڑتا پھر رہا ہے۔“



جائے پناہ

جب وہ بچہ کھڑکری گئی تو اس نے سہارے ڈھونڈ لیے گھر سے نکال جانے والی لڑکی کو کہا، ”بی بیوں کے لیے خوب صورت تدبیر“

اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اپنی کی زبان سے کہی اس کے لیے یہ الفاظ بھی ادا ہو سکتے تھے درحقیقت اور کیسی بیگم تھی ان الفاظ میں!
 نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

”کیا یہ گھر میرا نہیں تھا۔“ ہمارے بیٹے جیسی آنکھوں کے ساتھ سوچا۔
 اس گھر کا مالک صرف اپنی تھا۔ ”ہاں! میں بھی آ سکتا ہوں۔“
 ”گھر میں چھوڑ آئی وہ میرے پاپا کا تھا اور جس گھر میں بیاد کے آئی وہ افتخار کے باپ کا تھا تو پھر میرا

گھر کون سا ہے؟“ اس کے دل میں ایک درد سا اٹھا۔ ”میں کہاں جاؤں؟ اپنی کے گھر سے نکل کے کہاں جاؤں؟“

اس کا بیچا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے لیکن وہ گھونٹ گھونٹ اپنے سارے آنسو بیگنی۔ اس نے کہا تھا کہ خود گھر نہ نہیں دے گی۔ افتخار اگر اسے ٹھکرا رہا ہے تو وہ اس کے قدموں سے لپٹنے کی نہیں اور اپنی بڑی بے نیازی سے اس کی جانب پیٹھ کیے کھڑی میں کھڑا سرٹ پھوٹ رہا تھا۔ کمرے میں وہ تھی۔ کھڑی کے باہر اندھیرا تھا اور اندر اور باہر کے درمیان کھڑا ہوا افتخار کچھ زیادہ ہی طویل القامت رہا تھا۔

انچو اور صحت مند افتخار جس کی پہاں میں چلتے ہوئے ہا کو پیشہ ایک بھرپور تھنڈا کا احساس ہوا لیکن وہ کیسی بے آسرا ہو گئی تھی۔ ایک دم سے اکیلی اور بے سارا۔

اسے یاد آیا۔

آج سے تین برس پہلے اس کی ماں نے اسے گھر سے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”بیٹی! آج ہمارے لیے پرانی ہو رہی ہو اب وہی گھر تمہارا ہے جس میں تم بیاہ کے جا رہی ہو۔“ وہ ہنسیاں درمیان ماں کے شانے سے لگی ”اس کی رندی ہوئی کیکیا کی آواز سن رہی تھی۔“ شریفیوں کی بیٹیاں گھر جاتی ہیں وہاں سے مرنے لگتی ہیں بیٹی! اور نیک بیٹیاں گھر بسا کر لیتی ہیں! اجاڑ نہیں کرتیں۔“

”ہی۔“ اس نے ہونٹ سمجھنے کے دل سے لٹکی آہوں کو جذب کیا۔ ”خدا گواہ ہے اسی تمہاری شرافت اور نیکی میں کوئی کھوٹ نہیں۔ ہمارے خاندان کی عزت کو اچھالے گی نہیں۔ وہ تمہارے اعتماد کو نہیں نہیں پچھائے گی لیکن وہ گھر سے نہیں اسی وہ خود کو ذلیل نہیں ہونے دے گی۔“ وہ اپنا سامان سمیٹتی رہی۔ اپنی ماں کے دیے ہوئے کپڑے زیر اس نے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر جانے کو تیار ہو گئی۔

اسی لمحے ہا کے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش افتخار آگے بڑھ کر اسے روک لے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ اپنی دیے ہی اس کی طرف پشت کیے کھڑی میں کھڑا رہا۔ وہ دروازے سے نکلی اور گھر سے نکلتی ہوئی گھٹ پر پہنچ گئی۔

گیٹ سے باہر نکلے ہوئے اس نے آخری بار واپس کے دیکھا۔ ”اندربدستور خاموشی تھی۔ وہ اداس اور افسردہ جو حمل قدموں سے سڑک پر نکل آئی۔

جتنی دیر وہ رکشا کے انتظار میں وہاں کھڑی رہی اس کے دل میں امید کے سامنے کانپتے رہے شاید

بچے کی ہر پچھتاہٹ اور اسے منانے کے لیے آجائے لیکن وہ نہ آیا۔ کھڑے کھڑے ہا کے پاؤں درد نے لگے۔ جی چاہتا تھا رکشا آئے اور وہ اسے گزر جانے دے۔ جیسے بجے تک یوں ہی کھڑی رہے پھر وہ اور.....

”نہیں۔“ نہیں یہ تو میری توہین ہے۔“ اس نے ہونٹ دانتوں میں دبایا اور پھر ایک گزرتے ہوئے خالی ٹاکو ہاتھ دے دیا۔

افتخار نے اپنی پشت پر اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی لیکن یوں ہی کھڑا رہا۔ سوچ رہا تھا۔ وہ بے جا تے ہوئے مخاطب کرے گی۔ ایک ہلکی سی امید اس کے دل میں کانپ رہی تھی کہ وہ اس کا نام کرے گی اس سے کہے گی۔ ”جیسا جا رہی ہوں۔ پیشہ کے لیے تمہارے گھر سے۔ اس نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی میں آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لوں گا۔

”نہیں نہیں۔ یہ میری توہین ہے۔ ہا کو نہیں چاہیے تھا کہ اس طرح گھر چھوڑنے کو تیار ہو جاتی۔ مگر اب بھی اپنی زبان سے ایسے الفاظ آوا نہیں کرنے چاہیے تھے۔“ وہ عجیب الٹ پلٹ سوچوں میں گرفتار تھا آخر تک غیر ارادی طور پر ہا کے کچھ بولنے کا شکر رہا لیکن وہ چپ چاپ جلی جاتی تھی۔ افتخار نے پلٹ کے بے جا تے ہوئے دیکھا پھر غصے میں سرٹ مٹ مٹ کے کھڑی سے باہر پھینک دیا۔

”اس کی نظر میں میری کوئی وقت نہیں۔“ اس نے دانت سمجھنے کے سوچا۔ ”ٹھیک ہے۔ جاتی ہے تو بے جا بھی سمجھی اسے لیے نہیں جاؤں گا۔“

وہ غصے میں بھرا کمرے میں ٹھکرا رہا پھر نیک کی کوئی خیال آیا۔ آستین ہٹا کے کھڑی دیکھی۔ جیسے جیسے میں رہ تھیں۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

شاید وہ رکشا کے انتظار میں سڑک پر کھڑی ہو۔ اس نے سوچا لیکن گیٹ سے باہر نکلا تو سڑک سنسان بن چکی۔

اس نے گاڑی نکالی اور سیدھا میٹنگ میں چلا گیا۔ واپسی خاصی دیر سے ہوئی۔ سارے راستے وہ ہا کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ آخر وہ کہاں گئی ہوگی اپنے بھائی! خالہ یا چچا کے گھر۔ یا پھر سیدھی اپنی ماں کے ہاں کراچی۔ لیکن اس وقت تو اسے گاڑی بھی نہیں ملی ہوگی۔ ہو سکتا ہے جب وہ واپس گھر پہنچے تو ہا وجود نہ ہو۔ گھر کی وہ پیشہ وہ چاہیاں رکھتے تھے۔

ایک مہینہ سی امید کے سارے اس نے گاڑی گھر کے سامنے روکی لیکن گیٹ پر تالا دیے ہی لگا ہوا۔ اس نے گاڑی سے اتر کے جھکے جھکے قدموں کے ساتھ تالا کھولا پھر گاڑی میں بیٹھا اور اسے پورچ

میں پھنسا کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دل کی حالت عجیب سی تھی۔ کبھی خود اپنے آپ پر غصہ ہوتا اور کبھی ہمارے اوپر طیش آنے لگتا۔

رات کا کھانا کچن میں تیار رکھا تھا لیکن اس کا کھانا نہ کوئی نہ چاہا۔

”جائے وہ کہاں ہوگی۔“ بابا رے یہ خیال افکار کے ذہن میں آجھکتا۔ ”اگر اسے کراچی کی گاڑی ملے

لی ہوگی تو یقیناً وہ لاہور ہی میں ہوگی۔ اپنے کسی رشتے دار کے گھر گئی ہوگی لیکن کیا اس طرح ہماری

ہجائی نہیں ہوگی۔ اس نے سوچا۔ ”ہمارے ایسی بے سببی کی امید تو نہیں۔ ضرور اس نے کوئی بہانہ بنا

ہوگا“ کہ میں اچانک انہی کی طرف چلا گیا ہوں یا پھر دفتر کے کسی کام سے دوسرے شہر۔ کچھ بھی۔

اس نے اصل بات کسی کو نہیں بتائی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کے گھر نہ گئی ہو

کسی سہیلی کے پاس چلی گئی ہو۔ رشتے داروں سے زیادہ آج کل کی سیلیاں ہی لڑکیوں کی نگہباز

ہیں۔“ اس نے سوچا۔ صبح ہوتے ہی وہ اس کی قریبی سہیلیوں الماس اور رخشندہ کے گھر فون کرے گا۔

لیکن وہ انھیں کہے گا کیا ہے۔ یہ کہاجھے سے ناراض ہو کے چلی ہے اور آپ کی طرف تو نہیں آئی کہ

پہلے گھر میں نہ ہوئی تو وہ دوسری جگہ پوچھنے کا اور پھر یہی کہے گا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا چاہے

اس طرح تو ہماری بڑی رسوائی ہوگی۔ مجھے اصل بات کسی کو نہیں بتانا چاہیے۔ میں بہانے سے پتا کر

گاں سے۔ اس طرح کہ انھیں اصل بات کا علم بھی نہ ہو اور پچھنے پر بھی چل جائے کہ ہمارا وہاں

یائیں پھر اگر وہ لاہور میں کہیں نہ لی تو وہ کراچی اس کے بھائی کو فون کرے گا ہمارا بھائی سلیمان

آدی تھا اسے یقین تھا کہ اگر ہمارا وہاں ہوئی تو اس کی موجودگی کو پوشیدہ نہیں رکھے گا۔ ہو سکتا ہے ہمارے

وہاں بھی اصل بات نہیں بتائی ہو۔ رسی بات چیت کے دوران سلیمان ضرور ہمارا ذکر کرے گا اگر

ہوئی تو بھی اس کی باتوں سے پتا چل جائے گا۔ دیے اسے امید تھی کہ وہ ضرور اپنے کسی نہ کسی رشتے دار

کے گھر گئی ہوگی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سہیلی کے گھر گئی ہو تو وہ لوگ کل ہی اسے سمجھا بھگا کے واپس پھو

جائیں۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی اور سونے کا کام کو ختم کرنے لگا۔

صبح اٹھ کے اس نے الٹا سیدھا ہانشتا کیا اور آفس پہنچ گیا۔ کام میں بالکل دل نہ لگا۔ اسے ہمارا ایک

ایک بات یاد آ رہی تھی۔ چھوٹی موٹی نوک جھونک تو ان میں اکثر ہوتی رہتی تھی اور ایک دوسرے کو

منانے میں لطف بھی بڑا آتا تھا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی بات پر ناراض ہو کر وہ دونوں ہی اڑ

گئے ہوں۔ ہمیشہ وہ اپنی غلطی کا احساس کر جاتے تھے اور جس کی بھی غلطی ہوتی وہ دوسرے کو مٹالیتا۔ عام

سے ہمارے جانتے بوجھنے کے خطا ہر صورت میں افکار کی تھی اس پر احسان جتاتے ہوئے اسے خود ہی

نی کر لے وقت وہ ہمیشہ کم کرتی تھی۔

دیکھو۔ مجھے مجازی خدا سمجھ کے خطا معاف کیے دیتی ہوں لیکن چڑھ مت جانا۔ تمہاری غلطی پر ہمیشہ

منایا کروں گی۔“ اور اسے ہمارے ہاتھ پیر آجاتا، لیکن ایسی سختی ان میں تین برس کے عرصے میں

بارہوئی تھی۔ ہمارے کبھی اس طرح ایسی سے گرم ہو کر بات نہیں کی تھی۔ اس نے ہمیشہ اس کی عزت

کی۔

لیکن ایسے الفاظ میں نے بھی تو پہلے کبھی ادا نہیں کیے تھے۔“ اس نے سوچا۔ ”مجھے چاہیے تھا کہ اس

لے کو برداشت کر لیتا لیکن میں بھی کیا کروں!“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ ”میرا داغ خود

تھا۔ ہمارے احساس بھی نہیں کیا کہ میں تھکا ہوا آیا ہوں۔ ذہن پریشان ہے مگر اسے بھلا کیا پتا کہ

میں بیگ صاحب سے جھڑکنا ہو چکا ہے اور پھر بھول تو ہر انسان ہے ہوا بھی کوئی قزیشہ

تھی۔ وہ مل جائے تو میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ افکار کے غصے کی برف خاصی پگھل چکی تھی

بروز فون اپنی طرف کھسکا کر ہمارا عزیز سہیلی رخشندہ کے شوہر کا نمبر ملانے لگا۔

ایلو علی بھائی۔ جی ہاں۔ بالکل خیر ہے۔ آپ سنا ہے۔ ہاں۔ جی ہاں۔ خدا حافظ۔“

اس نے دھیلے دھالے ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا۔ ہمارا رخشندہ کے ہاں نہیں تھی۔ ”ہو سکتا ہے علی چچا

مگر میں علی جیسے سنجیدہ آدمی سے یہ امید ہرگز نہیں کی جاسکتی۔“

پھر سوچ کے اس نے ہمارا دوسری سہیلی الماس کے گھر فون کیا اگر ہمارا وہاں ہوئی تو شاید وہی فون اینٹیز

ہے لیکن کتنی جتنے ہمارے الماس نے خود ہی فون اٹھایا۔

ابھی کون صاحب؟

میں افکار۔ کیا حال ہے الماس ٹھیک تو ہو۔“

ابھی بالکل۔ ابھی بھائی میں خود آج آپ کو فون کرنے والی تھی۔“

افکار کا دل دھڑک اٹھا۔

”دراصل میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”کہ ہمارا ساتھ لے کر انارکلی جاؤں۔ اس

کہہ دیکھئے کہ میں ایک دو دن میں آؤں گی فون کروں گی ایک دن پہلے کہ کہیں جائے۔“

”اچھا۔ اور آئی اور انکل کا کیا حال ہے۔“

”سب ٹھیک ہیں۔“

”کیسے یاد آگئی؟“

”یاسیوں ہی بیٹھے بیٹھے خیال کیا کہ تمہارا حال ہی پوچھ لوں۔ ہمارے بھی کہا تھا۔“

”شکریہ جی۔“

”اچھا۔ اجازت خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

ریسپورڈ کرپٹل پر رکھے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ الماس کے لمبے میں شوفی کیوں تھی۔ ہو سکتا ہے اہا اس کے پاس ہی کھڑی ہو۔ وہ پر امید ہو گیا۔

اگر ہمارا الماس کے گھر ہوئی تو اس کے والدین اسے ضرور سمجھا بھگا کے واپس گھر چھوڑ جائیں گے۔ بے چینی سے گھر جانے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن شام کو گھر پہنچا تو ٹیٹ پر ویسے ہی تالا لگا ہوا تھا۔

گھر دیر نہ تھا۔ ہمارے بغیر وہاں کچھ بھی تو نہ تھا اب محسوس ہوتا تھا۔ جیسے گھر کی ہر شے سانس لینا بھول گئی ہو۔ وہ نثر حال سا جوتے اتارے بغیر بیڑ پر گر گیا۔ اندھیرا پھیل گیا لیکن وہ یوں ہی آنکھیں کھولے رہا۔

کبھی ہمارا غصہ آنے لگتا کبھی خود پندامت ہوتی۔

”بہر حال ہمارے گھر سے جا کر اچھا نہیں کیا۔ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ یہ بات میں نے غصے کی شدت میں کی ہے، کچھ دیر بعد خود ہی میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تھا لیکن اسے خود کو شش کرنا چاہیے تھی کہ میرا غصہ

ہو جائے لیکن وہ تو ایک دم ہی گڑبگڑ گئی اور اس سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اب اگر وہ الماس کے گھر پہنچے اپنے کسی رشتے دار کے گھر تو انھیں چاہیے کہ وہ رات سے پہلے اسے سمجھا بھگا کر واپس چھوڑ جائیں۔

لیکن جوں جوں رات آ رہی تھی۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی آخر کچھ سوچ کر وہ اٹھا اور گاڑی لے کر ہمارے خالہ کے گھر چل پڑا۔ وہاں جا کر جو کچھ اسے کہا تھا وہ راستے میں سوچتا گیا۔

خالہ کے گھر ان کے شوہر ’بیٹے‘ بیٹیاں سب ہی تھے لیکن ہمارے کسی دکھائی نہ دی۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ انھیں بتایا کہ یہاں وہ اپنے کسی دوست سے ملنے آیا تھا۔ نزدیک سے گزرا تو

آیا۔

وہ سب ہمارے خیریت پوچھتے رہے اور اخبار یہاں سے بھی پاپس ہو کے واپس آیا۔ اب ہمارے

والد اور ایک چچا کا گھر باقی رہ جاتا تھا۔

جیسے تیسے کر کے اس نے یہ رات بھی کاٹی اور اگلی صبح ہمارے بھائی کے دفتر فون کیا۔

ہمارے بھائی مجیدہ قسم کا آدمی تھے۔ اس سے کسی مذاق کی امید نہیں کی جاسکتی تھی، اس نے بھی ہمارے خیریت پوچھی تو اسے یقین نہ ہو گیا کہ وہ بھائی کے گھر نہیں گئی۔

اور آفس سے واپسی پر وہ چچا کے گھر پہنچ گیا۔

لاہور میں یہ آخری گھر تھا جہاں وہ جاسکتی تھی لیکن اسے یہاں بھی پاپس ہوئی۔ ایک مہینہ ہی امید کے سارے وہ اپنے دو دوستوں سے بھی ملا کہ شاید ان کی بیویوں سے راہ دور سم کے نائے وہ وہیں چلی گئی لیکن اس کا پھر بھی کچھ پتا نہیں چلا۔

رات گئے تھک ہار کے وہ پھر بستر پر آگرا

عجیب عجیب سے خیالات اب اس کے ذہن میں آنے لگے تھے۔

”کیس! ایک سیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ کسی ہسپتال میں نازک حالت میں پڑی نہ ہو، کسی نے اغوا ہی نہ کر لیا اور کہیں غصے میں آکر خود کشی۔“

اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ ہمارے مرجانے کے خیال کے ساتھ ہی اس کے دل میں گرہ سی پڑنے لگی۔ اس کے پیٹ میں آگ لگی۔ اسی وقت گاڑی لے کر ہمارے تلاش میں نکل جائے سڑکوں پر ڈھونڈنا پھرے

ہسپتالوں میں دیکھے، قحطانوں میں پتا کرے لیکن پھر اس نے سوچا۔ ”یہ تو دیوانہ پن ہو گا۔ یہ لوگ اسے پاگل

نہ سمجھیں گے بستر یہ ہو گا کہ صبح وہ لاہور کے ہسپتالوں میں فون کر کے پوچھے کہ فلاں دن کوئی ایک سیڈنٹ

دیکھو تو وہاں نہیں آیا یا پھر قحطانوں میں پتا کرے کہ ایسی شناخت کی لڑکی اگر زخمی یا مردہ حالت میں.....“ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

اب وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس کی زبان سے وہ الفاظ ہی کیوں ادا ہوئے اور بات بھی کیا تھی۔

بس یہی ہوا تھا کہ ہمارے اس کی تاکید کے باوجود شام کے لیے اس کے کپڑوں پر استری نہیں کی تھی اور

پانی پر دن کے ساتھ اس کے شوہر کے سوٹ کا پڑا لینے اڑکٹ چلی گئی تھی۔

شام کو اسے ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا جس کے لیے ذہن کا سکون ہونا ضروری تھا لیکن آفس میں جنرل میٹریک کے ساتھ اس کی کچھ تلخ کلامی ہو گئی۔ بڑے غلط قسم کے آدمی تھے، ان کی فضول بحث نے افکار کا موڈ خاصا خراب کر دیا۔ اسے جیسے جیسے میٹنگ میں جانا تھا لیکن بیگ صاحب کے ساتھ اچھا

اصا وقت خراب ہو گیا اسے میٹنگ میں جانے کے لیے تیار ہی بھی کرنا تھی۔ ویسے اسے امید تھی کہ ہمارے

نے کپڑے پریس کر دیے ہوں گے۔

وہ گھر کا ہمارا کھانا کھا کر چائے پیے گا۔ اس کی مٹھی مٹھی باتوں کی مدد سے کچھ دیر اپنے خراب ٹھیک کرے گا پھر تیار ہو کر میٹنگ کے لیے چلا جائے گا۔

”ہا۔ جلدی سے چائے بناؤ پیز۔“ اس کی تھکی تھکی آواز سن کر وہ مسکراتی ہوئی بکن نکلی۔

”کیوں خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی ہے۔“ افتخار بولا۔ ”تم چائے تیار کر کے لے آؤ تھک گیا ہوں بہت۔“

”ابھی لائی۔“ اس نے کہا اور پھر بکن میں چلی گئی۔

افتخار نے ٹائم دیکھا۔ پونے پانچ ہو رہے تھے۔ خیال آیا تو پکار کے بولا۔ ”میرے کپڑے تو پھر کسے ہیں ٹائم؟“

وہ بھولناکی سی باہر نکلی۔ ”ہائے! ابھی۔ وہ تو میں بھول ہی گئی۔“ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی ”ابھی ہوں۔ ذرا چائے دم دے لوں۔“

”پانچ بجتے والے ہیں۔“ وہ لب سمجھ کر بولا۔ ”اور جیسے بجے میٹنگ میں پہنچنا ہے۔ کون سا اجنام دے رہی تھیں جو بھول گئیں۔“ جھنجھلاہٹ اور غصے نے اس کی آواز کو تیز کر دیا۔

”اللہ افتخار۔ سوری۔ قسم سے وہ مصلح الدین نے ایسا اپنی مصیبت کا رونا رویا کہ میں بھول گئی حالانکہ سوچا تھا کہ دوپہر میں کھانے کے بعد آپ کے کپڑے پریس کروں گی پھر ریسٹ کروں گی۔“

لیکن وہ کھانے کے دوران ہی آگئیں۔ ساس مندوں کا جھگڑا تھا۔ رونے لگیں تو مجھے ترس آیا۔ دراصل انھیں اپنے میاں کے لیے سوٹ کا کپڑا خریدنا تھا۔ انھیں پہچان نہیں تھی اس لیے مجھ سے ساتھ چلا۔

کہا اور میں تیار ہو گئی۔ یہ بھی خیال نہیں آیا کہ آپ کے کپڑے پریس کرنے ہیں۔ ابھی ابھی آئی تھی اتنے ہی پکانے میں لگ گئی۔ پلیز ناراض نہ ہوں۔ ایک منٹ میں کرتی ہوں۔“

افتخار کا ذہن اس کی باتوں کے دوران کھوٹا رہا تھا اس کے چپ ہوتے ہی وہ تعلق سے بولا۔

”میں عاجز لگ گیا ہوں تمہاری ان ہمدردیوں سے۔ دنیا زمانہ کا درد تو تمہارے دل میں ہے لیکن کی ذرہ بھر پروا نہیں۔“

”پانچ بجے ہیں نا۔ آپ چائے پیئیں۔ اتنی دیر میں اسٹری کر دوں گی۔“ وہ اس کے غصے کو ہنسی میں ڈال رہی تھی۔

”بس رہنے دو۔“ افتخار کا داغ جو بیگ صاحب سے جھگڑنے کا ماف کر رکھا تھا اور ابھی بگڑ گیا۔ میں کروں گا اور یہ گلے میں پیچھکتا دوں۔“ وہ غصے میں پریشان کر کے میں چلا گیا۔

اس نے اسٹری کا پلگ لگایا اور خود ہی اسٹری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہا چائے لے کر آئی لیکن اس کو دیکھا بھی نہیں۔

”آپ چائے پی لیں۔ اسٹری میں کرتی ہوں۔“ ہا بولی۔

”خاموش رہو۔ مجھے ضرورت نہیں ہے تمہاری۔“ اس نے زہر خند لیے جسے کہا۔

”چھوٹا تو اب میری ضرورت نہیں رہی آپ کو۔“ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔ ”میں ہا میری ساری محنتوں کا صلہ!“

”نہیں نہیں بنایا، کم کر دیتا ہوں۔“ وہ غصے میں بولا۔ ”مگر جب پیو یوں کی حالت یہ ہو جائے کہ انھیں اسیوں اور ان کے شوہروں کا خیال زیادہ رہنے لگے تو ایسی ہیوی سے کیا فائدہ۔“

”یعنی اب تک میں نے آپ کے لیے کچھ نہیں کیا بیشہ آپ سے بے پروائی برتی ہے؟“ ہا کو بھی غصہ آیا تھا۔ ”حد ہو گئی نا شکرے پن کی۔“

”نا شکر میں ہوں یا تم۔“ وہ چلایا۔ ”تعلقی نا کیدی تھی تم سے کہ ضروری میٹنگ ہے۔ مجھے بجے جانا ہے۔ کوئی احساس تھا تمہیں کہ تھکا ہوا آؤں گا۔“

”تو کر لیجئے آرام۔ میں نے کہا تھا اسٹری کرنے کو۔“ وہ بھی تیز لے جسے بولی۔

”جی نہیں مصلح الدین اور مصلح الدین نے کہا تھا۔“ وہ طنز لے جسے میں بولا۔

”دیکھیں ابھی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔“ وہ ہونٹ کاٹ کے بولی۔

”برداشت میں کر رہا ہوں تمہیں۔ تم کیا کر رہی ہو۔“

”جج ہے مرد کسی کے نہیں۔“ ہا کی آواز رندہ گئی۔ ”برسوں خدمت کرو آگے پیچھے چھو لیکن ایک دن کی بھول سارے کیے پر پانی پیچھے رہے گی۔“

”فیکو اس بند کرو۔“ وہ زور سے چلایا ”چلی جاؤ میرے سامنے سے۔“

”میں ایسا لے پند نہیں کرتی ابھی! زبان سنبھال کر بولو۔“ غصے اور توہین کے احساس نے اس کے بدن لرزہ طاری کر دیا تھا۔

”اچھا۔! افتخار ایک دم بہت شجیدہ ہو گیا۔“ اگر یہ بات ہے تو ابھی اسی وقت۔۔۔ میرے گھر سے نکل جاؤ۔“

اور ہاں سی رہ گئی۔

افتخار نے غصے کے عالم میں استری کا پلگ علیحدہ کیا اور کپڑے اٹھا کے کمرے سے ملحقہ باغچہ میں مل چلا گیا۔

ہمارے کے بچوں سچ ساکت کھڑی رہی۔

شاہد کا ٹھنڈا پانی۔۔۔ افتخار کے سیکھے کھولے حواسوں پر گرا تو آہستہ آہستہ اس کا غصہ زائل ہوئے لگا۔

کچھ بھی تھا۔ اسے ہاں سے یہ لفظ نہیں کہنے چاہیے تھے۔ عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ ایک غصہ ہوتا تو دوسرا بالکل چپ سا دھ لیتا تھا یا پھر نرم رہتا تھا لیکن آج کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہی گرم ہو گئے۔

”لیکن شاید میری زیادتی تھی۔“ افتخار نے سوچا۔ ”وہ تو اپنی بھول کا اقرار کر رہی تھی۔ میرا اپنا ہی غصہ بڑھتا گیا۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

افتخار کا خیال تھا وہ باہر نکلے گا تو ہا بیٹھی رو رہی ہوگی۔ وہ یوں ہی اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کی گلی آنکھیں پونچھ لے گا۔ اس کے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لے گا اور پھر وہ مان جائے گی۔

لیکن جب وہ باہر نکلا تو اسے جھکا سا لگا۔

ہا الماری سے اپنے کپڑے نکال کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ افتخار کا جانا ہوا غصہ پھر لوٹنے لگا۔ اس نے نیک جینکے سے لائبرٹ نکالا۔ سگریٹ سلگائی اور بے نیازی سے کھڑکی میں کھڑا ہوا۔

وہ سوچ رہا تھا ہا جاتے وقت وہ اس سے ضرور کچھ نہ کچھ کہے گی اور پھر ہو سکتا ہے بات بن جائے۔ وہ ہمارے بولنے کے انتظار میں رہا لیکن وہ سوٹ کیس اٹھا کے خاموشی سے باہر نکل گئی۔

وہ چلی گئی تو افتخار کو احساس ہوا کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔

اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کہاں گئی۔ یہ رات اس کی بڑی مشکل سے بسر ہوئی۔ صبح آتش پینچ کے اس نے سب سے پہلے ڈائریکٹری اپنے سامنے کھسکائی اور پریشانی کے عالم میں ہسپتالوں اور تھانوں کے فون کھڑکے شروع کر دیے۔ لیکن ہر جگہ سے اسے مایوسی ہوئی لیکن اسے مایوسی بھی نہیں کہا جاسکتا تھا اب ایک آخری امید رہ گئی تھی اور جو خاصی قوی بھی تھی۔

ہر طرف سے مایوس ہو کے اسے یقین آیا تھا کہ وہ ضرور گھر سے نکل کے اسٹیشن گئی ہوگی اور اپنی ماں کے پاس جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گئی ہوگی۔

اگر یہ خیال اسے پہلے آجاتا تو ممکن تھا کہ وہ اسے اسٹیشن پر ہی پکڑ لیتا۔ اس کا بچی چاہا پہلی فلائٹ سے

کی کراچی روانہ ہو جائے اور یہ خیال آتے ہی اس نے باس کے نام ایک درخواست لکھی اور کٹ کے لہ ریڈریشن آفس میں فون کر دیا۔

ہمارے گھر میں اچانک ہی اسے دیکھ کر سب خوش ہو گئے لیکن اس کی ماں کا پہلا سوال جو تھا اس نے افتخار کی آنکھوں کے گرد اندھیرا پھیلایا۔ انھوں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

”نہیں ماں آئی ابلی بیٹے۔“

”نہیں امی۔“ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”فرم کے ایک کام سے آیا تھا۔ بس آج ہی واپس جا رہا ہوں۔“

اور پھر اسی شام کی فلائٹ سے واپس آیا۔

اس کی حالت بری تھی۔ اپنی آگ میں وہ اکیلا ہی سلگ رہا تھا۔ کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ رسوائی اور جگہ ہٹانے کے خوف سے ابھی تک اصل قصے اور ہمارے گم ہو جانے کے راز میں اس نے کسی کو شریک نہیں کیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے طور پر ہی اس کا پتا چلائے گا اور اسے منالائے گا۔

لیکن اب تو وہ ہر گز نہ چاہتا تھا کہ اسے تلاش کر چکا تھا۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کہیں اس نے خود کشی نہ کر لی ہو!

اور اب تو افتخار کے دل کا بوجھ اتنا بھاری ہوا جاتا تھا کہ اس کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ جہاز میں وہ سوچتا رہا تھا کہ آخر کس کو وہ اپنا راز دار بنائے۔ بہت سوچ سمجھ کے اسے اپنے ایک دوست طارق کا خیال آیا۔

وہ انٹیلی جینس میں تھا۔ افتخار کو امید تھی کہ وہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔

لیکن ایئر پورٹ سے طارق کے گھر جاتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنا ارادہ بدل دیا۔

اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہمارا کا انتظار کرے گا۔ جانے کیوں اس کا دل ہمارا کی موت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

وہ ساری رات افتخار نے جاگتے ہوئے بسر کی۔ تمام دن گھر میں رہا۔ آفس بھی نہ گیا۔ شام کو چار بجے کے قریب۔ یکایک کال ٹیل کی آواز پر وہ اچھل کے بستر سے اتر ا اور جا کر گریٹ کھول دیا۔

پوسٹ مین تھا۔ ٹیلیگرام لے کر آیا تھا۔

اس نے بے چینی سے آمار اس کے ہاتھ سے لیا اور لفافہ کھول کے پڑھنے لگا۔ ملتان سے اس کے باپ کا پیغام تھا۔

”بیوی کے ساتھ فوراً گھر پہنچو۔“

اب وہ کوئی بہانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ ایک دم ہی افکار نے ہمت ہار دی۔ وہ ماں کے دامن میں دل کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو بیتاب ہو گیا۔ اگلے قدموں گھر میں واپس گیا۔ اپنی حالت درست کی اور سیدھا لیز پورٹ جا پہنچا۔ جس وقت وہ اپنے گھر میں داخل ہوا اس کی عجیب سی کیفیت تھی۔ تین دن کا بڑھا ہوا شیو اور آنکھوں میں سیاہی مائل سرخی کی تحریر۔ لباس تبدیل کرنے کے باوجود اس کی اندرونی حالت کسی سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

کلے دروازے سے ہوتا ہوا وہ برآمدے میں چڑھا تو گھر اسے سنان ساگا۔ اس کی دونوں باتیں اور ماں انڈر تھیں۔ بھائی یقیناً باہر گئے ہوں گے۔ اور باپ ضرور موجود ہو گا۔ سامنے اس کے کمرے سے کچھ آوازیں آرہی تھیں لیکن وہ سیدھا اپنی ماں کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

دروازے پر پہنچ کے اس نے دیکھا کہ کوئی جھکا ہوا گیلے کڑے سے فرش صاف کر رہا ہے افکار آگے بڑھا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے؟

اور پھر۔۔۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ ہاتھی اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھی اور اسے نظر انداز کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ یوں ہی کھڑا رہ گیا۔ اس کے تو ہم دنگان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے اپنے گھر میں ہو سکتی ہے۔ اسے یہاں دیکھ کر وہ پکرا کیا تھا اس طرح کہ اسے روک بھی نہ سکا اور جب وہ پہلی کڑی اس کے پیچھے لپکا۔

”ہا۔۔۔ ہا۔ بات سنو“ لیکن وہ تیز قدم اٹھاتی اپنے سر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

پھر جیسے ہی وہ اس کے پیچھے اندر گیا۔ اس کی دونوں ہمیں دور سے چلائیں۔ ”ابھی بھائی آگئے۔“ اس کے ماں باپ نے اسے مسکرا کے دیکھا اور ذمہ پھلانے سانس کے پاس جا بیٹھی تھی۔

”آپ لوگوں نے مجھے اطلاع نہیں دی۔“ اس نے ماں باپ سے لگے کیا۔

”کیسی اطلاع؟“ اس نے جراتی سے پوچھا۔

”یہی کہ ہمارا ہے۔“ ”افکار بولا۔“ ”میں وہاں پریشان پھر تا رہا۔“

”تو ہمارے پوچھ کر نہیں آئی تھی؟“ باپ نے مسکرا کے پوچھا۔

”اس نے پوچھا بھی کہ تھا اس سے۔“ ماں نے ہنس کے کہا۔

”میرے خواب و خیال میں نہ تھا کہ ہمارا بھی آسکتی ہے۔“ وہ ایک طویل سانس پھوڑ کر ماں کے

مرکز کا نشانی قبلہ تھا، فخر مودا حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک وسیع اور معتبر تصنیف



مفتی: مفتی نور محمد خلیق

اس کتاب پر مصنف کو ۱۰۰۰۰ روپے کا انعام مل چکا ہے

تیرہ سال کے مطالعے، غور و فکر اور جستجو کا حاصل، حضور اکرم ﷺ کی سیرت کے ہر پہلو پر گزشتہ کا مطالعہ

مفتی نور محمد خلیق

یقیناً پھر سیرتِ پاک کی وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے حضور پر نور کی سیرت پر تمام کلامی بحثیں کا سامنا کیا ہے اور ان پڑھنے والوں کے مطالعہ و روشنی کی تسکین کی ہے جس کے بدلے میں رسول اللہ ﷺ اور اہل بیت سے توفیق

سیما پبلیکیشنز کی جانب سے پہلی پیشکش

معلم اعظم

۱۲ صفحہ پر مشتمل جلد کتاب • روزانہ ۱۰ روپے کے خلیق • بزرگ پیر پورہ کی انٹرنیٹ طاعت • مفتی نور محمد خلیق • کافرہ مفتی اور سیرتیں • سیرت و طاعت محمد ﷺ • وہابی دینی کتب خانہ

صفحہ ۱۲ روپے

حدیث کتاب ۷۵ روپے

سیما پبلیکیشنز ۲۰۱۸ء اور انٹرنیٹ سیرت، دہرا دھار

پاس بیٹھے ہوئے بولا ”میں تو اس کے رشتے داروں کے گھر ہی پتا کر رہا۔“

”تو ہم لوگ بھائی کے رشتہ داروں میں سے نہیں ہیں۔ بھیا۔“ اس کی ایک بہن نے پوچھا۔

”ہاں بھئی سب سے خاص رشتہ دار تو ہم ہی ہیں دلہن کے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لوکان کھول کے۔ ”نہوں نے افتخار کو گھڑا۔“ مگر آئندہ تو نے کوئی ایسا لفظ میری ہوسے کہا تو مار

پہلے کان پکڑاؤں گی۔ پھر ساتھ بھیجوں گی۔“

”تو پھر اجازت ہے جاے گی۔“ وہ اپنی ساری پریشانیاں بھول گیا تھا۔

”ہاں بالکل ہے۔ جاؤ۔“ ماں نے بیٹیوں کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگوں نے بھائی کا کمرہ دس

دیا۔“

”جی اماں۔“ دونوں نے جواب دیا۔

”بس بیڈ کور تبدیل کرنا پاتی ہے۔“ ایک شرارت سے بولی۔

”تو جاؤ لہو! اپنے کمرے میں الماری سے دھلا ہوا بیڈ کور نکال کے تبدیل کرلو۔“ ماں نے کہا اور

سر جھکا کے باہر نکل گئی۔

اس کے باپ نے تھوڑی دیر توقف کیا پھر کھٹکار کر بولے ”ہم نے ہاکی جو بات سنی ہے ایسا ہی

میں تمہیں غلطی پر پایا ہے اس لیے کہ بھول انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ انھیں معاف کر دینا چاہیے۔

دیے تم بھی کچھ تھکاؤ۔ ہو سکتا ہے ہم تمہارا بھی کچھ نیور کر سکیں۔“

اور افتخار نے بیگ صاحب کے جھگڑے سے لے کر آخر تک سارے واقعات انھیں سنا ڈالے۔

”کچھ بھی تھا بیٹے تمہیں وہ الفاظ ہمارے ہرگز نہیں کانچا ہے تھے۔“ اس کی ماں نے ساری بات

کر کہا ”گھر میاں بیوی دونوں سے مل کر بڑتا ہے۔ وہ صرف تمہارا ہی گھر نہیں ہے۔ ہمارا بھی ہے۔“

”میں اپنی غلطی مانتا ہوں امی۔“ افتخار نے مسکرا کے کہا۔ ”بس وہ بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں

اپنے فتنے پر قابو نہ پاسکا۔“

”چلو تو پھر جا کر اسے حوصلہ دو۔ بہت صدمہ ہے اسے تمہاری بات کا۔“ ماں نے کہا اور افتخار مسکرا

ہوا کرے سے باہر نکل آیا۔

وہ بیڈ کور بچھا چکی تھی۔ اسے دیکھ کر بیڈ پھر کے کدھی ہو گئی۔

”بجرم حاضر ہے۔ یور بائی نس۔“ اس نے شوشی سے کہا۔

”اب کیوں لینے آئے ہیں۔“ ہمارے منہ بنا کے کہا ”وہ تو آپ کا گھر ہے نا۔“

گھر ایک سے نہیں بنتا۔“ وہ ہنس کے بولا۔ ”جب تم نہیں تھیں تو بھلا کوئی گھر تھا میرا؟ مسافروں کی

راہ تھتے تھتے تین لڑکے مل کے ایک کمرے میں۔“ ہمارا ہنسی آگئی۔

وہ ہم دونوں کا گھر ہے ہاجی۔“ افتخار کے لیے جس دنیا جہاں کا پیارا سٹ آیا تھا۔ ”تمہیں تو چاہیے تھا

تم نکلے سے صاف انکار کر دیتیں۔“

”میک ہے آئندہ ایسا ہی کروں گی۔“ ہمارا مسکرا کے بولی۔

”آئندہ ایسا ہو گا تب نا۔“ افتخار نے آگے بڑھ کے اس کے گرد دونوں بازو کس لیے اور اس کی

لوں کو چومتے ہوئے بولا۔ ”بٹاؤ جان کہ تم سیدھی اپنی امی کے پاس کیوں نہ گئیں میں نے تو سنا ہے

اس اپنے شوہروں سے روٹھ کر ہمیشہ میکے کا رخ کرتی ہیں۔“

”اس لیے انہی۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کہ امی نے مجھے رخصت کرتے وقت کہا تھا کہ آج

تم ہمارے لیے پرانی ہو رہی ہو۔ اب وہی تمہارا گھر ہے جس میں تم تیار ہو رہی ہو اور بس گھر سے

لے کے مجھے اور کچھ نہ سوچا۔ اماں اور اباجی کی شفقت اور خلوص پر مجھے اعتماد تھا بلکہ اس سے زیادہ خود

مرو ساتھ۔“ وہ بے اختیار رو دی۔ ”لیکن آپ نے میرا مان تو ڈیا ابھی۔“

”دیکھ! اس نے اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔ ”مان ٹوٹا نہیں تھا“ روٹھ گیا تھا اور اب پھر تیرے

رہ گیا ہے۔“ دونوں کتنی ہی دیر ایک دوسرے کے ساتھ لگے خاموش کھڑے رہے۔

پھر افتخار نے کہا۔ ”اور تم نے یہ نہ سوچا کہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے جب میں گھر گھر جاؤں گا تو

میری کتنی رسوائی ہوگی۔“

”کیا میں آپ کو سمجھتی نہیں ہوں۔ اور کیا میری رسوائی آپ کی نہ ہوتی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اور اگر یہ لوگ بھی تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ یعنی میرا ہی نیور کرتے پھر۔!“

”پھر میں سمجھتی کہ دنیا سے انصاف ہی اٹھ گیا ہے، پھر مجھے میں کیا کرتی!“

”ہاکی آواز میں ایسا دھک تھا کہ افتخار نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔!!!!“



میرزا بیگم

ایک تاریخ ساز شخص کا خردنشت، مہدیاں اگے دلا رہی تھیں

شمیم فہرید



ہوش سنبھالنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد کا انتقال اس دن ہوا جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی اب ماں کے ہوا
میرا کوئی سارا میں تھا، میں بڑا ہوا تو اپنی ممتی قوالہ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ باہی گیری کرنے لگا۔ بڑا ہو کر مجھے والد کی
والدی موت کا سبب معلوم ہوا۔ وہ چاہی تھے اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ماں نے خبر نہ سمجھے یہ بھی بتا دیا کہ میرے
طوسوں آقا کے بارے میں بھی پڑھنا ہے یہ پیش گوئی کی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ کچھ دن گزرے تھے وہ میرے
اسواہ پھر اپنے گروہ کے ساتھ درجیل میں آگیا اور لوٹا، مارا شہر کر دی۔ میں اسے اپنے والد کا قاتل سمجھتا تھا اس لیے اس
سے انتقام لینے کے درپے ہو گیا ایک شب موقع پا کر اور اپنی جان پر خیل کر جنگل میں گھس گیا اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں پھڑکا گیا
نے سردار اسواہ سے کہا کہ اس کے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہوں مگر حالات بگڑے اس طرح پیش آنے کہ سردار اسواہ میرے
ہاتھوں مارا گیا اور جب گروہ نے مجھے اپنا سردار بنانا چاہا تو میں نے ان کی پیشکش اس شرط کے ساتھ منظور کر لی کہ وہ میرا
ماں کے ہیں میں نے انھیں حکم دیا کہ وہ لوٹ مار ترک کرے، کیڑیوں کی طرف لوٹ جائیں۔ وہ وعدے نہ پھرے اور یوں وہ قتل
کے قے قیم ہو گیا۔ اسی دوران میں سردار کی وادہ تھیلے مجھے معلوم ہوا کہ دراصل میرے والد میرے بچا طوسوں آقا کی
سازش کا شکار ہوئے ہیں۔ میرے بچا والد کو راستے سے ہٹا کر میری ماں کو اپنانا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے اسواہ کے ہاتھوں
میرے والد کو قتل کرانے کے لیے جال بچھایا یا جنگل سے کامیاب لوٹ کر آنے کے بعد میں جاکر قوالہ شان سے ملا اور اسے تمام
دروادہ تائی، حاکم کا بیٹا سلیمان، ٹپیل جی میری رودادین گروہ کی بہت متاثر ہوا حاکم نے اس بچے کو ختم کرانے مجھے چاہا یوں
افر مقرر کر دیا۔ اپنی جھوٹری میں آکر میں نے ماں کو ٹپیل کی میں نے اس سے کہا کہ جلدی اسے سب بگڑے تادوں کا کہ کہاں اور
کیوں کیا تھا پھر میں اپنے والد کے قاتل کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ معلوم ہوا میرے بچا طوسوں آقا ایک قریبی بھتیجی بیوتہ گئے
اور شام تک لوٹیں گے میں نے موقع قیمت جان کر بیوتہ کی راہوں۔ راستے میں میں بچا طوسوں آقا کے گھر میرا اور ان کا
مقابلہ ہوا اور آخر کار میں اپنے والد کا انتقام لینے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے دن سلیمان کی فرمائش پر ایک قصبہ کے گھر گیا اور
اس سے مصر کی تاریخی داستان سنی کہ سلیمان کو شا سکوں اسی روز قوالہ کی بزرگہ سے ایک جہاز آکر لگا۔ اس جہاز میں ایک
چلو علی وزیر خروپاشا وہاں آیا تھا کہ اپنی جلاوطنی کے دن وہاں گزارنے کے وہ حاکم کی جہلی میں قمر۔ پر غور اور سخت غصے
پاؤں میں انھیں سے اچھا نہ لگا سلیمان سے اس کے متعلق مجھے مزید معلومات ہوئیں۔ مصر میں ممالک نے بغاوت کر دی تھی سلطان
خروپاشا کو وہاں کا والی بنا کر بھیجا چاہتے تھے۔ اس نے انکار کر دیا تو بطور سزا اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں جلاوطن
ایک ظلم عثمان سے بھی ہوئی جو اپنی جہاز پر مصر جا رہا تھا۔

اپنے دوست سلیمان سے مجھے خروپاشا کے بارے میں یہ علم بھی ہوا کہ سلطان کے حاشیہ نشینوں میں خروپاشا کا ایک اہم دور
میں خروپاشا بھی ہے جو اس کی بحالی کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ مجھے خروپاشا کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خود بھی ظلم تھا
تھے اس کے آتشین پاشا نے آزاد کر دیا تھا اور اسی کی سازش اور دوست سے خروپاشا اپنی ترقی کر گیا تھا۔

چند ہی روز بعد مجھے ایک جاں کلاہ واقعہ پیش آیا۔ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اسی دوران میں بیڑی پر ایک تاریک مظلوم
کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ جس سے صرف میرا دوست اور میرے والد کا ایک کرم فریاشا آکر جو قوالہ بن واقعہ تھا۔ ماں کے انتقال
پر میں نے اسی قاتل خود کی کرنا چاہی تھی اور آج فریادین سے میری جان بچانی تھی۔ کچھ روز اسی میں تم گزے اور پھر سلیمان
کی محبت کے سبب رفتہ رفتہ میں معمول پر آیا۔

ایک بے ہند۔ لے۔ ڈاکٹرسٹون۔ قاری
رومانوی اور جاسوسی ناولوں کا مرکز
تھکشاں لائبریری اینڈ جنرل اسٹو
جمناس چوک بسکھ



[illegible]

اور کچھ میں نے قیلولہ کی طرف سے پہنچی تھی ایک جگہ میں قیقلو اس دوران میں حاکم پر ہوسٹ والا اور
باری قیقلو سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔ کچھ سخت اور بے اصول کا قیقلو ہستی والوں کو بھی تھیں
وہ حصول اور اگر کسی ہجرات کے لئے کسی جگہ پر خدائی جوہر اپنے اپنے آگے آگے اس نے متہود زاری کی
خزم نہ پڑا اس کی آہ زاری کا میرے دل پر اثر ہوا جس نے میری عزت محض ہو کر گیا جس نے اس کا ایک اور
دیکھا۔ وہ بد ہستی سے لوث لاری جی میں خوشی کے خود پر ملائی کی اور گے یہ گرا سے دیو ایک۔ الفرض وہ میرے
رکھتا ہوا ہے جانے کے لئے راضی ہوئی اور وہیں اس کے حسن کا باوجود یہ چل گیا۔ میں نے اس کے سامنے کی گھر
دیا کہ میرا کھانا اس وقت تک ملے گا جو میں نہ رہوں۔ گھر میں نہ رہا۔ اس نے اس کے سامنے والے گھر
درخواست وقت مقررہ سے پہلے حصول دینے کو ادا نہ ہوا جس کے پھر میں حویلی کی طرف لوث آیا۔ اس وقت سلطان
پاس میں تھا کہ میں کو جوہر کے گھر جاتے دیکھا۔ میں نے اس کے ایک درخت سے کام اور جوہر کو کہنے اور اس
جائیں سنگ۔ دیکھ کر دیکھ کر دھڑا اٹھا کہ میری درخواست کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ جوہر اپنے
کا کام میں ہو گیا۔ اب اس کے باپ کی روٹی کا تکیا راستہ ہوا تھا کہ میں اپنی زندگی بسر کروں۔

جیلہ کے ہاتھ سے دودھ کا برتن چھوٹ گیا۔ جب
لی کے باوجود چور گھر میں کس نے تو فتح پر ہوسٹ
نرکار کے شاہ جوہری اکٹھ سج ہی صبح کل گئی ہوگی
وہ ہوا خوری کے لیے سمندر کو کنائے چلی گئی ہوگی۔
بال آتے ہی وہ ب ساحل پہنچی لیکن بے سوا سے
ہو اکر شاہید جوہر میں نمائے اپنی ہوگی اور اس کا
پنسل لیا کہ وہ موجود ہے تو ہوگی اس لیے نکل گیا
کہ یہ خیال کر کے وہ آؤ داری کرنے لگا۔ دوسنے
کچھ بکا ہوا تو وہ ہستی کی طرف لوٹ آیا پھر ساری ہستی
کا کرامت کیا۔ بھی سچی بے حال سے واقف ہوئے کہ
ایک کڑی ہے۔ جوہر کے پرستہ میں تلاش کیا
یا مگر وہ کیا کہے۔ "لیمان ساس لیکن آؤ پھر چھوڑ دو
دودھ ہا پورنا شروع کیا۔" (ھر جب بے وقار وہہ جوہر
معارے رقبہ کے پاس نہ پہنچی تو وہ اگل بولہ ہو گیا۔
نہ نے اپنے دو خاص خواجہ سرائوں کو بلا کر کہا۔ "ش
ہوئیوں کو لے کر دوسٹ روانہ ہوا جو اپنے دوست کے ش
کے پاس پہنچے تو اس نے کناک خرپا پائے اپنی لونڈی
نے کے کہ جس بھی بھجھا ہے تو اس کے ہماری درخواست
کے لیے کرے یا تو بھجھا ہے تو اس کے کھڑکھوادیں۔
سارے پرستہ میں اسے تلاش کرنا۔ ایک ایک گھر کی
شعی کیا اس میں اس کی کوئی جیت پر نہیں ہوئیوں کا۔
وہہ تھیں اس نے تو کئی موزوں مل گئے۔ میں جس
ایک جتنے کی سلامت رہا تو کناک کے تھیرے میں اس زندہ
مرورہ کا حارہ روڑ پر وقت گزارنے کا اور تھیرے میں اس تھم
کا کہ تو میں ہماری گردن آڑاؤں کا چارہ دیر تھم
تو بھول کے واسطے میرے جیت کا عث ہوگے۔
"لیمان شاہد اپنی مزید کچھ کناک کے میں بل اٹھا۔ "کیا
س نے اپنے آدمیوں سے میرے بارے میں کچھ نہیں

نئے ملک باغی سے غافل نہ رہنا! مجھے اندیشہ ہے کہ اس لڑکی کے معاملے میں اسے کچھ دخل ہے۔ لہذا اس کی سرکاری بہت ذہین اور ہوشیار ہے۔ میں تمہیں کمرے پہنچا کر تمہیں اختیار ہے، خواہ سڑاؤ یا انعام و اکرام حاصل کرو۔" پھر خواجہ سرا سپاہیوں کو ساتھ لے کر یوتھ ہسپتال کے یوتھ وائل سے لے کر یہاں منتقلیت اور ادوار کا سال بے ایچی مال لڑکاری اور کسٹریج ہلاک و مصیبت گمانی سے نجات پانے پر وہ بھی کھڑی ہوئی۔ منا پائے تھے کہ جوہر کے غائب ہو جانے کا کیا غریب اور بیکار ہو پیر نہ ہو پانی تھی کہ انھوں نے دیکھا، "خود خواجہ سرا خواجہ سرا اور ان کے پیچھے سبھی، بہت سی داخل ہوئے وہ سیدھے تھے کہ مکان پر پہنچے جیلہ روٹی ہوئی کہ اسے وہ اندر آئے تھے۔" میں نے دیکھا کہ انھوں نے جیلہ کو ایک طرف رکھا اور مکان میں کھس گئے۔ ہوسٹ کا بیچ حاصل سب ایک چار پائی کی بڑا تھانہ۔ خواجہ سراؤں نے اسے اٹھایا اور کہا کہ "میں بھی جیسی تھی ہمارے آقا کی لوبڑی ہمارے آقا کے کرو۔" میں نے فریاد ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تو مجھے یہ میری قیامت ہے جو اور کتے ہو کہ وہ ہمارے آقا کی لوبڑی ہے۔" مجھے بتاؤ کہ وہ کون نامزد ہے جو میری کوئی پانی لوبڑی کتا ہے؟" اس پر ایک خواجہ سرا نے اسے جواب دیا کہ "ہمارا سڑاؤ زخموں پر شاہ!"

اپنی لوبڑی طلب کر آئے۔ ہمارے آقا نے تمہاری بیٹی کو خرید لیا تھا اور اسی وجہ سے تم کو بیچو گے۔ میں نے کہا کہ اس مکان میں ہمارے آقا نے تمہاری بیٹی کو اس کی زبان کا تھا! ایسا نہیں تھا! قتلہ سمجھے۔ انھوں نے تمہاری بیٹی کی قیمت اس کی جیسی جس سے مطلب حاصل ہوا ہوا۔" میں نے سن کر گڑبگ اور لڑاکا کہ "کیونکہ وہ ہوا جو ایسا ہے! تمہارا آقا جھوٹا ہے! یہاں سے کوئی کہ شریف نہیں ظالموں کی طرح نہیں لے! یہاں سے کوئی کہ ظالم کے ہاتھ سے تمہاری بھی اذیت رہے۔ ہاتھ سے جو اسے ظلم کی سزا دے گا۔" خواجہ سراؤں نے اس پر بیچ کو سپاہیوں سے بدھو کھا کر دیا۔ وہاں وہ رہے۔ ایران تھا کہ یہ کیا ہے! یہ گیا وہ کچھ دیکھ اور سن رہے۔ حقیقت ہے کہ سپاہیوں نے جوہر کو سارے کس طرح تلاش کیا اور وہ بدست کی تو بار آگئے۔ کتا بہت

والے جت ہو گئے تھے۔ انھوں نے تو کسی کی عزت و آبرو کا خیال کیا نہ قانون کا! جب وہ جہر کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے تو پانچار قوال واپس آ گئے۔ انھوں نے خروپاشا اپنی کارگزاری بیان کی تو وہ غصے سے دانت پیسنے لگا اور بولا کہ "تمہیں سبے جواب باقی چھوٹی کا بھی حال معلوم ہے؟" انھوں نے جواب میں کہا کہ اب تک ہم اس کا کچھ حال دریافت نہ کر سکے۔ لیکن آج شام پاگل جمع کما کر کی خبر سے حضور کو آگاہ کروں گے۔ آج ابھی تمہارے آنے سے پہلے اطلاع ملی ہے کہ خروپاشا نے خواجہ سرائوں کو بلوا کر تمہارے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے خروپاشا کو بتایا کہ حضور! ہم ساری رات میں سوئے اور چھوٹی کو تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھایں رکھا۔ ہمیں اس کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہو کہ چھوٹی کی ایک آج کس پاس کی اور کیا پزار سے خریداری کی۔ وہ گھر کا سامان اور ضروری چیزوں کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں خرید کر تھا۔ گرائی کرنے والے لڑکے کا پیٹ بھر دیا ہے۔ ہم نے اس کی جاسوسی پر مقرر کیا تھا کہ انھوں نے کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی۔ یہ سن کر خروپاشا غضب ناک ہو گیا اور بولا کہ "چھوٹی نے رات کس کام میں گزاری۔ کیا اس کے پاس کوئی اور بھی تھا؟" خواجہ سرائوں نے جواب دیا کہ یہ ہم دریافت نہیں کر سکے۔ خروپاشا نے انھیں جھکا کر ملامت کرتے ہوئے کہا کہ اگر شام تک دریافت کرنے میں پوری کوشش نہ کی تو مارے کو کوٹوں کے قدموں کی کھال اڑاؤں گا! شام ہوتے ہی وہ دونوں ہماری چھوٹی کی طرف گئے۔ چھوٹی کو بڑبڑا کر انھوں نے چال چلی کہ اس کے پاس کی ایک پرانی چھوٹی میں آگ لگا دی۔ چھوٹی چپچپے چالنے لگے۔ لوگ ان کے پاس گھر جمع ہو گئے۔ وہ دونوں ہماری چھوٹی کے پاس آ کر زور زور سے پکارنے لگے کہ باہر نکلو! آؤ اور اپنی جان بچاؤ۔ زور نہ تھا۔ چھوٹی میں بھی آگ لگ جانے کی، لیکن ظاہر ہے کہ تم وہاں نہیں تھے! انھیں کیسے جواب دیتے۔ ابھی کچھ پر پہلے خواجہ سرائوں پر کوڑے برس رہے تھے اور میں ان کی آہ و زاری سن رہا تھا۔ انھیں اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ گرفتار ہوئے کس کماں گزاری! انہو چھوٹی چھوٹی ہی طرح ہے کہ تم کل آج خروپاشا کے بعد جہر بستی کی طرف گئے تھے۔ تم بہت تیز جارہے تھے۔ راستے میں ایک گھر گزرا

کوئی بھی تمہارے گھوڑے کی چھت میں آ گیا تھا۔ بعد میں رات کے وقت چٹانوں پر چڑھ کر دیکھا کہ اس عمارت میں پہنچے میرے اور آج فرار کرنے والے نہیں جا رہے۔ رات تم نے اسی عمارت میں گزاری۔" سلیمان خاموش ہو گیا۔ سلیمان کی باتیں سن کر میں دنگ رہ گیا۔ واقعی وہ حال سے بے پردہ اور واقف تھا۔ اس عالم حیرت میں میرے منہ سے نکلا۔ "تمہیں یہ سب کچھ کس طرح معلوم ہے؟" "تم نہیں جانتے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں!" سلیمان جواب دیا۔ "میں کہ تمہاری خوش قسمتی ہوئی خوش قسمتی ہے اس لیے میں ہر لمحہ تم سے کم ہونے پر تیار ہوں اور تمہاری حرکات کا گھماں میں نہیں کرتا۔ تمہارے اور تمہاری عیبیہ کے جتنا ہو جائے گا میں اس سے اسے نہیں بچاؤں۔ میں دیکھ ہوں کہ تم جو ان مروجہ دینی اور مردانہ صفات کے باوجود چلاؤ گے، میں اسے بے حد دھڑک اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ میں نہیں جانتے کہ تمہیں خروپاشا کے مقرر کیے ہوئے کام کی خبر ہے یا نہیں۔ اسے اس معافی کا براؤ نہ کرنا۔ اسے اطلاع بھی تھی کہ اسے اپنے لیے کسے بھاری ہو گئے۔ اس وقت اسے اس معافی کا خیال ہے نہ کہ اسے بھاری بھانت پر خود بخود وہاں موجود تھے کہ اس نے جہر سے خفا سے ایک ہفتہ کے تو کہا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اسے پورا جس سے ایسا اختیار حلیہ جو آدمی ناخوش ہو ہو گا اسے زیادہ فائدہ نہیں ہوئی۔ وہ جانتے ہیں کہ جہر سے غائب ہو جانے میں جیسے دخل ہے۔ وہ تمہاری گھاٹ میں لگا ہوا ہے کہ تمہاری اور جہر کی طرف سے اپنے دل کا قبار نکال لے۔" "میں اطلاع میرے لیے واقعی تفریق کا نہیں ہے۔ میں جیسے اس سے بے خبر تھا کہ اس بھولے خروپاشا کی بچہ پر نظر رکھ رہے ہوئے ہیں۔ ذرا در بعد میں نے سلیمان کو مخاطب کیا۔ "وہ دوست! کیا ایمان بھی خروپاشا کی حکومت ہے کہ وہ کہتا ہے چاہے سزا دے اور چاہے جلاں ڈال کر کہہ دے کہ تمہیں یہ سب کچھ کس طرح معلوم ہے؟" "بے شک!" سلیمان نے جواب دیا۔ "اب وہاں

میں نہیں رہا۔ یہاں ہو چکا ہے۔ اب اس کا کلہر تمام راف سلطنت میں واجب الاتباع ہے۔ میں اس بات کو سے چھپاتا نہیں چاہتا جس سے میں اور میرے والد نہیں اور میں نے خروپاشا اور جہر نے اتفاق کیا تھا۔ جہر نے اپنے آپ کو اپنے والد اور فقہا کو باہل لانے کے لیے خروپاشا کے انھوں سے بچ رہا ہے۔ میرے علم کے مطابق اس طرح خروپاشا کو بے وقوف بنایا اور وہ اب ان حالات میں نہیں رہتا جو شہر رہتا چاہئے اور کہہ کر جہر کی تلاش میں دونوں خواجہ سرا کو قتل کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر مہلت خیر ہونے سے جہر چھوٹے میں تو قتل کر دیتے۔ جہر کے میرے صاحب نے آج رات میں نہیں میرے ساتھ کوئی میں بسر کر اور عمارت نہ جاؤ کہ خروپاشا کے جاسوس دھوکے میں رہیں۔ اب جان لو کہ تمہاری جوہر تخت خرابے میں ہے۔ تمہاری ذرا سی نفرت اس کی معصیت میں پیسہ دے گی۔ پورا جہر جہر ہو کر لوگوں کے خروپاشا کی طرف سے پوری ہو چکا ہو۔ بول بول کچھ بھی وہ کہنے والا ہو گا مجھے جہر ہو سکے۔" میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بھلا کسے ممکن تھا کہ میں عمار کا رخ نہ کر کہ رات کو میرا جانا وہاں۔ میں خود ہی تھا۔ اگر میں نہ جاتا تو جہر میری تلاش میں کسے قاتل سے ہمارے ہاتھ میں آئی اور پھر خروپاشا کے بچے چڑھ جائے۔ خروپاشا کے کہنے شب و روز اسی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ میرے گھمے جوہر کے پاس کھانے کے سامنے ابھی پہنچا تھا کہ آئندہ وہ زور دہی نہ رہے۔" "میں نے خروپاشا کے اپنے ایک اور خدشے کا بھاری کیا۔" میرے چھوٹی! مجھے تمہاری جانب سے بھی خطروں ہے۔" وہ یہ کہہ کر جہر کی تلاش میں نکام ہونے کے بعد خروپاشا کا سارا غصہ تم پر اتارے۔" سلیمان نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "میں نے؟" "جی ہاں!" "میں نے یہ کہہ کر وہ تمہارے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکا ہے۔ وہ کچھ اختیار ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔" "میں نے تمہیں گھبرا کر اس کے ساتھ لے جا سکا ہے۔" "مگر جس جرم میں؟" "میں نے پوچھا۔"

"جس جرم میں کہ تم نے اس کی توہین کی؟" اسے ذلیل کیا۔ "پھر؟" "پھر میرا غصہ نہ دوستانہ مشورہ ہے کہ تم کوئی اہل خود بھی روپوش ہو جاؤ! اس وقت تک کہ بے گنجی کے وہ ملہوں جانے چاہتے۔" "اب اسے اور جہر؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اسے تم مجھ پر اور اللہ کے مجھ سے میں چھوڑ جاؤ! میں نہیں چاہتا کہ خروپاشا کے اقدام کا نشانہ بنوں!" سلیمان کی بات میں یقیناً وزن تھا۔ مجھ پر کوئی غصہ نہیں رہ گیا۔ خروپاشا مجھ سے انعام لینے میں کوئی کسر چھوڑنے والا نہ تھا۔ حالات ایک دم اتنی تیزی سے بدل گئے تھے کہ کل تک جو شخص بے اختیار غائب نام قوال حسان بھی اس کے سامنے بہت معمولی بیٹھ رہتا تھا وہ خروپاشا کو بتا رہا تھا کہ حسان کو معزول بھی کر سکتا تھا۔ پھر میں نے حسان کی تلاش میں میرے لیے یہی حکم تھا کہ جہر کو جوہر کو سب بھولی کا مظاہرہ کرے۔ بولے وہاں سے فرار ہو جانا اور یہ ممکن رہا تھا کہ مزید حسان میں رہ سکا۔ ایسی صورت میں خروپاشا کے انعام کے بجائے والا کوئی نہ تھا۔ مجھ سے ہوتی تھی اور اس غلطی کا ازالہ اب نامکن تھا۔ شام میں اسے قوال کے کہنے کی بجائے جہر کو کس اور کھل گیا ہو یا اگر اب کیا ہو سکتا تھا! یہی سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں اپنی سوچوں میں کھنسا ہوا تھا کہ مجھے سلیمان کی آواز کس دیر سے آئی محسوس ہوئی۔ یقیناً اس نے میرے پاس سے میری گھر میں اور توشیح کا اعزازہ کر لیا تھا۔ ابھی تک میں نے سلیمان کو اپنی زبان سے یہ نہیں بتایا تھا کہ جہر کو کیوں سے قوال نے کیا ہوا۔ مگر وہ بچہ مجھ کا قیاد جب ایک بار میں نے مجھ نہ کہا تو اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ "تم نے اس کو سچا میرے دوست؟ کیا تم روپوش ہونے پر راضی ہو؟" "میں نے مفہوم دیکھا ہے میں جواب دیا۔ پھر مزید بولا۔ "میں اپنی جان بھانے کی خاطر جہر کو قتل کر رہا ہوں۔ تم مجھ کو چھوڑ کر جا سکتے۔" پھر ذرا وقت کے بعد میں نے کہہ دیا۔ "وہ دوست! میں تم سے صرف ایک درخواست کرتا ہوں کہ تم اب تک جس طرح خروپاشا پر

نظر رکھے ہوئے ہوں، اسی طرح جو کار ہو اور مجھے اس کے حال سے آگاہ کرے رہو۔ یا اللہ مالک ہے انشاء اللہ میں اس احسان میں بھی سرخو رہوں گا۔

”مجھ علی اگر احمدا کی فیصلہ ہے تو مجھے تم سے اختلاف کا حق نہیں۔“ سلیمان طویل سانس لے کر بولا۔ ”تم مجھ سے زیادہ اپنا اچھا بھرا سمجھتے کہو خدا نے تمہیں ذہن رسا دیا ہے ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ خروپاشا سے متعلق ایک ایک خبر تمہیں ملتی رہے گی۔ میرا ایک ایک خبر رساں وہاں موجود ہے جس پر مجھے عمل اختیار اور خود رسا ہے اس کی طرف سے کبھی غفلت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اسے اسے تم سے کبھی محبت ہے۔“

”مجھے سے محبت ہے! میں نے ایران ہو کر کہا۔“ آخر کون ہے وہ؟“

”ہمیری بہن عابدہ۔“ سلیمان نے جواب دیا۔

عابدہ یہ نام کس کیرال دور سے دھڑک اٹھا۔ تاجر قراہی نے مجھے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔

”عابدہ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر تم سے نکاح کر لے گی۔“ سلیمان نے ایک اور چونکا دینے والی بات بتائی اور میں جیسے گنگ ہو کر گیا۔

”کیا ممکن ہے؟“ سلیمان نے میرے حیرت سے اچھی طرح واقف ہوئے۔ تم نے اسے نہیں بتایا کہ اسے کس پلے ی اپنا دل ہار چکا ہوں! میں نے رک رک کر یہ مشکل کہا۔

”جب عابدہ نے مجھ سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو میں نے اسے سب کچھ بتایا کہ وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔“ سلیمان بولا۔ ”میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تمہارا دل کسی دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ آڑیادہ وہ مزید غم زدہ نظر آنے لگی، مگر اس کے ہاتھوں میں نے اس کی محبت میں نہ دیکھی بلکہ اضافی ہی محسوس کیا۔ وہ تمہاری خوشنودی حاصل کرنے اور تمہیں ہر معصیت سے بچانے کے لیے کوشش کرتی رہتی ہے۔ اسی غرض سے وہ اکثر خروپاشا کے حرم میں اپنی رہتی ہے۔ اس سے مجھ سے کھربا ہے کہ اگر میں ایسی خوش نصیب نہ ہوں جس کی غمخیزی بھی مجھ سے محبت کرے اور میری محبت کا جواب محبت سے دے تو کبھی

میں اس صاحب اقبال دیکھتا جاؤں گی۔“

سلیمان سے عابدہ کے متعلق یہ ساری باتیں سن کر کچھ تعجب بھی ہوا اور عابدہ کی عالی حوصلگی و بلند ہمتی پر حیران آ کر ہوئی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔ ”ہمیری طرف سے اسے ملا کر اور دست بستہ شکر ہے ادا کرنا مگر میرے راز سے اس کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”تم مطمئن ہو اسے دوست۔“ سلیمان نے مجھے تسلی دلایا۔

”عابدہ جو بڑھ کر بارے میں کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے! ہاں اسے یہ ضرور معلوم ہے کہ تم نے خروپاشا سے سخت کھائی کی ہے اور اسی سبب وہ تمہارا دشمن ہو گیا ہے۔“

یہ وجہ ہے کہ وہ اپنا رسائی کے درپے ہے۔ یہ جاننے کے بعد اس کے دل میں تمہارے لیے رحم کے جذبات پیدا ہوئے اور اس نے بار بار خروپاشا کے حرم میں جا کر غمخیزی لیتا شروع کیا۔ تمہارے متعلق اس کے حرم میں ہونے کی بھی کوئی خبر نہ تھی۔

”کیا خروپاشا میرے اور جوہرہ کے تعلق کو جانتا ہے؟“ میں نے کچھ سوچ کر سلیمان سے سوال کیا۔

”ہاں۔“ سلیمان نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر وہ بولا۔ ”وہ جوہرہ سے پہلی ہی ملاقات میں یہ جان گیا تھا۔ خروپاشا کو یقین ہے کہ جوہرہ کے متعلق اچھی طرح جانتے ہیں۔ جس علم ہے کہ جوہرہ کہاں ہے اور نہ تمہارے علم سے بے قراوی اور بے چینی کے آثار نمایاں ہوتے۔ تمہاری آن اور غریبی حالت میں واضح فریق ہے اور اس فرق کو وہ محسوس کر چکا ہے۔ جس میں جیسے بجا سمجھتے کہ انہوں نے تم سے جاس کو بے ہو کر کے اپنی اور جوہرہ کی حفاظت کر دی۔ یہ بھی کہیں کہیں کہ آج تمہاری نہ جاننا مناسب یہی ہے کہ میرے پاس رہو۔“

”وہاں میرا جانا ضروری ہے اسے دوست۔“ میں نے کہا۔

”دہاں میں چونکا اور قحط رہوں گا۔ تم نے اس سلسلے میں مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا شکر ادا کرنے کے لیے میرے پاس حفاظت میں ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس قابل کرے جو میں تمہارا بدلہ لے سکوں۔“

اب کئی تک کے لیے خدا حافظ اے دوست! یہ سب کچھ ہی سن کر خود کھڑا ہو گیا۔

”جاذو مجھ علی جاؤ اور جاؤ کہو کہ دست سے لوگ تمہاری

گھاٹ میں ہیں۔“ بھول اکثر آدمی پر غالب آجاتی ہے اور کھاتے جہاں میں چارے ہو اپنے کو بھی بھول جاتا۔ کھاتے میں خاطر میں ہوشیار رہوں گا اور جب اندیشے کی کوئی بات ہوگی میں کھٹے پر چڑھ کر سدوق چلاؤں گا۔ اگر میں نے شدید خنجر محسوس کیا تو دیر مزید ہندو داغوں کا اس کا بعد دیر مزید اور! تم پہلی آواز سن کر ہوشیار ہو جانا اور جب دوسری آواز سنو تو جہاں کہیں اور جس حال میں ہو، میرے پاس پہنچنا خدا حافظ! میں پہلے ہی والا تھا کہ سلیمان نے مجھے دھوکا دیا۔ ”خود مجھ علی! کچھ دیر صبر کرو! میں ابھی آتا ہوں۔“

میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”وہ دوست اسے تم ایک دم کچھ ہوش سے نظر آنے لگے ہو؟“

”ہاں میرے ذہن میں اس وقت ایک ایسی ہی بات آئی ہے۔“ سلیمان بولا۔ ”مجھ پر مجھے اپنے پاس اٹھایا اور خود کھڑا ہو گیا۔“

”خود سلیمان! پہلے مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اسے دوست! میں نے جو کچھ سوچا ہے۔ اس سے کم از کم تمہاری ذہنی کی شناخت ضرور حاصل کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب رہوں۔“

”اور کیا ہے؟“

”میں اپنے والد کو ساتھ لے جا کر خروپاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اور میرے والد یہ کوشش کریں گے کہ کسی طرح خروپاشا سے اس بات کا معاہدہ کر لیں کہ وہ ہمیں کوئی گزرتی بات نہ پہنچائے۔“

”میں تمہیں میرے نزدیک یہ نامناسب ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ مختار اور غیاس شخص ہے۔ یقیناً وہ بات نہ مانے گا۔“

”میرے چہرے تمہارے والد نے اس پر احسان کیا ہے۔ میں اب ہر طرح اس کی بدلہ دیتی اور ممان توازی کی کئی ہے۔ اگر وہ نہ مانا تو ہمیں رہائی ہوگا اور ذات بھی اٹھانا پڑے گی۔“

”تمہاری جان بچانے کے لیے ہے اپنی خودداری کو خاک میں ملانے اور ذات اٹھانے پر بھی آمادہ ہوں اے دوست! مجھے یقین ہے کہ میرے والد بھی اس تجویز سے اتفاق کریں گے۔ تم مجھے جانے دو، کم از کم اسے والد سے تو میں اس معاملے میں مشورہ کر لوں۔“ سلیمان مستحکم سمجھنے میں

بولا۔

”چہرہ کہ مجھے یقین نہیں تھا۔“ سلیمان اپنے مقصد میں کامیاب رہے، مگر میں اس کی دل آزاری میں چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اسے اجازت دے دی۔ میرا اپنی خواہش ظاہر کر۔ ”سلیمان! کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمہاری اور خروپاشا کی گفتگو سن سکوں؟“

سلیمان میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ ”تمہیک ہے! اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ ایک کثیر نہیں عقیب راستے سے اس کرے کے درمیان پہنچو آئے گی جہاں خروپاشا لوگوں سے ملاقات کرنا ہے۔ وہ کرا کھلی منزل ہی پر ہے۔ ہاں میں تم سے ایک وعدہ ضرور لوں گا کہ تمہاری طرف سے کسی بھی صورت میں مداخلت نہیں ہوگی۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہوں گا اور کچھ نہ بولوں گا۔ اس کے بعد میں خاموشی کے ساتھ ہی تم سے بغیر لے کر کسی کو شہر نہ بھڑکائی چلا جاؤں گا۔“

”تو پھر میں چلا ہوں اور تم ہمیں کنیز کا انتظار کرو!“ سلیمان نے کہا۔

سلیمان چلا گیا تو میں اس کے کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ واقعی وہ ایک شخص اور محبت کرنے والا دوست تھا۔ میری جان بچانے کے لیے وہ کوئی کھنڈی فرور کراٹ کر اپنے چاہتا تھا۔ اس نے کہیں کہ صرف میری جان بخشی کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا اس لیے جوہرہ کی طرف سے میرا کھیند ہوا قدرتی اصرار تھا جس پر تک جوہرہ کی کے متعلق سوچنا بہت غار میں تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ آ کر پہلے ہی اس کو سب سے پہنچاؤں گا۔

میں اپنے خیالوں سے اس وقت چونک رہا تھا کہ کسی قدموں میں چاہی نہ۔ آنے والی ایک کنیز ہی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر مجھے اپنے پیچھے پیچھے آئے خائیر ضرور کیا۔ میں اس کے پیچھے ہو گیا۔ یقیناً یہ وہی کنیز تھی جسے کچھ عابدہ سلیمان نے کیا تھا۔ حاکم قوالہ کی کوئی بہت قدیم تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایسے ہی تھے جو اب تک میں نے نہیں دیکھے تھے۔ مختلف راداروں سے گزر کر میں اس وقت اس کنیز کے ساتھ ایک ایسے راستے سے گزر رہا تھا جہاں دن کے وقت بھی نیم آدھی کی تھی۔ یقیناً یہ کوئی

خیر راست تھا۔ حاکموں کے محلوں میں اور جوگیوں کی اپنے خیرات دے کر داناؤں کی عیب بات نہیں جہاں سے کسی کا گزرتا نہ ہو۔ میں اس قاصد کے کینز کے ساتھ چلا رہا۔ کچھ قاصد ہی یہ دو میریاں نظر آ رہی تھیں جن کے بالکل سامنے ایک تہہ دار پر تھا۔ دوپچے اگلیاں تھا کہ میں بچوں کے گلے کھڑے ہو کر یہ مشکل اندر کا منظر دیکھ سکا تھا اس لیے مجھے یہ غرض نہ تھا کہ کوئی اندر سے مجھے دیکھ لے گا۔ مجھے درستی کے قریب جا کر کینز خاموشی سے لڑتے تھے۔ اس رخ پر کمرے کا دروازہ بھی نہیں تھا اس لیے مجھے یہ حال کا بھی نہیں تھا کہ کوئی کمرے میں آتے جاتے میرے دروازے پر آگاہ ہو سکے گا۔ میں نے وہاں تک آتے ہوئے راستے کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا کہ واپسی میں پریشانی نہ ہو۔

دوسرے کے قریب پہنچتے ہی مجھے حاکم قوالہ حسان کی آواز سنائی دیک۔ وہ یقیناً خروشاٹ سے خطاب تھا۔ "خضور کے جلد سفر کرنے اور شرف اقامت سے غمزدہ ہونے پر اس خادم کو سخت افسوس ہے میرے بیٹے سلیمان کو بھی اس بہت صدمہ سے بلاؤ جو کم زوری کے وہ بھی میرے ساتھ آیا ہے تاکہ اپنے رخِ مفارقت کو خود ظاہر کر سکے۔ وہ بار کھڑا ہے اور حضور کی اجازت کا منتظر ہے۔"

"میں خود میرے بیٹے کو اندر بلا کر آتا ہوں۔" خرو شاہی اس کو آگے بڑھ کر اپنے چپاچہ اگلی پر دیکھ کر میں نے اس کی آواز پھر کر۔ اب پھر وہ سلیمان سے خطاب تھا جسے وہ کمرے میں لے آیا تھا۔ آؤ میرے پاس یہاں بیٹھو! پھر اس نے حاکم حسان کو بھی سلیمان کے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔

میں نے بچوں کے بل اٹھ کر اندر کا منظر دیکھا۔ میری پہلی نظر خروشاٹ کے چہرے پر پڑی۔ اس کی پیشانی جیسے چمک رہی تھی اور چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً اپنی مدد سرائی سے خوش ہو گیا تھا۔ اس کے قریب ہی میرا دوست سلیمان بیٹھا تھا اور پھر حاکم حسان۔ خروشاٹ اس طرح بیٹھا تھا کہ کسی بھی نے اس کی نظر دیکھ کر اس طرف اٹھ سکتی تھی۔ یہ خیال کر کے میں نے کمرے میں جھانکنا نہ کر لیا۔

"خضور! اس وقت مجھے سلیمان کی آواز سنائی دے رہی وہ خروشاٹ سے خطاب تھا۔" مجھے معلوم ہوا کہ آپ کل

ہماری بستی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے یہ ہوا۔ وہ جہاں سے باہر ہے اگرچہ میں جانتا ہوں کہ حضور کی سبھی کامیاب مارکر ہے لیکن حضور کی شریف اور بہت کم لوگوں کو ایسی عزت اور انعام ہوا حاصل ہوا۔ زمانہ بہرہ بردار کے لگے گئے تھے۔ ہمارے لیے اس سے سعادت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

"مجھے کچھ سے نہیں کہ میں کل یہاں سے دو سو کلوں گا۔" خروشاہی آواز اگلی۔ "میرا حال اس بستی میں رہنے سے جہاں نہ کوئی کام ہے نہ کوئی آرزو وہ ہو گیا۔ ہاں یہاں صحت بہت ہے اور یہ عاز بھی بہت پر فغاں ہے اسی لیے میں تم پر رخصت کرتا ہوں۔" اسی نے سلیمان کی خیال کرنا کہ ہوں کہ یہ طرز معاشرہ تمہاری صحت کے مواقع نہیں ہے۔ میں نے شہیدہ نفرت کرنا

پایہ تخت پہنچنے کے بعد غم میرے پاس لیے آؤ۔ جنمیں اب دل بھی کیا ثابت کچھ سامان نظر آئے گا۔ تمہاری صحت اس کی حالت اچھا سا ہوگا۔ اس طرح تمہیں وہاں دو کرنی کا موقع بھی مل جائے گا۔ اگر تمہیں اپنے والد کی ہدایت گوارا نہ ہو تو میں ان کے مناسب حال کوئی دو سرائے تجویز کروں تاکہ تمہارے احسان اور مہمان نوازی کی حق ادا کر سکو۔ اگر تمہیں یہ بھی منظور نہ ہو تو

تمہاری کوئی اور حاجت پوری کروں یا کسی خواہش کے حصول میں تمہاری مدد کروں کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ زیر بار احسان رہوں۔ میں معلوم ہی ہوا گیا کہ میں اپنے صدمہ سے بے نیکی آیا ہوں اور جیسا کہ میرا آؤ اور اس ہے وہ بھی تم سے پوشیدہ نہیں اس لیے جو کچھ تم طلب کر گئے وہی پاؤ گے۔

"خضور! خدا نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے میں اس کا قانع ہوں۔ باپ اپنے بیٹے سلیمان کے لیے دعا اور کوشش ہے کہ اس کی ہر آرزو پوری ہو۔ سلیمان سے جو طلب کرے وہی میری آرزو ہے۔" حاکم حسان نے بڑے نرمی اور اچھا آہیزگی سے کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس طرح خروشاٹ کو کیشے کا کارہا ہے۔ خروشاٹ نے اس کی بات کو غور سے سمجھا تو اس کی شفقت کے لیے میں سلیمان کو مخاطب کیا۔ "سلیمان! تمہارا بوجہ دل چاہے طلب نہ کہ میں اپنے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہاری درخواست کو پورا کروں گا" خورودہ

جانے ہو! اس کا میرے امکان میں ہونا ضروری نہیں جو کچھ کسوں کا حضور کے امکان سے باہر نہ ہو۔ سلیمان کی آواز آئی۔ پھر چند لمبے وقف کے بعد وہ ادا ہوا۔ "خضور! میری طرف ایک خواہش ہے اور وہ یہ ہے میرے عزیز دوست محمد علی کی جان کو کوئی صدمہ نہ پہنچا دے اور نہ کوئی ایسی بات کی جائے جس سے اسے رنج

یا پڑے۔" رنج کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں نے اندر جھانکا۔ خروشاٹ کے چہرے پر مجھے خبیثی نظر آئی۔ وہ دست خورے سلیمان کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے چہرے سے حال دل آ جا رہا ہو۔ سلیمان نے میرا حال سے آگاہی میں ڈال رکھا تھا۔ غیب معلوم تھا کہ وہ مجھ سے شہیدہ نفرت کرنا

خروشاٹ کو خاموش دیکھ کر سلیمان پھر چل اٹھا۔ خضور! سلیمان نہایت درد اور نرمی نے میں خروشاٹ کو مخاطب تھا۔ "آپ کو علم ہے کہ میں تیار ہوں اور میری بڑی شکر ایک شہادت سے چراغ کے ہوتے معلوم میں کہ کس وقت ہوا کا کوئی جھونکا آکر اسے گل کر دے اس کی ہر می زندگی میں میرے لیے محمد علی کے سوال دیکھی گا کوئی اور ذریعہ ہے ہی نہیں۔ جب تک وہ میرے پاس ہے میں اس کو نصیب ہوں۔" اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے دوست سے یہی بات جاری ہو رہی ہے۔

اس نے جواب دی کہ میں نے اس کے آداب محبت سے واقف ہونے کی وجہ سے آپ کی جناب میں گستاخی کی بات کی ہے میں اس لیے آپ سے سفارش کر رہا ہوں کہ اس کی بات کا خیال نہ فرمائیں اور میری آرزو کو پورا کر لیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی قسم سے پھر میں

"میں نہیں جانتا سلیمان کہ تمہیں میری طرف سے اپنے دوست کے حق میں کیوں اس قدر خوف ہے؟" خروشاٹ کے لیے سے عاری عیاں تھی۔ مجھے تو اس کا خیال بھی میں تھا۔ اب مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں اس کی بی گناہی اور سخت کلامی کے سبب اس سے متنفر تھا۔ اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو میں تمہاری درخواست کو منظور کرتا ہوں اور خدا کو اس معاملے میں گواہ کرتا ہوں۔

ہرگز اسے آزار نہ پہنچانے کے درپے نہ ہوں گا۔ ہاں سلیمان یہ سن لو کہ وہ یہاں کے سبب سے گھر سے آکر شریا کی شہ قیام میرے دروازے پر آیا ہیں اس کو آداب محبت سے کھانا پلا بلا رہا ہے اس کی جان لینے سے میں دلچ نہیں کروں گا۔ اس کے بعد خروشاٹ کا کلبہ نرم ہو گیا۔ "سو میں نے تمہارا اور تمہارے باپ کا احسان ادا کیا۔ اب تو تم خوش ہو!"

سلیمان نہایت ادب سے خروشاٹ کے سامنے جھک گیا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے اپنے والد کے ساتھ رخصت کی اجازت چاہی۔ حاکم اور حاکم زادہ سلیمان دونوں خروشاٹ کو دعا میں دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ گھر میں وہیں رہا۔ کربا۔ مجھے خروشاٹ کے چہرے پر اعتراضی غصے کا منظر نظر آ رہا ہے اور میں اس کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ سلیمان نے واقعی دوستی کا حق ادا کر لیا تھا اور اسے مستعد میں کامیاب رہا تھا۔ اب مجھے قوالہ سے کس قرار ہونے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ اب میں اپنی دانت میں ہو کر یہ خوبی حفاظت کر سکتا تھا کہ میری جان کو خطروں نہ رہا تھا۔ معاملہ میں نے غور کر دیا اور اس کی طرف بڑھ دیکھا۔ دروازے پر یقیناً ہی خادم مستعد کھڑا تھا۔ خروشاٹ نے اسے حکم دیا کہ وہ دونوں خواجہ سراؤں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں خواجہ سرا کمرے میں داخل ہوئے اور آواز بنانے لگے۔ خروشاٹ نے اس کے سلام کا جواب دے بغیر ان سے دریافت کیا۔ "تمہارے پردہ جو کلام کیا کیا تھا کیا ہوا؟"

وہ دونوں نہایت عاجزی کے ساتھ خروشاٹ کے سامنے دروازہ کھول دینے لگی۔ پھر ایک نے کہا۔ "خضور! ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کہ جلد معلوم ہو جائے گا۔ کچھ کھوج لیا گیا ہے۔"

"بیان روا" خروشاٹ تقریباً سچ اٹھا۔ "خضور! ابھی ہمارے پاس بیان کرنے کو کچھ نہیں۔" خواجہ سرا کی آواز میں خوف کے سبب ارتعاش تھا۔ "حقیقت معلوم ہو جائے تو فوراً" خضور سے عرض کیا جائے گا۔

"تھیک ہے میں سمجھتا ہوں کہ تم اس سے خوف زدہ ہو میرا! تمہاری اطلاع غلط نہ ہو۔ سو تصدیق کرو!"

خوشیاں شاخت و بولا چرخ تیر لیے ہیں مکمل۔ "دار کھانکا
اب صرف چار دن رہ گئے ہیں یہاں تو اس دو دن میں تیر خود لو
اس لڑکی جو چہرہ کو تلاش کر لویا چرخ کھولنے کے لیے تیار
ہو جاؤں گے نہیں ہوا جاؤں گا نہیں۔"
"انشاء اللہ ہم مقررہ وقت میں حضور کے حکم کی تعمیل
کریں گے۔" خواجہ سرا اسی نے اسے یقین دلایا۔
خواجہ سرا اجازت نہ دے سکے تو خوشیاں شاخت نے انھیں
اپنی طرف متوجہ کر لیا اور بولا۔ "جو نامیہ لڑکی کو کہا کہ "کرنا"
نے اسے اس حال کوئی جسمانی تڑپ نہ پہنچا۔" حاضر نے بھی
ماست ہیں "ان کے میرے لیے کچھ ابھی بچ چکا ہے۔" پھر
اس نے تاکید کہ "مگر اگر تیر میرے ستر کا حال دریافت
کرتے تو کہہ دیتا کہ میں کل شام کو یہاں سے روانہ
ہو جاؤں گا۔"

دوبل خواجہ سرا سے ملے تو خروشاکی اصرار
کے سے علم میں آئے کہ کھٹنے لگے میں نے چند ہی بعد
اسے دو کھائی کر کے کہ میں اس کا سراخ کو غصے
کی جان نہ لینے کا وعدہ کیا اب مجھ سے یہ کیا حالت ہوئی ابھی
اس کیسے جو ہر سے تعلق ہے اگر واقعی ایسا ہے جیسا
میں خیال کرتا ہوں تو جو ہر سے اقامت لے کر اس کیسے سے
اقامت لینا ہے بلکہ اسے ہلاک کرنے سے زیادہ جو ہر کے
اسے پکے سے زندہ چھوڑ دیا جائے جو ہر سے ماں
اسے تلاشی کرنا بہت ضروری ہے اب یہ کیسے میرے
خواجہ سرا میں کھائی کیوں کی طرح حکام میں چلے جائے
آواز مل جائے گی تو میں سسٹیں اسے "خروشاکی
آواز اور دھیمی دھیمی گوں کو شش کے باوجود چھوڑ نہ
کر سکتا

پھر میں وہاں نہ را اور جی مراستے سے وہاں پہنچا تھا۔
 واپس سلیمان کے کمرے میں پہنچا۔ سلیمان میری ہنجر
 تھا۔ میں نے اسے کھانا کچھ کھات ایسے ہوتے ہیں کہ
 کوئی بات کہنے اور سننے کی ضرورت نہیں ہوتی یہ حالت
 بھی ایسے ہی تھے۔ دیکھ کر میرا دوست میرے بچنے سے لگا
 رہا اور پھر میں نے مجازی آواز میں اس سے رخصت کی
 اجازت چاہی۔

جو وہی کلمہ شکر، قوالہ والوں سے بھی جی نہیں رہ سکی
 تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بدوئے شکر کے بستی بستی
 اپنے جی میں کلمات کرتے چل رہے تھے اور وہ قوال بھی



اعتیاد کی ضرورت نہیں رہے گی۔
 ”اے سلیمان! اے میرے دوست! میں نے اسے
 غالب کیا۔“ یہ کسی طور ممکن نہیں کہ رات کا بقیہ حصہ
 میں جوئی میں تھما سہ پاس گزاروں۔“

”کیوں؟“ سلیمان نے سوال کیا۔
 تم نے خود ہی دیکھ لیا ہے کہ خروپاشا کے گرے اس
 ہاڑی پر عاویں میں جھانکتے چہرے ہیں۔ خود میں نے بھی
 دیکھا ہے۔ وہ بے وقت ہے بات محسوس کی گئی مگر انہیں میرے
 جانتے واضح طور پر کسی کو دیکھ نہیں سکا۔ ایسی حالت میں
 جب کہ چہرہ جوہرہ خفہ میں ہے گیا مجھے یہاں جین
 سکا ہے۔ اچھے جانے دو اسے دستا میرا دل گواہی دے
 رہا ہے کہ کوئی ناگوار بات واقع ہو چکی ہے۔

”سلیمان بولا۔ ”جوہرہ کو واقعی ایسے وقت
 نہیں تھا جوہرہ جاکت۔ جہاں کہہ سکتے ہو سیرا رہتا اگر
 میں نے محسوس کیا کہ تمہاری جان کو خطرہ ہو رہا ہے تو میں
 اپنے والد کو جانے کارہاؤں کا اور اس سے درخواست کروں
 گا کہ وہ اپنے جانیوں کو تمہاری مدد کے لئے بھیج دیں۔“ جاؤ
 خدا حافظ! کہ جب وہ کچھ اور سن سکوں۔ وہاں سے مجھے
 بھر شے محفوظ رکھے۔“

پھر میں وہاں مزید ایک سے بھی نہیں رہا۔ خود بھی
 نکلنے میں سے دوڑنا شروع کر دیا۔ میرا رخ ہاڑی کی
 طرف تھا۔ راستے نشان سے اور ہر طرف سنا پھیلا ہوئی
 قہقہہ ہاڑی تک پہنچ کر میں نے اس طرف کا جائزہ لے کر کوئی
 نظر نہ آیا۔ راستے میں بھی میری کسی سے ٹکرائی نہیں ہوئی
 تھی۔ اطراف سے مطمئن ہو کر میں تیز رفتاری کے ساتھ
 ہاڑی پر چڑھنے لگا۔ ہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد میں غار
 کی طرف تھمبہ چار کے دہانے پر چڑھ کر ہواؤں دیکھ کر ایک
 دم میرے چہرے پر ہلے سے ذہن کل گئی۔ میں نے اپنے
 دل کو تسلی دی کہ شاید جوہرہ پتھر کھان کھان گئی ہوگی۔ میں
 نے جوہرہ کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ مجھے خیال نہ آتا
 کہ ممکن ہے جوہرہ کی آنکھ لگی ہو۔ یہ سوچتا ہوا میں
 تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ غار میں کسی گیارہ پتھر
 اندر پہنچ رہی تھی جسے میں سکتے ہو گیا۔ غار خالی تھا۔ وہاں جوہرہ
 نہیں تھی۔ میرا دل گیا اور کچھ کاپٹ اٹھا۔ پھر میں نے
 رشتہ طاری ہو گیا۔ قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو کر
 چلوں مگر جہاں محبت کرنے والے دل میں اندیشہ ہوتے

دھند میں سے خوشی کے ادویہ میں سے روشنی دیکھی اور
 مجھے وہاں غیر معلوم شکل و حرکت بھی نظر آئی۔ یہ وہ
 میرے دل میں خوف پیدا ہوا۔ غلام نے مجھ کو بھی بے ہوش
 کر دی کہ ہاڑی پر اس نے کچھ لوگوں کو پکڑے۔ کچھ
 ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تمہارے لئے خطرہ ہے۔ پھر میں
 دو سرے غلام کو بندھو دے کر کہا کہ وہ خوشی سے کچھ مالا
 لے کرے۔ بندوں داغ وہ تاکہ تم چوکانا ہو جائے۔ پھر میں
 سے چپنی سے تمہارا اختصار کرنے لگا۔ پہلے غلام کو میں
 حکم دے کر وہاں ہاڑی کی جانب بھیج دیا کہ وہ اس
 حفاظت میرے پاس لے آئے۔ دھماکا ہونے کے بعد
 بھی جب تم آئے تو میں نے دوسرے حکام کا حکم دیا اور
 اس وقت پہلے غلام نے آنکھ کھلی کہ ہاڑی پر قتل و حرکت
 کرنے والے عاویں میں جھانکتے چہرے ہیں اور تمہارا
 کہیں سراغ نہیں۔ کمان نہ کڑا کہ میں وہاں سے تمہارے
 کو تلاش نہ کر لیں اس لئے پہلے غلام کو ایک بار پھر ہاڑی
 کی طرف بھیج کر میں نے میرے حکام کا حکم دیا۔ اس
 کے بعد میں اپنی کمزوری کے باوجود دیکھ گیا کہ چار
 ایسے دل کو جب وہ کچھ اور سن سکوں۔ وہاں سے مجھے
 ادویہ منزل کے کرے صاف نظر آ رہے تھے جن میں سے
 کچھ دوڑتے تھے۔ ابھی مجھے وہاں پہنچے زیادہ دور نہ ہوئی تھی
 کہ حکام کو دروازہ کھلا اور اس میں سے دو آدمی کو بیرون
 اٹھائے۔ وہاں ہونے دوئے سفید چادر میں لپیٹوئی گئی
 پھر وہ لوگ دو درے دروازے سے باہر نکلے۔
 نکلنے میں دروازہ مفلک کر دیا گیا۔ میں نے باہر دو کر جان دہ
 کیا۔ میں سمجھ رہی تھی۔ سمجھتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ ان میں سے
 اپنے دل کو کہہ کر تسلی دے کر کہ سفید چادر میں لپٹا ہوا
 خروپاشا کا کھانا ہوا۔ کچھ دنوں پہلے میں نے جانتا تھا کہ یہ
 ستر میں کوئی امیر لگے ہو۔ جب تمام نقش و حرکت ہو گئی
 تو میں اپنے کمرے میں آکر تمہارا انتظار کرنے لگا۔ زیادہ
 نہ ہوئی تھی کہ تم آگئے۔ اپنے دوست حاکم زادے سلیمان
 کو میں نے کچھ کھنڈنا دیکھا تھا۔ اس کے چہرے
 سے وہاں قاتلہ تمام واقعات بیان کرنے کے بعد پتھر
 خاموش رہا پھر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اسے دوست کے تہا
 کی رات کا بقیہ حصہ میں میرے پاس رہو تاکہ کسی قسم
 کا کھانا نہ رہے۔ خروپاشا جلدی یہاں سے چلا جائے۔“ اس
 کے بعد تمہارے سے میدان صاف ہو گیا پھر اس قدر

کمانی کا دباؤ قدرے کم کیا اور اس سے پچھلے ”بولو کیا تم
 خروپاشا کے آدمی ہو؟“
 ”نہیں۔“ اس کے منہ سے چپنی چپنی سی
 آواز گئی۔
 میں چونک اٹھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس
 شخص کی آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے خود پر
 قابو کیا پھر سوال کیا۔ ”پھر کون ہو تم؟“
 ”پاپ اپنے آقا زادے۔“ اور آقا زادے کے دوست حاکم
 زادے کا خطاب۔ ”اس نے جواب دیا۔“ آقا زادے یہاں بھیجا
 تھا۔“
 اب میں سمجھ گیا کہ مجھے اس کی آواز میں مانوس لگی
 تھی۔ میں نے اس کی پشت سے منہ جھرا کر جیٹھی میں رکھ لیا اور
 پھر اس کی گردن کی ہیکڑی۔
 پھر اس سے پہلے کہ کوئی اور سوال کرنا وہ بول
 اٹھا۔ ”میرے آقا نے مجھے حکم دیا ہے کہ جلد آ جا رہا آپ کو
 یہ حفاظت ان کے پاس پہنچاؤں۔ وہ آپ کے خضر ہیں۔“
 اس کے بعد میں نے غلام سے کچھ نہ پوچھا اور اس کے
 ساتھ ہو گیا۔ وہ غلام چوکانا نظروں سے اوجھڑا رہا تھا ہوا
 میرے ساتھ چل رہا۔
 حاکم کی جوئی تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ
 اس وقت خوشی میں کچھ لوگ بیدار ہیں۔ ادویہ میں سے کئی
 کمروں میں بھی دوڑتی نظر آ رہی تھی۔ ادویہ کی کئی حصہ
 خروپاشا کے لئے مخصوص ہے۔ اس کا علم مجھے پہلے ہی سے
 تھا۔
 خوشی میں اس غلام کے ساتھ داخل ہو کر میں جلدی
 سلیمان کے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہ مجھے بیدار اور بے اختیار
 ملا۔ غلام کرے کہ دروازے ہی پر گ کیا تھا۔ دیں ایک
 اور غلام مستعد تھا۔
 ”کیا بات ہے سلیمان؟“ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“ میں
 نے بیٹھے سے پہلے ہی سوال کیا۔
 ”دوست! میں نے یہ سوچ کر کہیں تم کسی ایسی
 بلا میں گرفتار نہ ہو جاؤ جو میرے پاس تمہارے دم و کمان سے
 دور ہو۔“ اپنے دو رفتار غلاموں میں سے ایک ہاڑی کی
 طرف بھیج دیا تھا کہ وہ غار کی نگرانی کر رہے۔ ”سلیمان
 بتا لگا۔“ وہ دوسرے غلام کو ضرورت کے وقت کمان لینے کے
 واسطے لے اپنے پاس رکھا جب خاصی رات گزرتی تو

یہاں وہاں وہاں سے بھی خالی نہیں ہوئے۔ انہی موبوم
 ایدوں سے مجھے یہ بات یاد آ رہی تھی۔ اسے عامی دوا کی
 میں ہر کہ دیواؤں کو ٹوٹے اور پکارنے لگا۔ ”جوہرہ
 جوہرہ کہاں ہو اے جوہرہ؟ دیکھو کہ میں واپس آ گیا ہوں۔
 اور۔“ اور اب کہیں یہاں تھا چھوڑ کر کہیں جاؤں گا۔
 جوہرہ! میں تمہارا فراق برداشت نہیں کر سکتا!“
 میری آواز غار کی دیواؤں سے غرا گئی مگر مجھے کوئی
 جواب نہ ملا۔ میں کھانا غار میں کھڑے ہوئے۔ اساتان پر
 بڑی غالیچہ اور دیگر سارا سامان تھرا ہوا تھا۔ اب مجھے
 کوئی شک نہ رہا کہ جوہرہ کو میرے دھن اٹھانے گئے ہیں۔
 اپنے آغا سے قتل یقیناً اس نے خود جہاد کی تھی ورنہ
 سامان الٹ پلٹ نہ ہوتا۔ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آتی
 ہوگی۔ میرا ذہن گڑبہ ہوئے ہوئے ہلاک والے کی گردن
 جواب دینے لگا۔ اور باتوں کی کچھ پر غالب آنے لگی۔
 پھر میں اپنے بیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ میرے جسم کی
 ساری جاکٹیں اس کاہ کاہ دھن سے کھینچ لی تھیں۔ لفظ
 مجھے خود بہ خود میرے دل کی آواز بن کر میرے ہوشوں پر
 چلنے لگے۔ ”وہاں! افسوس! افسوس! وہ۔ وہ میری
 جوہرہ کو اغوا کر کے لے گیا۔ کینہ پرور خروپاشا نے
 مجھ سے میری جوہرہ کو چھین لیا۔ افسوس! افسوس! افسوس!
 افسوس! افسوس! افسوس!“
 جانے تک جب میں اسی طرح رہا تو ”وہ زاری کرتا
 رہا۔ میرے دل نے مجھے سمجھایا کہ ”آواز زاری“ قبول ہے۔
 میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مگر اب میری حالت کی ایسے بدلنے
 کی طرح ہے کہ اب میری سی پڑی ہوئے لگا ہوا۔
 ”شیطان دلیری کرے میری حالت میں جس آئے اور
 میری جوہرہ کو لے گئے۔“ میں دوبارہ بڑھانے لگا۔ ”آہا
 موجود ہیں کہ وہ راضی نہ رہا نہ تھی۔ جب اسے لے گیا

گلشن سیراب راہی ہو
ابر صحرا میں عمر برسا نہیں

۵

رفت شاپہ۔ کراچی

یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرے
یہ میرے خواب ہیں رستہ نہیں ہے

۵

کلوم پونس۔ ذریہ اسماعیل خان

کانپ اٹھی ہے یہ سوچ کر تنہائی مری
مرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی

۵

ارم ناہید۔ عالم آباد کراچی

تم ایسا کرنا کوئی ستارہ، کوئی بگٹو سنہیا رکھنا
مرے اندر میرے کی فکر چھوڑو بس اپنے کھر کا خیال رکھنا

۵

منیر احمد۔ جھٹی۔ شیخوپورہ

اک یاد ہی تیری رہ گئی ہے وہ بھی چھین لے
لیتا ہوں غم میں جس کا سارا بھی نہیں

۵

شائستہ احمد۔ ناردرہ کراچی

پایا بھی ان کو، کھو بھی دیا، چپ بھی ہو رہے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گزر گئیں

۵

اکرم ناز۔ کوٹ مومن شہید

جب تو نہیں تو عید بھی کیسے منائیں ہم
اک بار اگر تجھ کو گلے سے لگائیں ہم

۵

مٹتے ہیں زندگی کا نہیں کوئی اخبار
پھر اس کے بعد عید ملک مرنے جا نہیں ہم

۵

تجھ کو اگر آتا ہو آسماں ہے پتا
دیوار گمری ہو گی، بجھتا سا دیا ہو

۵

صدف رضوی۔ کراچی

سوٹا گھٹا نکا کرتا ہے لبوں
کشتی کیلئے والا لڑکا ڈوب

۵

علیہا۔ عالم آباد

طلب کی منزل نہیں آسماں طلب کے رستے ہیں چٹوں
طویل صدیوں کے پیچھے ہوں گے تمام لمبے مسافروں

۵

رب۔ ورنی۔ کراچی

پیکر حسرت بنا کر توڑنا مطلوب
جز اذیت فائدہ کیا تھا میری تغیر

۵

لطیف ارمان۔ کراچی

کیا جانتے تھی کل وقت کا کیا مزاج
یہ سوچ کر کسی کو بھی پتھر نہ مارا

۵

ناہید رضوی۔ کراچی

ترے چہرے پہ کئی رنگ سامنے
پوئنی شب بھر مری آنکھوں نے خزانے

۵

رعنا عباسی۔ کراچی

وصل کی آرزو کے دھانچے
لحہ لہہ پود کے رکھنا

۵

نثرین نظام



دکانوں میں نگر آئے گی جس کے نزدیک حسن کی حفاظت کے
لئے صرف مشہور کچہری کی منگنی کر نہیں اور مختلف آرائشی
سامان ہی کافی ہے، انھوں نے بھی یہ نہیں سوچا کہ ان
کرکٹوں میں ایسے، ایسے اور ایسے ٹیکسٹ کی طاقت بھی
ہوتی ہے جسے لگاتے ہی وہ فوری اثر و محسوس کرتی ہیں مگر
ان کے اثرات ان کی جلد کے باریک سامان میں جا کر
کتنی توڑ پھوٹ پھانتے ہیں۔ یہ انھیں احساس بھی نہیں ہو
گا۔

یہ بھی ایک درد تھا جو کافی لمبے عرصے پہ چھپا ہوا ہے کہ
جس میں فیشن کی دوڑ دھوپ رہی تھی مگر اب ہماری
خواتین میں دھیرے دھیرے وہ حضور بیدار ہو رہا ہے جس
سے معصومی طریقہ کار رفتہ رفتہ ختم ہو جا رہا ہے۔ آج کی
عورت یہ بات خوب سمجھ چکی ہے کہ قدرتی اشیاء کا کوئی قسم
البریل نہیں، ایک چھلنی کی بات ہے کہ آج سے پچاس
برس پہلے کی خواتین اور آج کی خواتین کے چہروں پر واضح
فرق نظر آتا ہے، آپ نے دیکھا ہو گا کہ آج کی نوجوان لڑکی
آج کی پچاس سالہ برس کی عورت کی سی صاف شفاف
جلد، روشن آنکھیں، لمبے سیاہ بال اور مناسب جسم کی مالک
نہیں ہوتی، ابھی آپ نے اس کی دودھ پر غور کیا؟ نہیں! ہم
آپ کو بتاتے ہیں کہ آج سے پچاس سالہ برس پہلے عورت
کا مقام صرف اور صرف اس کا گھر سمجھا جاتا تھا تھا وہ
صرف بچوں کی تعلیم و تربیت اور گھر کے دوسرے کام کرنے
کی پابند تھی اسے یہ فکر نہ تھی کہ چہاں کہاں سے آئے گا
اور کیسے کر کا خرچ چلے گا نہ اسے بچوں کی تعلیم کے سلسلے

جس و آرائش عورتوں کا حق ہے، وہ اس وقت سے
جس کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں جب سے
ان کو اپنی ذات کا اور اک ہوا، فرق صرف یہ ہے کہ
لے اور اس کے وسائل نے اس کو شش کو پیش ایک نیا
فرق، پہلے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے صرف قدرتی
وسائل کا استعمال کیا گیا، مختلف جڑی بوٹیوں سے خوب
دوائی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی پھر رفتہ رفتہ
کی جڑی بوٹیوں کو جدید سائنس نے مختلف کرکٹوں اور
دوا میں تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے وقت کا زیاں کیے
بہرے ہیں جن کو محفوظ رکھنے یا اسے برقرار رکھنے کے
لئے رائج ہوئے پھر دھیرے دھیرے یہ کاروبار بن گیا،
کے کپڑاؤں و دوسرے اشیاء اور زیادہ مصنوعی کی ہوس نے
ت کا رجحان پیدا کر دیا اور لوگوں نے کم خرچ ہلا نہیں
سکتی اپنا کمر عورت کے حسن و خوب صورتی کو بھی دیا اور
بے یابوں مختلف کرکٹوں اور زیادہ دھیرے دھیرے استعمال سے
توں میں ہزاروں جلدی بنائیاں پیدا ہو گئیں مگر خوب
کی کو برقرار رکھنے کے خیال نے انھیں ان خاص چیزوں
کا استعمال سے باز رکھنے کی ہر ذلک بیکار نہ دی۔
قدرتی جڑی بوٹیوں، پھل یا سبزوں سے خوب صورتی
مل کر سنے کی بجائے دولت مند خواتین میں منجلی اشیاء
استعمال نے ایک دہائی صورت اختیار کر لی جس سے
کا غریب طبقہ بھی محفوظ نہ رہا اور اپنی محنت سے کمائی
م کو کم و فضول چیزیں خریدنے میں صرف کرنے لگا اور
دکان نے گھر انوں میں مختلف معاشی مسائل کو جنم
آج بھی آپ کو خواتین کی خاص تعداد کا مینیکس کی

میں اسکولوں کے چکر لگانا پڑتے تھے، نہ وہ گھر کی سبزی گوشت لینے بازار جاتی تھی، نہ گھر میں کام کرنے والی مایموں کی بہتات تھی کہ وہ ہر وقت کابلی سوار رکھے نہ اسے اتنی فکر پریشانی تھیں جتنی آج ہیں۔

مرد کے شانہ بہ شانہ کام کرنے کی دھن نے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا اور آج وہ بھول گئی کہ اس کا مقام صرف گھر ہے، یہ نہ سمجھنے کے ہم اس طرح آج عورت کو برسوں پیچھے دھکیل رہے ہیں بلکہ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتے کہ برسوں پہلے کی عورت جب گھر کی چار دیواری میں مجبوس تھی تو وہ کس قدر مطمئن اور مسرور تھی۔ دھوپ اور گردوغبار سے محفوظ جلد اور صاف شفاف آنکھوں کی مالک تھی، اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ماسوائے اولاد کی تربیت کے، کچھ نہ تھا اس کی توجہ اولاد کی تربیت پر تھی جس سے نتائج بہر حال آج سے بہتر تھے۔ گھر کے کام کاج خود کرنے کی وجہ سے وہ کسی بازار میں جا کر پیسا خرچ کر کے ایک سرسبز کرنے سے بچی رہتی تھی کہ جس سے سوائے پیسے اور وقت کے زیاں کے کچھ حاصل نہیں، وہ اپنے ہاتھ سے اور صفائی سے بنائی ہوئی چیزیں کھاتی تھی، اپنے ہاتھ سے مٹا لے بیٹتی تھی جس سے ایک طرف اس کی ایک سرسبز ہو جاتی تھی اور دوسری طرف ملاوٹ کیے ہوئے مسالوں سے اس کی صحت خراب ہونے کے امکانات بھی نہ تھے جبکہ آج ایسا نہیں ہے۔ آج کی عورت نے خود پر بہ رضا خوشی اس قدر بوجھ ڈال لیے ہیں کہ اسے ہر چیز تیار اور فوری استعمال کے لیے چاہیے، یہی وجہ ہے کہ بازاروں میں بیٹے بنائے مسالوں کی بہتات ہے اور کون جانے اس میں کیا ناقص ہے اور کیا نہیں۔

یہ سب بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آج کی عورت نے اپنے حسن کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے جو طریقے اپنائے ہوئے ہیں وہ کسی بھی طرح درست نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی وہی طریقے اپنائیں جن سے نہ صرف ہماری ذات پر اور جسم پر بلکہ معاشرے پر بھی اچھے اثرات مرتب ہو سکیں۔ جن خواتین کی جلد نرم و نازک اور خوب صورت ہے وہ خدا کا غلیبہ ہے جسے آلودگی سے بچائے رکھنا حسن کو محفوظ رکھنے کے مترادف ہے اس کے لیے ہم اب سے پہلے بھی بتاتے رہے ہیں کہ جس قدر ہو سکے اپنی جلد کو

میک اپ کے مصنوعی طریقوں سے محفوظ رکھیں۔ ہم یہاں جلد کو صاف ستھرا، نرم و ملائم اور خوب صورت بنانے رکھنے کے کچھ طریقے لکھ رہے ہیں جو آپ کے لیے تیرہ ہدف نئے ثابت ہوں گے۔ آپ جانتی ہی ہوں گی کہ جب حسن و آرائش کا ذکر آتا ہے تو سب سے پہلے جو قدرتی ذریعہ ذہن میں آتا ہے وہ لیمو ہے۔ لیونہ صرف یہ کہ آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے بلکہ سستا اور ہر جگہ مل جانے والا پھل ہے۔ لیو ہمارے حسن کو برقرار رکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس کے استعمال سے صرف آپ کا تھوڑا سا وقت ضائع ہوتا ہے اور بس۔

(۱) بہت زیادہ چکنی جلد کے لیے: ایک لیو کا عرق نکال لیں اور ہم وزن ٹھنڈا پانی کس کر کے چہرے پر اس آمیزے کا پانچ منٹ تک مساج کریں پھر ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

(۲) آنکھوں کی جھلک دور کرنے کے لیے: دو چمچے لیو کا عرق ٹھنڈے پانی میں ملا کر روئی کے ٹکڑے سے دونوں آنکھوں پر رکھیں۔ یہ عمل دس منٹ تک کرتے رہیں۔ یہ آپ کی آنکھوں کی جھلک دور کر کے انھیں روشن اور چمک دار بنادے گا۔

(۳) بد رونق جلد کے لیے: آدھا چمچ لیو کا عرق، ایک چمچ کھیرے کا رس اور چند قطرے عرق گلاب اس آمیزے کو چہرے اور گردن پر لگائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد تارل پانی سے دھو لیں۔ یہ عمل آپ کی جلد کو رونق بخشنے گا۔

(۴) گرتے ہوئے بالوں کے لیے: ایک لیو کا رس اور چار چمچے تارل کا پانی ملا کر آمیزہ تیار کریں۔ اس آمیزے کو سر کی کھال پر یعنی بالوں کی جڑوں میں لگیں۔ ایک گھنٹے تک اسی طرح رہنے دیں پھر اسے دھو لیں۔ اس عمل کو ہر پچھترے دن میں جب تک بال گرنا بند نہ ہو جائیں۔

(۵) چہرے کی دلکشی میں اضافے کے لیے: ایک چمچ لیو کا رس، ایک چمچ کھیرے کا رس اور ایک چمچ گاجر کا رس ملا کر آمیزہ تیار کریں، اور چہرے پر لگائیں، پندرہ منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ یہ عمل آپ کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا سبب بنے گا۔



آرائش شرط ہے